

دنیا کی بیسٹ سیلر کتاب ”روگ سٹیٹ“ کا اردو ترجمہ

بد معاش امریکہ



WWW.IRCPK.COM

مصنف: ولیم بیلیم

مترجم: سید ناصر علی

بدمعاش امریکہ

ولیم بیلیم
(امریکی دانشور، صحافی)

مترجم
سید ناصر علی

صبح پبلشرز

سیکنڈ فلور، سید پلازہ، چیئر جی روڈ، اردو بازار لاہور

Sabeehpublishers@yahoo.com

بد معاش امریکہ

بد معاش امریکہ

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب	بد معاش امریکہ
مصنف	ولیم بیلیم
مترجم	سید ناصر علی
مینجنگ ڈائریکٹر	کرٹل (ر) سید مجور رضا
قیمت	220 روپے
تاریخ اشاعت	جنوری 2003ء
پرنٹرز	ندیم یونس پرنٹرز ریٹرن گن روڈ کلاہوہ
ناشر	صبح پبلشرز سیکنڈ فلور سید پلازہ
	جسٹس روڈ اردو بازار لاہور



ترتیب

7	(i) پبلشر نوٹ
8	(ii) مترجم نوٹ
10	(iii) پیش لفظ (ولیم بیلیم)
27	(iv) تعارف
50	1- امریکہ پر دہشت گردوں کی نظر کرم
55	2- افغان دہشت گرد خوا
61	3- خفیہ قتل
68	4- امریکی فوج اور سی آئی اے کے تربیتی کتابچوں سے اقتباسات
75	5- تشدد
87	6- ناپسندیدہ افراد
91	7- نئے پلچند نیکو افراد کی تربیت
100	8- ہمارے اور ان کے جرائم
115	9- دہشت گردوں کی جنت..... امریکہ
125	10- پال پوٹ کی حمایت
	حصہ دوم
	امریکہ کا انسانیت کے خلاف تباہ کن ہتھیاروں کا استعمال
131	11- بمباریاں
137	12- ڈپلینڈ یورینیم

- 142 - 13- کلستر بم
146 - 14- امریکہ کا کیمیاوی و حیاتیاتی ہتھیاروں کا بیرون ملک استعمال
157 - 15- کیمیاوی ہتھیاروں کا اندرون ملک استعمال
165 - 16- اقوام عالم میں کیمیاوی و حیاتیاتی ہتھیاروں کی حوصلہ افزائی

حصہ سوم --- امریکہ کی بد معاشیاں

- 171 - 17- دنیا بھر میں امریکی مداخلت کاریاں
226 - 18- انتخابات میں دخل اندازیاں
239 - 19- قومی استعداد برائے جمہوریت
245 - 20- اقوام متحدہ میں امریکہ بمقابلہ دنیا
263 - 21- سیارہ کے ذریعہ جاسوس
275 - 22- اغواء اور لوٹ مار
280 - 23- سی آئی اے نے نٹلس منڈیا کو 28 برس کے لیے جیل کیسے بھیجا؟
283 - 24- سی آئی اے اور فضیات
295 - 25- واحد عالمی طاقت
305 - 26- امریکہ اور آزاد معیشت
312 - 27- آزاد ملک میں ایک دن

پبلشر نوٹ

کتاب ”بد معاش امریکہ“ امریکہ کے بدنما چہرے سے نقاب اتارنے کے لیے کافی ہے۔ اس کتاب میں امریکہ کے خلاف اتنا مواد ہے کہ پڑھ کر حیرت ہوتی ہے۔ اگر ان مظالم کا پانچ فیصد بھی کسی مسلمان ملک سے سرزد ہوتے تو امریکہ اب تک اس کی اینٹ سے اینٹ بجا چکا ہوتا۔ لیکن انسانی حقوق کا نام نہاد علمبردار امریکہ مغربی دنیا کی حمایت سے سب کچھ کر رہا ہے۔ اقوام متحدہ کا کردار امریکہ کے طفلی ادارے کا رہ گیا ہے۔ اور یہ ادارہ غریب اور ترقی پذیر ممالک کو درپیش مسائل حل کرنے میں ناکام رہا ہے۔

کتاب انگریزی سے ترجمہ کی گئی ہے۔ اور یہ ولیم عظیم کا ہی موقف ہے اس لیے بعض جگہ ان سے اختلاف بھی کیا جاسکتا ہے۔ تاہم مجموعی طور پر یہ ایک انتہائی دلچسپ اور چونکا دینے والی کتاب ہے۔ جس کا پڑھنا ہر پاکستانی کے لیے ضروری ہے۔

پبلشر

مترجم نوٹ

یہ کتاب معروف امریکی دانشور اور صحافی ولیم ہیلیم کی تہلکہ مچا دینے والی کتاب روگ شیٹ کا اردو ترجمہ ہے۔ اس کتاب کو پڑھنے سے پہلے میرے ذہن میں یہ بات تھی کہ یہ ایک عام سی کتاب ہوگی جس میں امریکہ پر تنقید کی گئی ہوگی اس قسم کی بہت سی کتابیں انگریزی میں موجود ہیں۔ کئی کتابیں ایسی ہیں جو خودی آئی اے نے لکھوائیں اور ان کا مقصد دنیا پر امریکہ کا رعب ڈالنا تھا۔ لیکن جب میں نے اس کتاب ”روگ شیٹ“ کو پڑھنا شروع کیا تو لرز کر رہ گیا۔ کتاب کا ہر باب ہر لفظ چونکا دیتے والا تھا۔ مصنف نے امریکہ کے کرتوتوں کو بے نقاب کر کے رکھ دیا ہے۔ کہتے ہیں کہ جب یہ کتاب چھپی تھی تو ولیم ہیلیم کے خلاف امریکہ میں ایک مہم شروع ہو گئی تھی۔ انہیں گرفتار کر کے سزا دینے اور امریکہ بدر کرنے کا مطالبہ تک کیا گیا لیکن ولیم ہیلیم اپنی بات پڑنے رہے انہوں نے سی آئی اے اور امریکہ کے مظالم پر اور بھی کئی کتابیں لکھی ہیں۔ لیکن اس کتاب کا شمار دنیا کی مقبول ترین کتابوں میں ہوتا ہے۔

کتاب پڑھنے کے بعد مجھے خواہش ہوئی کہ اس کتاب کو اردو میں ترجمہ کیا جائے۔ اللہ کا نام لیکر میں نے ترجمہ شروع کر دیا کئی دفعہ ذاتی مصروفیات کو بھی ترک کرنا پڑا بالآخر میں کتاب کا ترجمہ مکمل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ میری کوشش تھی کہ ترجمہ عام فہم ہونے کے ساتھ ساتھ اصل کے قریب ترین ہو اور کہیں ایسا محسوس نہ ہو کہ مترجم نے اپنے پاس سے کوئی لفظ یا معنی ڈال دیے ہیں۔ امید ہے قارئین کو ترجمے کا اسلوب بھی پسند آئے گا۔

میں کتاب کے بارے میں صرف اتنا کہوں گا کہ اس کتاب کا پڑھنا ہر پاکستانی کے

لیے لازمی ہے تاکہ وہ امریکہ کی سازشوں کو سمجھ سکے۔ امریکہ نے دنیا کی کئی حکومتوں کے تختے الٹائے۔ لاکھوں لوگوں کو قتل کیا اور آج دنیا کی واحد سپر طاقت بنا بیٹھا ہے امریکہ نے آج جو اقتصادی و فوجی طاقت حاصل کی ہے وہ اس کی سازشوں اور مکر و فریب کا نتیجہ ہے بظاہر امریکہ جمہوریت اور انسانی حقوق کا علمبردار ہے لیکن اصل میں وہ دونوں کا قاتل ہے۔ وہ صرف اپنے مفادات پورے کرتا ہے۔ کتاب میں میں نے اپنی ذاتی رائے کا اظہار نہیں کیا۔ مصنف نے جو کچھ لکھا ہے۔ اس کے لفظوں میں بیان کر دیا ہے تاہم کتاب کے حوالے سے میں آپ کی تجاویز اور مشوروں کا منتظر رہوں گا۔

سید ناصر علی

مترجم

پیش لفظ

(11 ستمبر اور افغانستان پر گولہ باری کے بارے میں مصنف کا مقدمہ)

اس کتاب کی اشاعت کے کچھ عرصہ بعد ہی 11 ستمبر 2001ء کے واقعات نے ریاستہائے متحدہ امریکہ کو ہلا کر رکھ دیا۔ جس طرح ہوائی جہازوں کو اغواء کر کے ورلڈ ٹریڈ سینٹر کو تباہ کیا گیا، پینٹاگون کو نشانہ بنایا گیا اور اس کے نتیجے میں ہزاروں بے گناہ مارے گئے یہ عجیب ناقابل یقین سی بات لگتی ہے مگر ایسا ہوا۔ یہ حقیقت ہے کہ ان حملوں کے بعد امریکہ پر شدید دباؤ تھا کہ وہ مجرموں کے خلاف سخت ترین کارروائی کرے اور یہ اس سے بھی بڑی حقیقت ہے کہ امریکی کارروائی میں یہ بات ہرگز پیش نظر نہیں تھی کہ ایسے واقعات کو دوبارہ رونما ہونے سے روکا جائے بلکہ وہ صرف اپنے دشمن کو سبق سکھانا چاہتا تھا۔

”امریکہ پر دہشت گردوں کی نظر کرم“ یہ ہے اس کتاب ”روگ سٹیٹ“ (Rogue state) کے پہلے باب کا عنوان جس میں اس بات پر بحث کی گئی ہے کہ یقیناً دہشت گردوں کے اس انتہائی اقدام کے پیچھے ایسی ٹھوس وجوہات ہوں گی جنہوں نے انہیں امریکہ کو تباہ کرنے پر مجبور کر دیا۔ سماجی سیاسی اور مذہبی نا انصافیوں، ناہمواریوں اور منافقانہ رویوں کا شکار بننے والے ان دہشت گردوں کا یہ قدم امریکہ کے کسی نہ کسی ”عمل“ کا رد عمل ہی ہو سکتا ہے۔ اس باب میں ریاستہائے متحدہ امریکہ کے ان ”اعمال“ کی ایک طویل فہرست موجود ہے۔ مشرق وسطیٰ میں اس نے جو کچھ کیا یا جو کچھ کر رہا ہے وہ کس سے پوشیدہ ہے۔ کبھی لبنان اور لیبیا اس کی اندھا دھند بمباری کا نشانہ بنے تو کبھی ایران زیرِ عتاب آیا، کبھی بے گناہ عراقی عوام پر بمباری کی گئی تو کبھی فلسطینیوں پر مظالم اور روزمرہ تشدد کے باوجود اسرائیل کو بڑے پیمانے پر فوجی امداد دی گئی۔ مشرق وسطیٰ کی مسلمان ریاستوں پر کئی دہائیوں کے فوجی

معاشی اور سیاسی ظلم و ستم سے تنگ آ کر اگر کوئی اہم ترین امریکی عمارتوں کو حملے کے لیے منتخب کرتا ہے تو اس میں چنداں حیرت کی ضرورت نہیں نہ ہی اس حملے کو اچانک کہا جاسکتا ہے بلکہ اسے ایک طویل عمل کا رد عمل ضرور کہا جاسکتا ہے۔

صرف مشرق وسطیٰ میں ہی امریکی ظلم و ستم کی بات کیوں کی جائے یا یہ کیوں سمجھا جائے کہ صرف وہ لوگ ہی امریکہ سے نفرت کرتے ہیں۔ خود لاطینی امریکہ میں حالات بھی کم و بیش یہی ہیں۔ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ گزشتہ نصف صدی کے دوران لاطینی امریکہ میں ریاستہائے متحدہ نے جتنی بڑی تعداد میں دہشت گرد پیدا کئے ہیں اور جس قسم کے گھناؤنے اقدامات کئے ہیں اگر لاطینی امریکی مسلمانوں کی طرح یہ عقیدہ رکھتے کہ بڑے شیطان کو اپنے ہاتھوں سے قتل کر کے سیدھے جنت میں جائیں گے تو اب تک ہمارے ہاں دہشت گردی کے ایسے لگاتار واقعات ظہور پذیر ہو چکے ہوتے اور ہو رہے ہوتے۔

افریقی اور ایشیائی ممالک بھی امریکہ کے ہاتھوں کم و بیش انہی حالات کا شکار ہیں۔ یونہی تو دنیا بھر میں امریکی سفارتخانے، سیاستدان، اطلاعات کے محکمے وغیرہ حملوں کی زد میں نہیں ہیں۔

11 ستمبر کے حملوں کے بعد میڈیا کے حوالے سے ایک خاصی انوکھی بات مشاہدہ میں آئی۔ امریکی میڈیا سے متعلق مختلف طرز فکر کے حامل خاص طور پر سنجیدہ عناصر ایسے علاقوں میں بھی گئے جہاں وہ عموماً نہیں جاتے۔ ان کے اس عمل کے پس پردہ جو محرک کارفرما تھا وہ صرف ایک سوال تھا کہ اس طرح اچانک کیوں ہوا؟ اخبارات و جرائد ریڈیو اور ٹی وی چینلوں کے نمائندوں کی بڑی تعداد نے اس سوال کا جواب حاصل کرنے کے لیے ہر ممکن طریقہ اختیار کیا اور بالآخر انہیں نہایت واضح جواب مل گیا کہ یہ سب اچانک نہیں ہوا یہ امریکہ کی ان دخل اندازیوں کا رد عمل ہے جو دنیا بھر میں کئی دہائیوں سے نہ صرف جاری ہیں بلکہ ان میں مستقل اضافہ ہو رہا ہے۔ انہیں اس بات کا بھی بہت اچھی طرح اندازہ ہو گیا ہے کہ یہ مداخلتیں ہر نئے دن کے ساتھ اس کے خلاف نفرت کے جذبہ کو بڑھا رہی ہیں۔ اس انکشاف کو اس افسوسناک سانحہ کا مثبت پہلو بھی کہا جاسکتا ہے کہ اس کی مدد سے امریکہ کے کرتا دھرتاؤں کو اس بات کا اندازہ ہو گیا کہ دنیا امریکہ سے نفرت کیوں کرتی ہے۔ ہوتا تو یہ چاہیے تھا کہ اس کی روشنی میں اپنی اصلاح کی کوشش کی جاتی مگر اس کے برعکس ہوا۔ ان میں انتہائی تنگ نظر قسم کی

حب الوطنی اٹھنے لگی۔ کانگریس کے ارکان نے جہاں یہ راگ لاپتا شروع کر دیا کہ ”خدا امریکہ پر رحم کرے“ وہیں ملک بھر میں امریکی پرچموں کی دھڑا دھڑا فروخت شروع ہو گئی۔ یہ جھنڈے ہر طرف لہرانے لگے۔ اخبارات ریڈیو ٹی وی کے پروگراموں میں سوائے لڑائی جھگڑنے دشمنی انتقام اور خون خرابے کے کوئی دوسری بات نہ ہوتی۔ تفریحی تقریبات کو حب الوطنی کی تقاریب میں بدل دیا گیا۔ میڈیا ہوا یا عوامی تقریبات امریکن بہادری پر خراج تحسین کے علاوہ کوئی بات شاذ و نادر ہی پڑھنے سننے یا دیکھنے کو ملتی۔ ہر ایک کا چچا زاد ماموں زاد ”ہیرو“ بن گیا تھا۔ یہ جنون 2002ء میں کہیں جا کر کم ہوا۔ سنجیدہ امریکی میڈیا تو خیر جلد ہی اپنی عمومی حالت میں واپس آ گیا مگر لندن کے اخبارات میں امریکی خارجہ معاملات کے حوالے سے خبریں اور تبصرے تسلسل سے شائع ہوتے رہے۔ حال یہ تھا کہ امریکہ کی خارجہ پالیسیوں کے حوالے سے نیویارک ٹائمز اور واشنگٹن پوسٹ سے زیادہ گارجین اور انڈیپنڈنٹ میں خبریں ملتی تھیں۔

یہ حقیقت ہے کہ اس واقعہ کے حوالے سے جو موقف امریکی میڈیا نے اپنایا وہی امریکی عوام کی سوچ اور زبان بن گیا۔ امریکی میڈیا ہوا یا عوام وہ یہ ماننے کے لیے تیار ہی نہیں تھے کہ امریکہ کے خلاف دہشت گردی کا سبب اس کی بیرون ملک پالیسیوں کے نتیجہ میں انتقامی کارروائی بھی ہو سکتی ہے بلکہ وہ تو یک زبان ہو کر پورے یقین کے ساتھ یہی کہتے رہے کہ ریاستہائے متحدہ کو اس کی آزادی، جمہوریت اور دولت کی وجہ سے نشانہ بنایا گیا۔ بش انتظامیہ نے بھی اپنے پیش روؤں کی طرح اسی سوچ کو سرکاری موقف بنائے رکھا اور یہی بات امریکن کونسل آف ریسنر اور ایلیومینائی (امریکی قدامت پسند محافظ گروپ جس کی بنیاد نائب صدر کی بیوی ”لین چینی“ اور سینیٹر جوزف لبرمین نے رکھی تھی) نے نومبر دفاعی تدبیر فیڈ کے قیام کے وقت کی کہ ”میارہ مہینہ صرف امریکہ پر حملہ نہیں کیا گیا بلکہ یہ امریکی تہذیب پر حملہ تھا۔ یہ ہماری خامیوں نہیں بلکہ پاک دامن پر حملہ تھا۔“ جب امریکہ بھر کی مشترکہ سوچ یہ ہو تو اصلاح کا سوچنا خامیوں پر نظر ڈالنے کی توقع رکھنا پوانے کا خواب ہے۔

امریکی محکمہ دفاع کی 1997ء کی تجویزاتی رپورٹ میں واضح طور پر اس بات کا اظہار کیا گیا ہے۔ بین الاقوامی صورتحال میں امریکہ کی بڑھتی ہوئی مداخلت خود اس کے خلاف دہشت گردی کے واقعات میں اضافے کا سبب بن سکتی ہے۔ مگر اس قسم کی رپورٹوں کو کوئی حکومت اہمیت دینے کے لیے تیار نہیں ہوتی البتہ جب اقتدار سے علیحدہ ہوتے ہیں تو ان

کو تباہیاں کو ضرور تسلیم کرتے ہیں۔ جیسے کہ سابق صدر جی کارٹر نے وائٹ ہاؤس کو خبر یاد کئے کے چند سال بعد اعتراف کیا کہ ”ہم نے لبنان میں میرنیز بھیجیں۔ آپ لبنان جائیں شام یا اردن کی طرف رخ کریں آپ کو ریاستہائے متحدہ کے خلاف نفرت کا طوفان نظر آئے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے وہاں بے تحاشہ گولہ باری کر کے بے گناہ اور معصوم لوگوں کو بڑی بے رحمی اور بیدردی سے مار ڈالا۔ بیروت کے دیہاتوں میں ان کسانوں، عورتوں اور بچوں کو نشانہ بنایا جن کا کوئی قصور نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ متاثرین کی نظر میں ہم شیطان ہیں اور اسی وجہ سے ہمیں ایران میں ریغالیوں کے حصول میں سرنگوں بھی ہونا پڑا اور دہشت گرد حملوں کا سامنا بھی کرنا پڑا۔“

1993ء میں ورلڈ ٹریڈ سینٹر پر حملہ کرنے والے دہشت گردوں نے ”نیویارک ٹائمز“ کو ایک خط لکھا جس میں انہوں نے حملہ کی ذمہ داری قبول کرتے ہوئے اس کا سبب بھی بیان کر دیا تھا جس کے مطابق یہ کارروائی امریکہ کی طرف سے ایک دہشت گرد ریاست اسرائیل اور علاقے کے دیگر آمر حکمرانوں کو دی جانے والی سیاسی، معاشی اور فوجی امداد کے جواب میں کی گئی تھی۔

حکومت اور میڈیا کی امریکہ کے خلاف دہشت گردی اور امریکی پالیسیوں کے آپس میں تعلق سے باخبری کی مزید شہادتیں بھی پہلے باب میں پیش کی گئی ہیں۔

خطا کار

11 ستمبر کے ڈھائی ماہ بعد دنیا کی طاقتور ترین قوم نے دنیا کے غریب اور پسماندہ ترین ممالک میں سے ایک افغانستان پر میزائلوں کی بارش کر کے دنیا بھر کو یہ سوال کرنے پر مجبور کر دیا بڑا دہشت گرد کون ہے؟ کس نے زیادہ بڑی تعداد میں معصوموں کو بے گناہوں کو بے کسوں اور لاچاروں کی جان لی؟ 11 ستمبر کو دہشت گردوں نے اپنے فضائی بموں سے؟ یا پھر افغانستان میں امریکہ نے اپنے کروڑ میزائلوں، ڈیزل کٹر اور کلستر بموں سے؟ مندرجہ ذیل اعداد و شمار سے اس سوال کا جواب واضح ہے۔

سال کے اختتام پر سامنے آنے والے اعداد و شمار کے مطابق نیویارک ڈائٹکنسن اور پنسلوانیہ میں دہشت گردی کا شکار بننے والے متاثرین کی تعداد 3000 کے لگ بھگ تھی جبکہ افغانستان میں امریکی بمباری کے نتیجے میں مرنے والوں کو تعداد کو امریکی سرکاری اہلکاروں

نے بالکل ہی نظر انداز کر دیا۔ البتہ مختلف انفرادی امریکی رپورٹوں ذرائع ابلاغ اور انسانی حقوق کی تنظیموں کے اندازوں کے مطابق 3500 سے زیادہ افغانی دسمبر کے آغاز میں موت سے ہمسنا ہو چکے تھے اور دردناک بات یہ ہے کہ اس تعداد میں 'بمبوں سے زخمی ہونے والے۔ بعد ازاں وفات پانے والے' بمباری سے تباہ ہونے والے گھروں کے اندر سردی بھوک اور پیاس سے مرنے والے لیکن 'بارودی سرنگوں کا شکار بننے والے' بھوک اور دھماکوں سے جان بحق ہونے والے مہاجرین اور وہ ہزاروں فوجی اور سینکڑوں قیدی جنہیں امریکی فوج اور جاسوسی اداروں کے ذریعہ سزائے موت ہوئی۔ یا قتل کر دیئے گئے شامل نہیں ہیں۔ ان اعداد و شمار میں وہ اجسام بھی نہیں ملیں گے جو کلستر بمبوں کے تباہ کن اثرات کی وجہ سے بیمار یوں میں مبتلا ہو کر گل سڑ گئے ہوں گے۔

ان مرنے والے افغانوں کے لیے کہیں بھی ایک منٹ کی خاموشی اختیار نہیں کی جائے گی کوئی یادگاری عبادت نہیں ہوگی جس میں اعلیٰ امریکی افسران شامل ہوں کوئی دعوتیں نہیں ہوں گی ریاستوں کے حکمرانوں کی جانب سے کوئی تعزیتی پیغامات نہیں بھیجے جائیں گے۔ متاثرہ خاندانوں کے لیے ہزاروں ڈالر کا اعلان نہیں کیا جائے گا۔ یہ تو ایک خونی غسل تھا۔ جس میں کتنے ہزار جانے بے گناہ افغانی مارے گئے یقین سے کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا البتہ یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ 11 ستمبر کے متاثرین سے کہیں زیادہ..... کہیں زیادہ.....

امریکی حکومت کی جانب سے اسامہ بن لادن کی ویڈیو دنیا کے سامنے پیش کی گئی جس کے مطابق سانحہ سے 5 روز پہلے تک نہ تو اسے خود ہشت گردی کی صحیح تاریخ کا علم تھا اور نہ ہی ہائی جنکیز جانتے تھے کہ وہ کسی خودکش مشن کا حصہ ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس ویڈیو کو عوام میں شہر کرنے سے پہلے ایف بی آئی اس نتیجے پر پہنچ چکی تھی کہ ان لوگوں کو ایک ہاتھ کی انگلیوں پر گنا جاسکتا ہے جو جانتے بوجھے اس کام میں شامل تھے۔ اس صورتحال میں یہ کہنا بالکل بجا محسوس ہوتا ہے کہ اگر افغانستان میں بمباری کی ہم حقیقی مرتکب افراد کے خاتمے کے لیے شروع کی گئی تھی تو یہ ایک نہایت ہی احمقانہ مشن تھا جس کا مقصد سوائے تشدد اور بے رحمی کے کچھ نہیں تھا۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ 1995ء میں اوکلاہما شہر کی مرکزی عمارت پر خوفناک بمباری کا مرتکب ٹمٹھی میک ونٹ اگر فوری طور پر نہ پکڑا جاتا تو کیا ریاستہائے متحدہ امریکہ وحشیانہ بمباری سے مشی گن ریاست کی اینٹ سے اینٹ بجا دیتی اور ان تمام جگہوں پر

حملہ کرتی جنہیں وہ اپنا گھر کہتا تھا؟ ہرگز نہیں بلکہ وہ ایک زبردست مین ہنٹ بناتے اور اس وقت تک چین سے نہ بیٹھتے جب تک اسے تلاش کر کے سزا نہ دے دیتے۔ جبکہ افغانستان میں ریاستہائے متحدہ صرف اس ایک نظریہ کو بنیاد بنا کر چلی کہ جس نے طالبان کی حکومت کی حمایت کی، خواہ وہ ملکی ہو یا غیر ملکی دہشت گرد ہے اور جو بھی ماضی میں ریاستہائے متحدہ امریکہ کے دہشت گردی کے خلاف اقدامات کا مخالف رہا ہے اس پر قانونی طور پر نہیں تو اخلاقی طور پر ضرور گیارہ ستمبر کے خون کے دھبے ہیں۔

امریکی نظریات کا حال تو یہ ہے کہ جب جو تا دوسرے کے پیر میں ہو تو امریکی اہلکار بھی چلنے کے لیے باعزت راستہ اختیار کر لیتے ہیں۔ دور کیوں جائیں 1999ء کا ہی واقعہ لیجئے چینچیا کے مسئلہ پر روس کو سمجھاتے ہوئے امریکی سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے سیکنڈ ان کمینڈ ”سٹروپ ٹالپوٹ“ کا مشورہ تھا کہ ”سمجھداری کا مظاہرہ کریں کیونکہ قتل کا مطلب حقیقی دہشت گردوں کے خلاف مستقل کارروائی ہے جبکہ غیر دانشمندی سے طاقت کے بے جا استعمال کا مطلب بے گناہوں کو خواہ مخواہ خطرے میں ڈالنا ہے۔“ دنیا بھر کو صبر و تحمل، اخلاقیات اور رحم کا درس دینے والا امریکہ خود کیا کر رہا ہے اور کیوں کر رہا ہے یہ بالکل واضح ہے۔ امریکہ کے اخلاقی درس و تدریس کا ایک مظاہرہ یہ بھی دیکھئے کہ ہمیں بتایا جاتا ہے کہ دہشت گردوں نے جان بوجھ کر شہر لیوی کو نشانہ بنایا اور اگر کوئی جواب میں یہ پوچھے کہ وحشیانہ امریکی بمباری سے جو غیر جنگجو نشانہ بنے وہ کیا ہے؟ تو کہا جاتا ہے کہ وہ تو حادثاتی طور پر شکار ہوئے کہ جنگ میں بہر حال یہ تو ہوتا ہے۔ مگر اس جواب سے کون مطمئن ہو سکتا ہے جبکہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہر روز ایک ملک کے بعد دوسرے میں یہی منظر دوہرایا جا رہا ہے۔ مہلک ہتھیار پوری قوت کے ساتھ خطرناک تعداد میں بلندی سے گرائے جاتے ہیں یہ جانتے ہوئے بھی کہ ان سے شہریوں کی بہت بڑی تعداد یا تو گل سڑ جائے گی یا زندگی بھر کے لیے معذور اپاہج، لاچار بے کس ہو کر رہ جائے گی۔ امریکی فوج کے ارادوں کے بارے میں صرف اور صرف یہ کہا جاسکتا ہے کہ انہیں کسی بات کی کوئی پروا نہیں۔ اپنے مقاصد حاصل کرنے کے لیے وہ اندھا دھند بمباری کر کے ہر چیز ملیامیٹ کر سکتے ہیں ایسے میں اگر شہری آبادی بھی بری طرح متاثر ہوتی ہے تو انہیں اس سے کوئی مطلب نہیں۔

اکتوبر میں ریاستہائے متحدہ کی گن شپ مشین کے ذریعے افغانستان کے دور افتادہ

گاؤں ”چکر کریر“ میں شدید گولہ باری کی گئی جس کے نتیجے میں 93 نہتے دیہاتی مارے گئے۔ اس افسوسناک واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے پینٹاگون کے ایک اہلکار نے فرمایا کہ ”وہاں لوگ اس لیے مرے ہیں کہ ہم انہیں مردہ دیکھنا چاہتے تھے۔“ ہوتا یہ ہے امریکہ جب کوئی حکومت ختم کرنا چاہتا ہے تو اس قسم کے طریقوں سے وہاں عوام کی مشکلات اتنی بڑھا دیتا ہے کہ وہ خود اپنی حکومت کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں۔ اس کی شہادت برطانیہ کے دفاعی سٹاف اینڈ منسٹریشن کے چیف سرنائیکل بوئس کا یہ اعلان دیتا نظر آتا ہے کہ ”بمباری اس وقت تک جاری رہے گی جب تک کہ اس ملک کے لوگ سمجھ نہیں جائیں گے کہ رہنما تبدیل کئے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے۔“ یہ پالیسی ایف بی آئی کی بین الاقوامی سوہشت گردی کی تعریف کے عین مطابق ہے۔ دوسروں کو جس بات سے رد کا جاتا ہے خود پورے دھڑلے سے وہی کیا جا رہا ہے۔

افغانستان پر کی جانے والی وحشیانہ بمباری کے نتیجے میں ہونے والی تباہی و بربادی ذرائع ابلاغ کے ذریعہ دنیا کے سامنے آتی رہی اور ظاہر ہے کہ اس کے خلاف ہر جگہ عوامی سطح پر شدید احتجاج کیا گیا۔ اس خوفناک تصویر کشی کے رد عمل کے طور پر امریکہ کے خلاف نفرت میں بے حد اضافہ ہوا ایسے میں امریکی میڈیا اپنا کردار نبھانے کے لیے آگے بڑھا۔ جس کی صرف چند مثالیں پیش کرنا چاہوں گا۔ چیئرمین سی این این نے اپنے شعبہ خبر کو ہدایت دی کہ وہ افغانستان میں ہونے والی ہلاکتوں اور دیگر نقصانات اور مشکلات کے بارے میں کم سے کم خبریں دیں۔ فاکس نیٹ ورک کی ”وار رپورٹ“ میں اس بات پر خاموشی ناپسندیدگی کا اظہار کیا گیا کہ اخبار نویس شہری اموات کے بارے میں لکھتے ہی کیوں ہیں؟ اسی پروگرام میں میزبان نے سوال کیا کہ کیا تاریخی طور پر شہری اموات سچ جج جنگ کا حصہ ہیں اور کہا یہ اتنی بڑی خبر ہونی چاہیے جیسے کہ اسے پیش کیا جا رہا ہے؟ اس پر محترم مہمان نے جوئینٹل پبلک ریڈیو کی جانب سے تحفہ فرمایا کہ نہیں۔ جنگ تو لوگوں کو مارنے کیلئے ہی ہوتی ہے ایسے میں شہری آبادی کا ہلاک ہونا کوئی اچھبے کی بات نہیں۔ انہی کے ساتھ بیٹھے دوسرے محترم مہمان نے جو ایک قومی رسالہ یو ایس نیوز اینڈ ورلڈ رپورٹ کے کالم نویس تھے نے اپنے نادر خیالات پیش کرتے ہوئے کہا کہ شہری آبادی کی ہلاکتیں تو کوئی خبر ہی نہیں یہ تو جنگ کے ساتھ ہوتی ہی ہیں۔

پانامہ سٹی میں فلوریڈا نیوز ہیرالڈ کے ایڈیٹروں کو متنبہ کیا گیا کہ صفحہ اول پر ایسی تصویریں نہ لگائی جائیں جن میں ریاستہائے متحدہ کے ہاتھوں افغانیوں کی ہلاکتیں اور

افغانستان کی تباہی و بربادی کے مناظر ہوں۔ اور جب ”فورٹ والٹن بیج“ میں ہماری دوسری شاخ نے ایسا کیا تو انہیں سینکڑوں کی تعداد میں دھمکی آمیز ای میلز وصول ہوئیں۔ میڈیا پر حکومت کا اس حد تک کنٹرول ہے کہ طویل تحقیق کے بعد بھی شاید ہی کوئی ایسا امریکی روزنامہ ملے جس نے واضح طور پر امریکی بمباری کی مخالفت کی ہو یو ایس نیو کی جانب سے دو سال قبل یوگوسلاویہ پر ہونے والی بمباری کے خلاف آواز اٹھائی ہو یا 1991ء میں عراق پر ہونے والی امریکی بمباری کی مذمت کی ہو۔ کیا یہ بات غور طلب نہیں ہے کہ جس معاشرہ کو آزو سمجھا جاتا ہے، جہاں پریس کی مکمل آزادی کا تصور ہے، جہاں 1500 روزنامے شائع ہوتے ہوں مگر سب کے سب فیصلہ کن انداز میں ایک ہی بولی بولیں۔

منافقت ہی منافقت

11 ستمبر کے حملوں کے بعد سیکرٹری آف سٹیٹ کولن پاول نہایت غصے میں یہ بیان دیتے نظر آتے ہیں کہ وہ لوگ بہت بڑی غلط فہمی کا شکار ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ عمارتوں کی تباہی اور لوگوں کے قتل سے وہ اپنے سیاسی مقاصد حاصل کر لیں گے۔ اگر کولن پاول کی اس بات کو درست مانا جائے تو پھر اسے کیا سمجھا جائے جو امریکہ نے 1999ء میں مسلسل 78 دن رات یوگوسلاویہ پر بمباری کر کے اسے تباہ کر دیا۔ اس کا کیا مقصد تھا؟ اور کیا یہ بیان دہشت گردانہ دہی کولن پاول نہیں ہیں جنہوں نے سیاسی مقاصد کے حصول کی خاطر ہی پانامہ اور عراق پر خوفناک بمباری کے احکام جاری کئے؟ سمجھ میں نہیں آتا کہ امریکی رہنما یہ کیوں سمجھتے ہیں کہ کسی کو کچھ یاد ہی نہیں رہتا؟ یا پھر انہیں اس بات کی پرواہ ہی نہیں ہے کہ لوگ ان کی اس منافقت کے بارے میں کیا سوچتے ہیں؟

منافقت کی ایک اور مثال ملاحظہ فرمائیے۔ امریکہ کے خلاف دہشت گردی کے حوالے سے صدر بوش اور دیگر سرکاری اہلکار یہ اعلان کرتے ہیں کہ ریاستہائے متحدہ امریکہ کی یہ جنگ صرف دہشت گردوں کے خلاف نہیں ہے بلکہ ہر اس ملک کے خلاف ہے جو دہشت گردوں کو پناہ دیتا ہے یا پناہ دے گا۔ اس بیان کے جواب کے طور پر ”دہشت گردوں کی جنت“ کے نام سے ایک مکمل باب اس کتاب میں شامل کیا گیا ہے جس میں قارئین دیکھیں گے کہ بہت کم قومیں ہوں گی جو امریکہ سے زیادہ دہشت گردوں کو پناہ دیتی ہیں۔

افغانوں کے ذہنوں اور دلوں کی جیت

امریکہ بہادر کے کردار کا ایک اور پہلو ملاحظہ فرمائیے انہوں نے افغانیوں کو موت اور کھانا ایک ساتھ پیش کیا آسمان پر اڑنے والے امریکی جنگی جہاز جہاں ایک طرف بم گرا رہے تھے تو وہیں اس کے ساتھ ساتھ کھانے پینے کے ڈبے بھی گرائے جا رہے تھے۔ کیا امریکہ سمجھتا ہے کہ اس طرح اس کی عزت بن گئی۔ اس کی رحمہاں پرواہ واہ ہونے لگی۔ اگر اس طرح عزت بنتی ہو یا نفرت ختم ہوتی ہو تو پھر یقیناً امریکی جاپانیوں کی بہت عزت کرتے ہوں گے کیونکہ جاپان نے بھی تو پرل ہاربر پر بمباری کے ساتھ ساتھ خوراک کے خوبصورت ڈبے پھینکے تھے۔ امریکہ کے خیال میں اگر اس طرح دل جیتے جاسکتے ہیں تو پھر ورلڈ ٹریڈ سینٹر تباہ کرنے والے دہشت گردوں سے ایک غلطی ہو گئی۔ انہیں چاہیے تھا کہ جہاز نکرانے سے پہلے ”مین ہیٹن“ پر کچھ گرما گرم سینڈویچ یا دیگر گز وغیرہ گرا دیئے تو.....

اصل میں امریکہ جو کام بھی کرتا ہے بہت سوچ سمجھ کر کرتا ہے۔ امریکہ میں بسنے والا ہر شہری وہی سوچتا ہے جو ان کی حکومت چاہتی ہے حکومت کے لیے اس کا سب سے بڑا ہتھیار میڈیا ہے۔ میڈیا نے جس طرح امریکیوں کے ذہنوں، دلوں اور آنکھوں کو کنٹرول کر رکھا ہے اس کی مثال اور کہیں نہیں مل سکتی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ امریکی اپنی حکومت کے ”موت اور کھانے کی ترسیل“ کے اس عمل سے بہت متاثر ہوئے۔ اپنے ملک کی اعلیٰ طرفی پر ان کے سرخڑ سے بلند ہو گئے۔ بہر حال موت اور خوراک کے ساتھ جو ایک اور چیز افغانوں پر برسا کی گئی وہ اشتعال انگیز پمفلٹ تھے۔ 20 اکتوبر کو جو پمفلٹ گرائے گئے ان کا لب لباب کچھ یوں تھا۔

”کیا تم طالبان کی حکومت سے خوش ہو؟ کیا یہ خوفزدہ زندگی تمہارے لیے فخر کا باعث ہے؟ کیا تم مطمئن ہو کہ وہ جگہ جو نسلوں سے تمہاری ملکیت رہی ہے دہشت گردوں کی تربیت گاہ بن جائے؟ کیا تم ایسی حکومت کے خواہشمند ہو جو افغانستان کو پتھر کے زمانے میں واپس بھیج رہی ہو اور اسلام کو بدنام کر رہی ہو؟ کیا ایسی حکومت تمہارے لیے باعث فخر ہے جو دہشت گردوں کو پناہ دیتی ہے؟ کیا ایسی قوم بن کر رہنا تمہیں پسند ہے جس پر بنیاد پرستوں کی حکمرانی ہو؟ طالبان نے تم سے تہذیب و تمدن اور وراثت چھین لی ہے انہوں نے قومی یادگاریں اور تہذیبی فن پارے تباہ کر دیئے ہیں۔ وہ غیر ملکیوں کی ہدایت کے مطابق تم پر

طاقت اور تشدد کے ذریعہ حکومت کر رہے ہیں اور اس بات پر اڑے ہوئے ہیں کہ ان کا اسلام ہی دراصل اسلام کی اصل شکل ہے۔ وہ قتل کرتے ہیں، نا انصافی کرتے ہیں، تمہیں مفلس اور مجبور رکھتے ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں کہ سب اللہ کے نام پر ہے۔

اگر ایسی ہی سوچ کے ساتھ ایک پمفلٹ ریاستہائے متحدہ امریکہ پر گرایا جائے تو اس کا مضمون کچھ یوں ہوگا۔

”کیا آپ ری پبلکن پارٹی کی حکومت سے خوش ہیں؟ کیا آپ کو خوف، عدم تحفظ اور دہشت کی فضا پسند ہے؟ کیا آپ ایسی جگہ مطمئن ہیں جو نسل در نسل آپ کے خاندان کی ملکیت رہی ہو لیکن پھر کوئی اور اس پر قابض ہو جائے؟ کیا آپ ایک ایسا ٹولہ چاہتے ہیں جو امریکہ کو پولیس سٹیٹ میں تبدیل کر دے اور عیسائیت کو بدنام کرے؟ کیا آپ کو ایک ایسی حکومت کے زیر سایہ رہنے پر فخر ہے جس نے ہزاروں دہشت گردوں کو میامی میں پناہ دے رکھی ہو؟ کیا آپ کو ایک ایسی قوم بن کر رہنا پسند ہے جس پر انتہا پسند سرمایہ داروں اور مذہبی قدامت پرستوں کی حکمرانی ہو؟ ان سرمایہ داروں نے تمہارے ملک سے انصاف اور مساوات کا نام و نشان مٹا کر رکھ دیا ہے، انہوں نے تمہاری قومی تہذیب، اخلاقیات، تمدن تباہ کر دیا ہے، باغات اور دریاؤں کو غارت کر دیا ہے، تمہارے ذرائع ابلاغ، انتخابات یہاں تک کہ ذاتی تعلقات تک کو بے ایمان منافق اور مطلب پرست بنادیا ہے۔ وہ اپنے کدال یعنی مارکیٹ کی ہدایت پر تمہیں بے گھر، بے روزگار، مفلس، لاچار اور بے کس کر دینے کی دھمکیوں کی بنیاد پر حکومت کر رہے ہیں اور بھند ہیں کہ سوسائٹی کو منظم کرنے اور دنیا کی تنظیم نو کا جو طریقہ انہوں نے اختیار کیا ہے وہ ہی سچا ہے اور اوپر سے بھیجا گیا ہے۔ وہ خود کو اخلاقیات کا بہت بڑا استاد سمجھتے ہیں۔ اور اسی اخلاقیات کا درس دیتے ہوئے کہیں وحشیانہ بمباری کرتے ہیں، کسی ملک پر پوری طاقت کے ساتھ چڑھائی کرتے ہیں، قتل کرتے ہیں، ظلم و تشدد کرتے ہیں، نا انصافی کرتے ہیں، تختے اٹتے ہیں، تمہیں مفلس اور لاچار رکھتے ہیں اور دعویٰ یہ کرتے ہیں کہ یہ سب خدا کے نام پر ہے۔“

افغانستان کی تعمیر نو

”ریاستہائے متحدہ امریکہ کا افغانستان کی تعمیر نو پر غور و خوض۔“ یہ تھی ”واشنگٹن

پوسٹ“ کی 21 نومبر کی شہ سرخی۔ واشنگٹن میں دو درجن قوموں کے رہنماؤں اور بین الاقوامی تنظیموں کے نمائندوں کی ایک روز کی گفت و شنید کے بعد جنگ زدہ افغانستان کی تعمیر نو کیلئے ایک ایکشن پروگرام ترتیب دینے کا اعلان کیا گیا۔ گویا گیارہ ستمبر کے بعد سے امریکہ کی طرف سے برسنے والی آگ میں جلتے بجھتے شہریوں کے زخموں پر پھاہے رکھنے کو یہ سب اکٹھے ہوئے تھے مگر یہ اعلان حقیقت سے زیادہ اشتہار بازی لگتی ہے کیونکہ ماضی کا ریکارڈ تو کچھ یہ ہی بتاتا ہے۔ دیت نام میں امریکہ نے تحریری طور پر وعدہ کیا تھا کہ جنگ کے بعد وہاں کی تعمیر نو کی جائے گی مگر ایک دہائی گزرنے کے بعد بھی دیت نامیوں کو معاوضہ ادا نہیں کیا گیا۔ 1980ء میں گریناڈا اور پاناما پر امریکہ نے دل کھول کر بمباری کی جس کے بعد تباہی کا شکار ہونے والے سینکڑوں پانامیوں نے امریکی عدالتوں میں مقدمات دائر کئے سپریم کورٹ تک گئے مگر انہیں بھی ”گریناڈا“ کے عوام کی طرف ”ستانی“ کے طور پر کچھ نہ ملا۔ 1991ء میں عراق کی باری آئی۔ 40 دن اور راتوں کی مسلسل بمباری کے بعد ہر وہ چیز تباہ کر دی گئی جو جدید سوسائٹی کا لازمہ سمجھی جاتی ہے۔ یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہے کہ عراق کی تعمیر نو میں ریاستہائے متحدہ نے کتنی مدد کی۔ 1999ء میں یوگوسلاویہ کی مثال ہے 78 دن رات بمباری کر کے ایک ترقی یافتہ صنعتی ملک کو تیسری دنیا کے پسماندہ ملک میں تبدیل کر دیا گیا۔ دو سال تک اس کی تعمیر نو کا معاملہ زیر التواء رہا۔ بلاآخر جون 2001ء میں یورپی کمیشن اور ورلڈ بینک نے ایک امدادی کانفرنس منعقد کی۔ سمجھا تو یہ جارہا تھا کہ اس کانفرنس میں یوگوسلاویہ کی تعمیر نو کا فیصلہ کیا جائے گا مگر اس کی بجائے یوگوسلاویہ کے قرضوں کو اس کانفرنس کا موضوع بنا لیا گیا جس پر سربراہین وزیراعظم ”زورن چنک“ نے جو مغرب کا بہت بڑا حامی سمجھا جاتا ہے ایک جرمن رسالے ”دیرسپیکل“ کو انٹرویو میں واضح طور پر کہا کہ اسے مغرب نے دھوکہ دیا ہے۔ اس بے مقصد امدادی کانفرنس کے انعقاد کی بجائے بہتر یہ ہوتا کہ ہمیں 50 ملین ڈی ایم نقد دے دیئے جاتے۔ اگست میں ہمیں 300 ملین یورو کی شکل میں پہلی قسط ملنی تھی اور اب ہمیں اچانک بتایا جا رہا ہے 225 ملین یورو ان قرضوں کی ادائیگی کے لیے روک لیے جائیں گے جو ٹیڈ کے وقت میں جمع ہوئے تھے۔ اس رقم کا 2/3 حصہ جرمانہ اور سود ہے کیونکہ ”میلوسوویچ“ دس سال تک اس رقم کی ادائیگی سے انکار کرتا رہا۔ باقی جو 75 ملین یورو رہ جائیں گے وہ ہمیں نومبر میں ملنے کی امید دلائی گئی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہمیں یہ بھی یاد کرایا گیا ہے کہ مغرب میں ایسے

اصول ہوتے ہیں۔ گویا شدید بیماری میں مبتلا شخص کو اس کی موت کے بعد دوا دی جاتی ہے۔ ان حالات میں جولائی، اگست اور ستمبر ہمارے لیے سخت ترین مہینے ہوں گے۔ 2001ء کے آخر تک یوگوسلاویہ کی تباہی کو ڈھائی سال گزر جانے کے باوجود اس بمباری کے مرتکب اور تعمیر نو کی تحریک کے معمار امریکہ بہادر سے اسے کوئی امدادی رقم حاصل نہیں ہوئی تھی۔ گویا اب افغانستان کا حکمران جو بھی ہو گا اس کے لیے افغانستان کی تعمیر نو کے لیے امریکی امداد کی توقع رکھنا عبث ہے۔ یوں بھی واشنگٹن پوسٹ کی 21 نومبر کی شدہ سرخی کے مطابق بش انتظامیہ نے صاف صاف اس بات کا اعلان کیا ہے کہ چونکہ نئی افغان حکومت کے قیام اور فوجی کارروائی کے سلسلہ میں ریاستہائے متحدہ امریکہ اپنا حصہ ادا کر چکا ہے اس لیے اب افغانستان کی تعمیر نو کے لیے دیگر ممالک خاص طور پر جاپان اور یورپی اقوام کو اپنا کردار ادا کرنا چاہیے۔ اس بیان سے تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے افغانستان پر کی جانے والی بمباری امریکہ کی نہیں بلکہ جاپان اور یورپ کی خواہش پر کی گئی ہو اور ان کے مفاد میں ہو۔

عراق پر بمباری کے بعد امریکہ نے سعودی عرب اور خلیجی علاقہ میں واقع دیگر ہمسایہ ممالک سے اپنے فوجی اڈے ختم کر دیئے تھے۔ یوگوسلاویہ پر بمباری کے بعد کوسووا، البانیہ، مقدونیہ، ہنگری، بوسنیا اور کروشیا میں قائم کئے گئے اپنے فوجی اڈے ختم کر دیئے تھے مگر افغانستان پر بمباری کے خاتمے کے بعد بھی امریکہ افغانستان، پاکستان، ازبکستان، تاجکستان اور دیگر جگہوں پر قائم شدہ اپنے فوجی اڈے ہرگز ختم نہیں کرے گا۔

افغانستان پر جارحیت کے ذریعہ قبضہ کیا گیا ہے اور نئی حکومت کا قیام بھی امریکی مقاصد کو پورا کرنے کے لیے عمل میں لایا گیا ہے۔ یہ وہ ہی لوگ ہیں جو طالبان سے قبل افغانستان پر قابض تھے اور انہی کے خلاف افغانوں نے طالبان کو خوش آمدید کہا تھا۔ اب ان کی نئی زیادتیاں امریکہ کے زیر سایہ شروع ہو چکی ہیں۔ عبوری حکومت کے سربراہ حامد کرزئی حکومت چلانے اور اپنی ساکھ قائم رکھنے کے لیے امریکی سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ، نیشنل سیکورٹی کونسل اور وزارت خارجہ کے ساتھ اپنے قریبی تعلقات کو استعمال کرنے کی کوشش کریں گے مگر یہ تعلق بھی ایک بار سے زیادہ ان کے کام نہیں آئے گا ان کی امریکہ کے نزدیک کیا اہمیت ہے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب انہوں نے دبیر میں امریکہ سے بمباری بند کرنے کی درخواست کی تو نہایت رکھائی سے انہیں انکار کرتے ہوئے کہا گیا کہ وقت کا

امریکہ کا اپنا شیڈول ہے۔ یقیناً یہ طرز عمل مستقبل میں افغان حکومت اور سوسائٹی کے لیے نیک شگون نہیں ہے۔ اور نیک شگون تو کرزئی کی جانب سے جنرل رشید دوستم جیسے ظالم شخص کی بطور نائب وزیر دفاع تعیناتی بھی نہیں ہے۔ یہ وہ شخص ہے جس کی ایک عادت یہ ہے کہ سپاہیوں کو سزا دینے کے لیے نینک کے نیچے باندھ کر اپنی بھرکس کے گرد چکر لگواتا تھا یہاں تک کہ ان کا بھرتہ بن جاتا تھا۔

دہشت گردوں کا خوف

اگلے صفحات پر آپ جو تعارف پڑھیں گے وہ 1999ء میں تحریر کیا گیا تھا اس میں جس نکتہ پر بحث کی گئی ہے وہ ہے امریکہ کا بڑھتا ہوا دفاعی بجٹ اس کے اسباب اور حقائق اور اس بات کی حقیقت یہ ہے کہ امریکی عوام کو قومی سلامتی اور تحفظ کے نام پر آمادہ کیا جاتا رہا ہے کہ وہ اپنی پوری قوت عسکرانوں کے پلڑے میں ڈال دیں تاکہ وہ انہیں خوف، دہشت اور دشمن سے نجات دلائیں۔ قومی سلامتی ہی کی آڑ میں ہر سال دفاع کے نام پر بڑے بڑے بجٹ کے ذریعہ کرتا دھرتاؤں کے ذاتی مفادات کا تحفظ اور پولیس کے اختیارات میں بے تحاشہ اضافے کا جواز بھی تلاش کیا جاتا رہا تاکہ نقادوں کا منہ بند کیا جاسکے۔ مگر سوال یہ ہے کہ گیارہ ستمبر کو جو کچھ ہوا ایسے میں برسوں کی دفاعی تیاریاں کہاں گئیں۔ دشمن نے تو دفاع کی علامت یعنی بیٹا گون کو ہی نشانہ بنالیا۔ امریکہ کی جو خارجہ پالیسی ہے اس کی موجودگی میں امریکہ پر ایسے حملے مستقبل میں بھی ہوتے رہیں گے جن سے نمٹنے کے لیے دفاعی تیاری اور فوج کی بہر حال ضرورت ہے مگر دفاع کا مطلب تو یہ ہی ہے کہ بھرپور طریقہ سے دفاع کیا جائے اور دشمن کے ارادے خاک میں ملا دیئے جائیں۔ دوسری صورت میں خواہ کتنی ہی بڑی فوج رکھ لیں اتنی ہی رقم دفاع کے نام پر مختص کر دیں نتیجہ یہی ہوگا۔ امریکہ کو اب یہ بھی سوچنا ہوگا کہ دشمن دھکیوں کو عملی جامہ بھی پہنا سکتا ہے اسے اپنی غلط فہمی دور کرنا ہوگی۔ نصف صدی تک سوویت یونین کی طرف سے امریکہ پر تابکاری حملہ کی دھمکی اس لیے محض دھمکی رہی کہ سوویت یونین نے داخلی وجوہات کی بناء پر اسے عملی جامہ پہنانے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ بہر حال سوویت یونین کے خاتمے کے بعد جہاں امریکہ پر طاری یہ مستقل خوف ختم ہوا وہیں کئی اور ممالک کی طرف مختلف قسم کے خوف پیدا ہو گئے۔ کسی کی طرف سے منشیات کے پھیلاؤ کا خوف، کسی کی جانب

سے دہشت گردی کا خوف اور اس خوف کی بنیاد پر دفاعی بجٹ میں اضافہ ہی اضافہ ہوتا رہا۔
 نقادوں کے مطابق اب گیارہ ستمبر کے واقعہ نے جہاں امریکی عوام کو بری طرح متاثر کیا ہے
 وہیں قومی سلامتی کے اداروں اور انتظامیہ کے لیے ہر نیا دن کرسمس بن گیا ہے۔ ان کی تو گویا
 دلی مراد پوری ہو گئی ان کی خواہشات کی فہرستیں جاری ہونا شروع ہو گئیں۔ مختصر یہ کہ انہوں
 نے اضافی دفاعی اخراجات کو نہایت بے شرمی سے خرچ کیا، سماجی اخراجات کا گلا گھونٹتے
 ہوئے بڑی بڑی کارپوریشنوں کیلئے ٹیکس چھوٹ کو بے حیائی سے بڑھا دیا۔ شہری حقوق کو
 بہت بری طرح سے پامال کیا گیا۔ بے عزت کی حد تک کڑی نگرانی، شہریوں کے خلاف مقدمہ
 بازی، پولیس کے لامحدود اختیارات، ان کے گھروں میں بلا اجازت داخل ہونے کا سرکاری
 اجازت نامہ، موقع محل کے لحاظ سے قانون میں رد و بدل اور قانون سازی کے ذریعہ امریکی
 شہنشاہیت کو پھیلانے کا اعلان کیا گیا۔ اس عذاب سے کوئی محفوظ نہیں رہا۔ جس نے اس کے
 خلاف زبان کھولی وہ معتبہ ٹھہرا۔ خواہ وہ کوئی شخص ہو یا کوئی ملک۔ ایک طرف جہاں دہشت
 گردی کے خلاف اس ”مقدس جنگ“ کی ڈھکے چھپے یا واضح الفاظ میں مخالفت کرنے والے
 ممالک کو جن میں عراق، شامی کوریا اور سوڈان وغیرہ شامل تھے سنگین نتائج بھگتتے پڑے وہیں اس
 جنگ کے خلاف آواز اٹھانے والے مختلف اداروں کے ملازموں کو اپنی ملازمتوں سے ہاتھ
 دھونے پڑے نجانے کتنے تعلیمی اداروں کے اساتذہ کو کھلے عام ذلیل کیا گیا، نجانے کتنے
 طالب علم اس جرم کی پاداش میں نکال دیئے گئے اور یہی نہیں کاغذیں کے اس رکن کو جس نے
 فوجی طاقت کے استعمال کے خلاف رائے دی تھی۔ بے شمار دھمکی آمیز خطوط موصول ہوئے۔
 پولیس کا کام اب شہریوں کے حقوق کی حفاظت نہیں رہا بلکہ انہیں ڈرا دھمکا کر رکھنا اور اپنی
 مرضی کے مطابق عمل کرانا ہو گیا ہے۔ کیا یہ حالات بزبان خود اعلان نہیں کر رہے کہ امریکہ
 پولیس سٹیٹ بن چکا ہے اور کیا اس سے بدترین پولیس سٹیٹ دنیا میں کہیں اور ہو گی؟ پولیس
 کے اختیارات تو منشیات کے خلاف جنگ کی آڑ میں ہی بہت زیادہ بڑھا دیئے گئے تھے اور
 اب گیارہ ستمبر کے بعد تو انہیں بالکل ہی چھوٹ دے دی گئی ہے۔ سیاہ و سفید کا مالک بنا دیا گیا
 ہے۔ جس کے ساتھ جو مرضی آئے کریں کوئی پوچھنے والا نہیں۔

دہشت گردی کے خلاف بننے والا نیا قانون جتنی تیزی کے ساتھ تمام مراحل طے کر
 کے منظور بھی ہو گیا اس سے صرف اور صرف ایک ہی بات واضح ہوتی ہے کہ اس کا مقصد شہری

آبادی پر دباؤ اور ان کی رسوائی ہے۔ کسی بھی طریقہ سے حکومتی پالیسی پر اثر انداز ہونے کو بھی ”دہشت گردی“ کے زمرے میں شامل کرنے کا مقصد بھی صرف یہ ہے حکومت کے کسی بھی اقدام کے خلاف کوئی آواز نہ اٹھ سکے۔ اس قانون کے ذریعہ کسی ایک فرد کی گرفتاری عمل میں نہیں آئے گی بلکہ اس پورے گروپ کے خلاف کارروائی کی جائے گی جس میں وہ شامل ہو گا۔ ان کے خلاف ہونے والی کارروائی میں دیگر سزاؤں کے ساتھ ایک سزایہ بھی ہوگی کہ پوری دنیا میں جہاں کہیں بھی ان کی جائیداد ہوگی ضبط ہو جائے گی۔ اس صورتحال میں کتنے نوجوان ہوں گے جو اپنا مستقبل ایسے خطرے میں جمونک سکیں گے اور کتنی تنظیمیں ہوں گی جو سب کچھ کھونے کو تیار ہوں گی۔

کون کیا کچھ جانتا تھا

گیارہ ستمبر کے بعد سامنے آنے والی رپورٹوں میں یہ سوال مشترکہ طور پر اٹھایا گیا ہے کہ کیا امریکی خفیہ ادارے لہر محکمہ دفاع اس واقعہ کے حوالے سے بالکل ہی لاعلم تھا؟ اس حوالے سے چند رپورٹیں حاضر ہیں جن سے حقیقت حال واضح ہو سکتی ہے۔ جولائی 2001ء میں، یعنی کے ایک ہسپتال میں سی آئی اے کی اسامہ بن لادن سے ملاقات کی رپورٹیں ریکارڈ پر ہیں۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اسرائیل کی خفیہ تنظیم موساد کو بھی اس کے بارے میں نہ صرف پورا علم تھا بلکہ بعض رپورٹوں کے ذریعہ اس کی موجودگی بھی ثابت کی جا چکی ہے۔ بش خاندان کے بن لادن خاندان کے ساتھ تعلقات کے بارے میں بھی شواہد سامنے آتے رہے ہیں اور آئندہ بھی محققین اور اشاعتی ادارے اس حوالے سے بہت کچھ شائع کرتے رہیں گے۔ کون کون کس کس بات سے کس حد تک واقف تھا اس حوالے سے میں اپنے مشاہدات پر مبنی تجزیہ ضرور پیش کر سکتا ہوں۔ یہ بات بالکل درست نہیں کہ دہشت گردی کے ان واقعات سے ایف بی آئی سی آئی اے یا این ایس اے بالکل بے خبر تھے۔ ان کے علم میں یہ ضرور ہوگا کہ ریاستہائے متحدہ امریکہ خاص قسم کی دہشت گردی کا شکار بننے والا ہے۔ البتہ یہ ضرور مانا جا سکتا ہے کہ انہیں یہ اندازہ نہ ہو کہ دہشت گردی اس حد تک خوفناک ہو سکتی ہے۔ یہ بات اس لیے بھی یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ ماضی کا ریکارڈ یہ ثابت کرتا ہے۔ فردری 2000ء کا واقعہ اب تک بہت سے ذہنوں میں تازہ ہوگا جب اسرائیل میں خودکش حملوں کے خلاف پہلی مین

الاتحادی کانفرنس منعقد ہوئی تھی۔ اس میں سی آئی اے کو ایک خاص وارننگ موصول ہوئی تھی کہ دہشت گرد تجارتی ہوائی جہاز اغوا کرنے کا منصوبہ بنا رہے ہیں تاکہ امریکہ کے اہم مقامات کو ان کے ذریعے نشانہ بنایا جائے۔ اسی طرح 1995ء میں بھی فلپائن میں گرفتار ہونے والے ایک دہشت گرد نے بھی اپنے گروپ کے پروگرام سے باخبر کر دیا تھا کہ چھوٹے جہازوں کو اغوا کر کے انہیں ہتھیار کے طور پر استعمال کرتے ہوئے سی آئی اے اور دیگر حکومتی اداروں کو تباہ و برباد کرنے کا منصوبہ عملدرآمد کے لیے تیار ہے۔ ایسے میں دہشت گردی کا یہ طریقہ کم از کم امریکی خفیہ اداروں کے لیے جو حیرت کا باعث نہیں ہوتا چاہیے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ گیارہ ستمبر کو ہوائی جہاز ہائی جیک کرنے والوں میں سے دو یا تین ایف بی آئی کی لسٹ پر موجود ہیں۔

کیا دہشت گردی ختم کرنے کا یہ طریقہ درست ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ دہشت گردی کے خاتمے کے اس تباہ کن طریقہ نے دنیا بھر میں مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد کو اپنے دین کے حوالے سے جذباتی کر دیا ہے۔ وہ اسامہ بن لادن کے مقاصد کو درست سمجھتے ہوئے اس کی تقلید کے راستہ پر چل پڑے۔ دسمبر کا واقعہ ہے جب افغانستان پر امریکی بمباری جاری تھی ایک نو مسلم برطانوی شہری رچرڈ ریڈ نے امریکہ جانے والے امریکی ایئر لائنز کے ایک جہاز کو اپنے جوتوں میں چھپائے گئے دھماکہ خیز مواد سے اڑانے کی کوشش کی صرف یہ ہی نہیں لندن کی اس مسجد کے امام نے جہاں ریڈ پابندی سے جاتا تھا انکشاف کیا کہ انہما پسندوں نے ریڈ کی طرح کے بہت سے نوجوانوں کی فہرست تیار کر رکھی ہے۔ امام نے مزید بتایا کہ وہ برطانیہ میں موجود سینکڑوں رچرڈ ریڈوں کو جانتا ہے۔ برطانوی نو مسلم ریڈ کو اخبارات ”روس بننے والا“ کہہ کر پکار رہے ہیں اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ جیس بکچ کر امریکن ایئر لائنز کے جہاز میں سوار ہونے سے قبل اسرائیلی ’مصر نیدر لینڈ اور ہیبلجیم گیا تھا۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اسے پیسہ کہاں سے مل رہا تھا؟

صورتحال سے تو ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ حال ہی امریکہ کی طرف سے دنیا بھر میں منجمد کیے جانے والے بے شمار فئذ ان گروپوں کی دسترس میں تھے۔

امریکی حکومت کی افغانستان پر وحشیانہ بمباری کے بعد سے امریکیوں میں عدم تحفظ کا احساس بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ اس خوف دہشت اور احساس عدم تحفظ کے باعث وہ نفسیاتی

مریض بن کر رہ گئے ہیں یہ بات ان کے ذہن کے کسی نہ کسی گوشے میں بیٹھ چکی ہے کہ جو کچھ امریکہ دنیا بھر میں کر رہا ہے اس کے انتقامی رد عمل کا نشانہ بہر طور عوام نے ہی بننا ہے۔ مگر یہاں سوال یہ ہے کہ کیا اتنا سب کچھ ہو جانے کے باوجود طاقت کے زعم میں مبتلا کرتا دھرتاؤں نے کچھ سبق حاصل کیا؟ اس سوال کے جواب میں سی آئی اے کے سابق سربراہ مسٹر جیمز ودلے کا یہ بیان پیش کیا جاسکتا ہے جو انہوں نے غرور سے گردن اڑاتے ہوئے عراق پر امریکی حملوں کی وکالت میں جاری کیا کہ افغانستان کے معاملہ میں امریکہ کی کامیابیوں کے حوالے سے عرب عوام کی خاموشی یہ ثابت کرتی ہے کہ صرف خوف ہی وہ ہتھیار ہے جو امریکہ کی دنیا بھر میں عزت اور تکریم کا باعث بن سکتا ہے۔

امریکہ اگر اپنے خلاف دہشت گردی ختم کرنا چاہتا ہے اسے جڑ سے اکھاڑ پھینکنا چاہتا ہے تو اس کے لیے اسے صرف اپنی خارجہ پالیسی کو مکمل طور پر تبدیل کرنے کی ضرورت ہے۔ یہی وہ طریقہ ہے جو امریکہ کے خلاف منافرت کو نہ صرف کم بلکہ ختم کر دے گا۔

اگر میں امریکی صدر ہوتا تو محض چند روز میں ریاستہائے متحدہ امریکہ کے خلاف دہشت گردوں کے نہ صرف حملے بلکہ دہشت گردی کے امکانات بھی مستقل طور پر ختم کر دیتا۔ اس کے لیے مجھے صرف چند کام کرنے ہوتے۔ سب سے پہلے تو میں امریکی استعماریت کا شکار ہونے والے لاکھوں متاثرین بیواؤں اور یتیموں سے کھلے دل سے معافی مانگتا پھر پورے خلوص کے ساتھ یہ اعلان کرتا کہ آج سے دنیا بھر میں امریکی مداخلت کا مکمل طور پر خاتمہ ہو گیا ہے۔ اس کے بعد اسرائیل کو اطلاع دیتا کہ آج کے بعد وہ امریکہ کی 51 ویں ریاست نہیں بلکہ ایک بیرونی ملک ہے۔ پھر میں فوجی بجٹ میں 90 فیصد کمی کرتا اور ان بچتوں کو متاثرین کی بحالی کے لیے استعمال کرتا۔ یہ رقم کافی سے بھی زیادہ ہوتی کیونکہ اس وقت ایک سال کا فوجی بجٹ 330 بلین امریکی ڈالر ہے گویا یہ رقم حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے لے کر آج تک اٹھارہ ہزار ڈالر فی گھنٹہ کے مساوی ہے۔

یہ ہیں وہ اقدامات جو میں اپنی صدارت کے پہلے تین روز میں وائٹ ہاؤس میں کرتا اور چوتھے روز مجھے قتل کر دیا جاتا۔ (ولیم ہیلیم)

(وائٹنگٹن ڈی سی۔ جنوری 2002ء)

تعارف

اس کتاب کا نام "Serial Chaiw-Saw Baby Killers and the Women who Love them" ہونا چاہیے تھا۔ دراصل عورت اس بات پر کبھی یقین نہیں کرتی کہ اس کا محبوب کوئی برا کام بھی کر سکتا ہے۔ اسے آپ کتنا ہوا عضو یا بغیر سر کا جسم بھی ثبوت کے طور پر دکھا دیں گے تو وہ یہی کہتی رہے گی کہ اس کے محبوب نے یہ قتل کسی اعلیٰ مقصد کے لیے کیا ہو گا یا پھر اس کے ساتھ کوئی ایسا حادثہ پیش آ گیا ہو گا کہ ایسا کرنا ضروری ہو گیا ہو گا۔ کبھی وہ اسے انسانی غلطی قرار دیں گی تو کبھی قسمت کا پھیر غرضیکہ وہ اپنے محبوب کو ہرگز قصور وار نہیں ٹھہرائے گی۔ وجہ صرف وہ اندھا اعتماد ہے جو اسے اپنے محبوب پر ہے۔ کچھ ایسی قسم کا یقین امریکی عوام امریکہ پر رکھتی ہے اس کے ساتھ ساتھ گزشتہ 70 سالوں میں ریاستہائے متحدہ امریکہ نے دنیا کو خود پر ایسا ہی یقین کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ وہ تقریباً ساری دنیا کو اس بات کا برسوں سے یقین دلارہا ہے کہ کوئی بین الاقوامی سازش ہو رہی ہے۔ ایسی بین الاقوامی اشتراکی سازش جس کے ذریعہ پوری دنیا پر قبضہ کر لیا جائے گا۔ یہ سازش تیار کرنے والے عناصر ایسے مقاصد کے حصول کے لیے دنیا پر اپنا مکمل اختیار چاہتے ہیں جن کی کوئی تہذیبی قدر و قیمت نہیں اور اس سازش سے دنیا کو صرف امریکہ ہی بچا سکتا ہے انہیں اشتراکیت کے اندھیروں سے بچا کر روشنی میں لانے والا صرف امریکہ ہی ہے۔ دنیا یہ چاہتے ہوئے بھی اس پر اعتبار کرنے پر مجبور ہے۔ جو امریکہ کہتا ہے وہ کرنے پر مجبور ہے۔ امریکہ کہتا ہے مجھ سے ہتھیار خریدو میری فوج اور کارپوریشنوں کو اپنی زمین پر آزادی سے مڑگشت کرنے دو۔ اور اپنے حکمران کا انتخاب مجھ پر چھوڑ دو اس کے بدلے میں تمہیں مکمل تحفظ دیا جائے گا۔ اور بس دنیا اس کے جال میں پھنسی چلی گئی۔ یہ بالکل وہی طریقہ ہے جو مرد نے عورت پر

حکومت کرنے اور اس پر غلبہ حاصل کرنے کے لیے اختیار کیا تھا۔ مرد نے عورت کو جس لمحہ قائل کر لیا کہ وہ اس کو تحفظ دے گا اور اسے اپنی حفاظت کے لیے مرد کی ضرورت ہے اس لمحہ سے وہ اس کی باندی بن گئی تھی اس کے اشاروں پر ناچنے والی گڑیا کسی نے یہ نہیں سوچا کہ بالفرض اگر سارے مرد رات بھر غائب رہیں تو کتنی عورتیں گلیوں میں ٹھلنے سے خوفزدہ رہیں گی؟ اگر کسی ملک کے لوگ یہ تسلیم کرنے کے لیے تیار ہی نہ ہوں کہ انہیں تحفظ کی ضرورت ہے اور اگر وہ امریکی ارادوں کو خاطر میں لانے سے انکار کر دیں تو انہیں واضح طور پر کمیونزم کی دوزخ میں بھسم کرنے کی دھمکیاں دی جاتی ہیں وہ سی آئی اے کی لسٹ پر آ جاتے ہیں اور پھر بھانوں بھانوں سے انہیں ملیا میٹ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور یہ کوششیں اس وقت تک جاری رہتی ہیں جب تک مقصد حاصل نہ ہو جائے۔

1945ء سے آج تک امریکہ مستقل دنیا بھر کے ممالک کے ”تحفظ“ کے لیے کوشاں ہے اس کی چند مثالیں ملاحظہ فرمائیے۔ گذشتہ نصف صدی کے دوران اس نے مختلف ممالک کی 40 حکومتوں کے تختے اٹھنے میں اہم کردار ادا کیا 30 سے زیادہ قوم پرست عوامی تحریکوں کا سرکھلا جو ان حکومتوں کے خلاف کام کر رہی تھیں جو امریکہ کی مرضی سے وہاں بیٹھی تھیں۔ ایسے نہ نجانے کتنے ہی کارنامے ہیں جن کی انجام دہی کے دوران امریکہ لاکھوں انسانوں کی جانوں کے ضیاع کا سبب بنا اور نجانے کتنے معذوری اور ذہنی کرب میں مبتلا ہو کر زندگی کے دن پورے کرنے پر مجبور ہو گئے امریکہ کے اس کردار کے حوالے سے میں نے اپریل 1991ء میں لکھا کہ ریاستہائے متحدہ امریکہ ایک جدید تہذیب یافتہ ملک یوگوسلاویہ کو صنعتی دور سے پہلے کی حالت میں لانے کے لیے بمباری میں مصروف ہے اور امریکی عوام یہ یقین کرنے پر مجبور ہیں کہ ان کی حکومت یہ کام انسانیت کی بھلائی کے لیے کر رہی ہے اس کی وجہ وہی ہے کہ ان کے ذہنوں میں یہ بات بٹھادی گئی ہے کہ ان کی حکومت کوئی برا کام کر رہی نہیں سکتی۔

”نیورلڈ آرڈر“ کا سبب بھی دنیا کو تحفظ فراہم کرنے کی آڑ میں امریکی شہنشاہیت کو قائم رکھنا ہے۔ اسی طرح وہ تمام معاہدے جو بظاہر تو دنیا کی فلاح و بہبود کے لیے قائم کئے گئے ہیں دراصل امریکی مفادات کے لیے کام کر رہے ہیں۔ NATO سے بڑھ کر اور کیا مثال ہو گی۔ حال ہی میں (NATO) North Atlantic Treaty

Organization کے پچاس سالہ جشن کا واشنگٹن میں اہتمام کیا گیا۔ اس سہ روزہ جشن میں شرکت کرنے والے ممالک کے صدور و وزراء اعظم اور وزراء خارجہ کے لیے یہ بات نہایت فخر کا باعث تھی کہ انہیں امریکہ بہادر کے قریبی دوستوں میں شامل ہونے کا اعزاز دیا گیا ہے۔ اس جشن کو منانے کے لیے پرائیویٹ کارپوریشنوں نے پیسہ فراہم کیا جن میں سے ایک درجن سے زائد کارپوریشنوں نے اس کے لیے 2,50,000 ڈالر یکمشت ادا کیے کہ ان کے سربراہ کو NATO کی مہمان نوازی کی کمیٹی میں ڈائریکٹر کی حیثیت سے خدمات انجام دینے کا موقع مل سکے۔ پھر وارے نیارے بہت سی فرموں کی یہ کوشش تھی کہ کسی طرح سے چیک ری پبلک، ہنگری اور پولینڈ کو NATO میں شامل کر لیا جائے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ ممالک ان سے بہت بڑی تعداد میں فوجی ساز و سامان خریدنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ ان معاہدوں کی آڑ میں مفادات کا جو کھیل کھیلا جا رہا ہے وہ کسی کی نظر سے بھی پوشیدہ نہیں۔

آئیے ذرا اسی حوالے سے ایک نظر امریکہ کی جدید تاریخ پر بھی ڈال لیں جو یقیناً سبق آموز بھی ہے کہ امریکہ حقیقت میں کیا کچھ کر رہا ہے۔

1994ء کی کانگریس رپورٹ کے مطابق 1940ء میں دو خطرناک گیسوں مسٹر ڈگیس اور بلسٹرگیس کے تجربہ کے لیے ساٹھ ہزار فوجیوں کو انسانی فاسد مادہ کے طور پر استعمال کیا گیا۔ ان میں سے اکثریت کو ان تجربات کی حقیقت کے بارے میں نہیں بتایا گیا تھا نہ ہی بعد میں انہیں کسی قسم کی طبی امداد دی گئی۔ یہی نہیں ان میں سے کئی ایسے تھے جنہیں اس حوالے سے دھمکیاں دی گئیں اور سختی سے خبردار کیا گیا کہ وہ ان تجربات کا ذکر اپنے والدین، بیویوں یہاں تک کہ خاندانی ڈاکٹروں سے بھی نہ کریں۔ اگر انہوں نے ایسا کیا تو انہیں ”لیون ورثہ“ کے قلعہ میں قید کر دیا جائے گا۔ بیٹھا کون مسلسل کئی دہائیوں تک اس بات سے انکار کرتا رہا کہ اس قسم کی کوئی تحقیق کی گئی تھی نتیجتاً کئی دہائیوں تک ان تجربات کا شکار ہونے والے بیمار یوں، معذوریوں اور پریشانوں میں مبتلا رہے۔

1990ء کی طرف آئیں تو غلجی جنگ سے واپس آنے والے ہزاروں سپاہی اپنی ہیلکائی ہوئی غیر معمولی بیماریوں میں مبتلا تھے۔ طبی جانچ پڑتال کے بعد ہونے والی تشخیص سے اندازہ ہوا کہ یہ انتہائی نقصان دہ کیمیائی حیاتیاتی عوامل کے اثرات ہیں مگر بیٹھا کون مستقل اس سے انکار کرتا رہا۔ وقت گزرتا رہا اور متاثرین اعصابی تکالیف، یادداشت کی کمی، خطرناک خارش

پچھپھردوں، پٹھوں اور جوڑوں کے درد شدید سردرد وغیرہ جیسی بیماریوں کا شکار بنتے رہے۔ متاثرین کی تعداد حد سے تجاوز کرنے لگی تو پیٹھا گون کا انکار ہچکچاہٹ اور کھسیاہٹ آمیز اقرار میں تبدیل ہونے لگا۔

”کیمیادی ہتھیار استعمال تو کئے گئے تھے۔“

”شاید زہر میں بچے ہوئے ہتھیاروں کے استعمال کی وجہ سے۔“ مگر اب بھی واضح اقرار نہیں تھا۔ متاثرین میں امریکی سپاہیوں کے ساتھ دیگر ملازمین بھی کافی تعداد میں تھے۔ متاثرین کی تعداد پانچ ہزار کے لگ بھگ ہوئی تو سرگوشیاں بلند آوازوں میں بدلنے لگیں، پھر یہ تعداد پندرہ ہزار اور بالآخر بیس ہزار آٹھ سو ساٹھ ہوئی تو ہر جانب ایک شور مچ گیا۔ پیٹھا گون کے لیے حالات کو سنبھالنا مشکل ہونے لگا۔ تب پیٹھا گون نے ذمہ داری قبول کرتے ہوئے اعلان کیا کہ جدید کمپیوٹر ٹیکنالوجی سے اندازہ لگایا گیا ہے کہ تقریباً ایک لاکھ امریکی سپاہیوں میں سیرین گیس پائی جاسکتی ہے۔ سپاہیوں کو مجبور کیا گیا کہ وہ انٹرمیکس اعصابی ویکسین لیں جو ایف ڈی اے کی طرف سے نہ تو منظور شدہ تھی نہ ہی موثر۔ انکار پر انہیں باقاعدہ مجرموں کی طرح سے سزائیں دی گئیں۔ گویا بیماری اور عذاب میں بھی وہی جتلا ہوئے سزائیں بھی انہیں ہی ملیں اور قصور داروں کے ہاتھ بالکل صاف رہے۔ اس سے قبل بھی دوسری جنگ عظیم کے دوران امریکی سپاہیوں کو مجبور کیا گیا تھا کہ وہ پہلے بخار کی ویکسین لیں اور ویکسینیشن کے نتیجے میں تین لاکھ تیس ہزار سپاہی ہپاٹائٹس ”بی“ کے مرض میں مبتلا ہو گئے۔ اب بھی یہی ہوا جب سپاہیوں کو زبردستی ویکسین دی گئی اور اس کے مضر اثرات ظاہر ہونے لگے تو خلیجی جنگ کے 9 سال بعد 1999ء میں محکمہ دفاع نے اعلان کیا کہ سپاہیوں کو خاص اعصابی گیس سے تحفظ کے لیے جو ویکسین دی گئی تھی وہ کسی طور پر فائدہ مند ثابت نہیں ہوئی۔

اپنے مقصد کے حصول کے لیے پیٹھا گون نے سپاہیوں کو اس بات سے قطعی بے خبر رکھا کہ وہ میدان جنگ میں خطرناک کیمیائی ہتھیاروں کے کتنے نزدیک ہیں۔ پیٹھا گون ان ہتھیاروں کے تباہ کن اثرات سے اچھی طرح واقف تھا۔ اگر وہ پہلے یہ قبول کر لیتا تو فوجیوں کی صحیح تشخیص کے بعد مناسب علاج ہو سکتا تھا۔ دراصل ان کے نزدیک انسانی جان کی قیمت ہی نہیں ہے۔ اپنے مفاد کے لیے وہ اپنے سپاہیوں کو داؤ پر لگا دیتے ہیں۔ آئیے دیکھیں کہ 1940ء سے 1990ء کے دوران امریکی حکومت کی جانب سے ہمیں کیا کچھ ملا ہے؟ قسم قسم

کے حکومتی پروگرام سپاہیوں کا افریقی سوڈروں کی طرح استعمال ان پر ایسی تجربات کرنا پائلٹوں کو کیا دی بادلوں میں روانہ کرنا حیاتیاتی ہتھیاروں کے تجربات بجلی کی لہروں کے تجربات ذہنوں کو جام کر دینا وغیرہ وغیرہ۔ انسانوں پر تجربات کئے جاتے ہیں اور انہیں اس سے نہ تو آگاہ کیا جاتا ہے اور نہ ہی بعد میں ان کے علاج معالجہ کی زحمت گوارا کی جاتی ہے۔

یہ چھوٹا سا تاریخی پرت الٹنے کا مقصد یہ ہے کہ جو امریکی حکومت اپنے فوجیوں کی فلاح و بہبود کا خیال نہیں رکھتی ان کی جانوں کی اس کے نزدیک کوئی قیمت نہیں وہ غیر ملکوں کی پرواہ کیونکر کرے گی۔

بات کو مزید آگے بڑھاتے ہیں۔ یہ درست ہے امریکہ نے دنیا کو اپنے خوف میں مبتلا کر لیا ہے مگر اب بھی اس کے منہ پر سچ کہنے کا حوصلہ رکھنے والے موجود ہیں۔ 1995ء میں سی آئی اے کے ایک اہلکار نے دلائی لامہ سے سوال کیا کہ تبتوں کی مدد کر کے ہم نے اچھا کیا یا برا؟ تبت کے روحانی پیشوا کا جواب یہ تھا کہ یہ مدد اس لیے کی گئی کہ ہم چین سے مقابلہ کر رہے تھے۔ اس معاملہ میں ریاستہائے متحدہ امریکہ نے جو دخل اندازی کی تو اس کا سبب تبتوں کی مدد نہیں بلکہ چین کو دھمکانا تھا۔ سرد جنگ کے مروجہ طریقہ کار کے مطابق اسے مقابلے کے لیے ابھارنا تھا۔ تبت کی مدد کی آڑ میں امریکہ کے ہاتھ سنہری موش لگا تھا وہ اسے کیسے ضائع کر سکتا تھا۔ مگر اس کے نتیجہ میں جو ہزاروں جانیں ضائع ہوئیں ان کا لہو کس کے ہاتھ پر تلاش کیا جائے۔

چین کو اکسانے کے لیے امریکہ نے یہ کھیل کھیلا ایسا ہی کھیل وہ افغانستان میں 1979ء میں بھی کھیل چکا تھا۔

سابق امریکی صدر جی کارٹر کے قومی سلامتی کے مشیر ”ڈکنس بریڈنسکی“ نے 1998ء میں اس حوالے سے ایک انکشاف کیا کہ ”یہ جو یہ کاری کہانی سنائی جاتی ہے کہ امریکہ نے 1979ء میں سوویت حملے کے بعد افغانستان کی حزب مخالف کو فوجی امداد دی تھی بالکل جھوٹ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ روسیوں کے حملہ آور ہونے سے تقریباً چھ ماہ قبل ہی امریکہ نے مجاہدین کی مدد کرنا شروع کر دی تھی۔ یہ امداد صرف اور صرف روسی فوجی مداخلت کو یقینی بنانے اور انہیں حملہ کیلئے راغب کرنے کیلئے تھی۔“ اس پر بریڈنسکی سے سوال کیا گیا کہ کیا اس عمل پر انہیں افسوس ہے؟ تو ان کا جواب یہ تھا کہ ”کیسا افسوس؟ یہ خفیہ کارروائی ایک شاندار طریقہ

تھا۔ ہم روسیوں کو افغان پھندے میں پھانسنے میں کامیاب رہے۔ جس دن روسیوں نے بارڈر پار کیا میں نے صدر کارٹر کو خط لکھا کہ اب میدان ہمارے ہاتھ میں ہے اور پھر دس سال تک ہاسکو حکومت کی حمایت کے بغیر جنگ جاری رکھنی پڑی۔ جھگڑا بڑھتا گیا بلا آخر ہمیں ہمارا مقصد حاصل ہو گیا اور سوویت شہنشاہیت ٹوٹ پھوٹ کر بکھر گئی۔“

اس جنگ نے کیا کچھ تباہ نہیں کر دیا۔ دنیا کا نقشہ بدل کر رکھ دیا، بھیا تک تشدد بے بہا خوزیزی نے افغان سرزمین کو خون میں نہلا دیا، ایک پوری نسل اس کا شکار بنی آدمی آبادی یا تو مر گئی یا معذور ہو گئی یا پھر مہاجر بن گئی، ان ذیادتیوں کے خلاف نجانے کتنے پراسن شہری انتہا پسند دہشت گردوں کا روپ دھار گئے۔ ظلم، زیادتی، جور جبر مگر کیسی عجیب بات ہے نا کہ اس خونی کھیل میں مرکزی کردار ادا کرنے پر ”بریزنسکی“ کو کوئی افسوس نہیں ہے بلکہ اسے آج بھی اس ”شاندار کردار“ پر فخر ہے۔

میڈلین البرائٹ کا وہ ٹیلی وژن انٹرویو آج بھی بہت سے ذہنوں میں تازہ ہو گا جس میں رپورٹر سٹیل نے عراق کے خلاف کارروائیوں کے حوالے سے سوال کرتے ہوئے پوچھا کہ ایک اندازہ کے مطابق اب تک نصف ملین بچے مر چکے ہیں اور یہ تعداد ہیروشیما میں مرنے والے بچوں سے کہیں زیادہ ہے۔ آپ کا خیال ہے کیا ایسا ہونا چاہیے تھا؟ جواب میں میڈلین البرائٹ نے مخصوص انداز میں ہمنویں اچکاتے ہوئے کہا کہ ”گو کہ یہ ایک سخت راستہ ہے مگر میرا خیال ہے کہ ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔“ اس شقی اقلیمی پر کیا تبصرہ کیا جائے کہ کہیں کوئی ندامت نہیں کوئی افسوس نہیں۔ اگر البرائٹ کے اس رویہ پر انہیں شک کا فائدہ دینے کی کوشش کی جائے تو زیادہ سے زیادہ یہی کہا جاسکتا ہے کہ ان کے پاس انتظامیہ کی پالیسی کی حمایت کے سوا کوئی راستہ نہیں ہو گا۔ مگر یہ آپ بھی جانتے ہیں کہ یہ نہایت ہی لولائٹزرا بہانہ ہے۔ کیونکہ اس عہدہ پر فائز شخص ایسی پالیسیوں کا لازمی اور اہم حصہ ہوتا ہے۔ اور یہ بتاتے ہوئے مجھے قطعی کوئی جھجک نہیں کہ اس کے کچھ ہی عرصہ بعد البرائٹ کو بیکٹری آف سٹیٹ بنادیا گیا۔

ایک اور مثال ورلڈ بینک کے چیف اکاؤنٹنٹ ”لارنس سرز“ کی بھی ہے۔ اس نے تجویز پیش کی کہ ”جاہ کن اثرات کی حامل آلودہ صنعتوں کو ترقی پزیر ممالک میں منتقل کرنے کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے۔ کیونکہ اس طرح ان کی آلودگی سے ہونے والی اموات اور صحت کے مسائل ر اخراجات کم ہوں گے۔ حائرہ کارکنوں پر لاگت بھی زیادہ نہیں اٹھے گی کیونکہ

ایسے ممالک جہاں اجرتیں کم ہیں یقیناً لاگت بھی کم ہی آئے گی۔ اور زہریلے اجزاء والی صنعتوں کو تو سب سے کم اجرتوں والے ممالک ہی بہترین ہیں۔“ اس تجویز پر خاصی لے دے ہوئی سمرز کی خاصی مذمت کی گئی مگر اس ناپسندیدگی اور مذمت کے باوجود 1999ء میں صدر کلنٹن نے لارنس سمرز کو انڈر سیکرٹری خزانہ برائے بین الاقوامی معاملات کے عہدے سے ترقی دے کر سیکرٹری خزانہ بنادیا۔

خود صدر کلنٹن نے کیا کیا؟ یوگوسلاویہ پر بمباری کے ابتدائی 33 دنوں میں گھر، ہسپتال، سکول، عبادت گاہیں، تفریح گاہیں، کارخانے، دیہات سب کچھ بری طرح تباہ و برباد ہو گیا تھا۔ بوڑھے، بچے، مرد، عورتیں مر رہے تھے معذور ہو رہے تھے مگر یہ کھیل سبق سکھانے کے لیے جاری تھا۔ ابتدائی 33 روز بعد جناب بل کلنٹن نے بمباری کی پالیسی کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ ”دیکھنے والوں کے لیے یہ کافی لمبا عرصہ ہو سکتا ہے مگر میں ایسا نہیں سمجھتا کیونکہ یہ ضروری ہے“ اور پھر یہ شخص مزید 45 دن تک خون کی ہولی کھیلتا رہا۔

الگور کو کلنٹن کا بہترین متبادل سمجھا جا رہا تھا۔ ان کی بھی سینے 1998ء میں جنوبی افریقہ کی طرف سے ایڈز کی سستی دوائیوں کا منصوبہ صرف اسی کی وجہ سے ناکامی سے دوچار ہوا۔ اس نے صرف اس لیے اس پر تجارتی پابندیاں لگانے پر شدید زور ڈالا کہ اس سے امریکی کمپنیوں کو نقصان کا سامنا کرنا پڑ سکتا تھا۔ جان کی کیا قیمت؟

1985ء میں رونالڈ ریگن نے روس پر چوٹ کرتے ہوئے کہا تھا کہ ”میں کوئی ماہر لسانیات تو نہیں مگر مجھے بتایا گیا ہے کہ روسی زبان میں لفظ ”آزادی“ نہیں ہے۔“ یہاں ایک سوال پوچھنے کو ہمارا بھی جی چاہتا ہے کہ کیا امریکن انگریزی میں ”گھبراہٹ“ کے لیے کوئی لفظ ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ اقتدار ظالم بناتا ہے ایسا بھی نہیں کہ امریکی پالیسی ظالمانہ ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ امریکی لیڈر ظالم ہیں۔ جو ظالم اور بے حس ہوتے ہیں وہ ہی انتظامیہ میں شامل ہو سکتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اس ملازمت کی شرائط میں نکتہ سب سے زیادہ واضح ہونا چاہیے کہ وہ جو خدا ترسی کے انسانی پیمانوں سے واقف ہوں اور ان پر عمل بھی کرتے ہوں ریاستہائے متحدہ امریکہ کے صدر، نائب صدر، سیکرٹری خارجہ، قومی سلامتی کے مشیر یا سیکرٹری خزانہ بننے کے قطعی طور پر اہل نہیں۔ وہ جو ”لارنس پیئر“ کا نظریہ ہے تاکہ کلیسا کی نظام میں ہر فرد نااہلی کی بنیاد پر آگے بڑھنا چاہتا ہے تو ہمارے ہاں سو فیصد اسی پر عمل ہو رہا ہے۔ انتظامیہ

میں ایسے لوگ شامل ہیں جو آمریت کے حامی اور ظلم و بربریت کی بنیاد پر ترقی کے خواہاں ہیں۔

ان حالات میں مغرب کی اچھائیوں کا راگ الاپنے والے حکمران سیاستدان اور صحافی خود دنیا کو اپنے اوپر ہٹنے کا موقع فراہم کرتے ہیں۔ یوگوسلاویہ پر ہونے والی ہیبت ناک بمباری کے خاتمے کے فوراً بعد جب ممتاز امریکی جریدہ ٹائمز دنیا کو یہ اخلاقی سبق دے گا کہ مغربی نظریات کے حقوق اور ذمہ داریوں کو نبھاؤ۔“ یا پھر 1991ء میں عراق پر امریکی بمباری کے دوران ایک ایسی شہری حفاظت گاہ کو جلا کر رکھ دیا جائے گا جس میں عورتیں اور بچے پناہ گزین تھے اور اس سانحہ پر وائٹ ہاؤس کا ترجمان ”مارن فشر واٹر“ بڑی مصویت سے کہے گا کہ ہمیں نہیں معلوم کہ شہری وہاں کیا کر رہے تھے اور اس کے ساتھ یہ اعلان کیا جائے گا کہ ”انسانی زندگی کی قدر قیمت ہم سے زیادہ صدام میں نہیں ہے۔“ تو خود ہی بتائیے دنیا انکا مذاق نہیں اڑائے گی تو کیا کرے گی۔ ایسا ہی ایک واقعہ مجھے ویتنام کی جنگ کے حوالے سے بھی یاد آ رہا ہے۔ جنگ جاری تھی، خونریزی ہو رہی تھی اور صدر جانسن ایسا ہی یقین دلانے میں مصروف تھے کہ ”انسانی زندگی کی تعظیم ہم سے زیادہ ایشیاء والوں میں نہیں ہے۔“ ”یو ایس نیوز اینڈ ورلڈ رپورٹ“ کے ایڈیٹر ڈیوڈ لارنس نے فروری 1966ء کے شمارے میں لکھا کہ امریکہ ویتنام میں جو کچھ کر رہا ہے۔ وہ انسانی ہمدردی کی ایک ایسی شاندار مثال ہے جو اس سے پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آئی۔ اس پر میں نے مسٹر لارنس کو ”ویتنام میں امریکی زیادتیاں“ کے عنوان کے تحت پمفلٹ کی ایک کاپی بھجوائی۔ اس کے ہمراہ ایک نوٹ بھی منسلک کیا جس میں پہلے لارنس کے تحریر کردہ الفاظ اس کے نام کے ساتھ تحریر کئے۔ اس کے بعد ایک سطر کا اضافہ کیا ”ہم دونوں میں سے ایک دیوانہ ہے“ اور نیچے اپنا نام لکھ دیا۔ اس کے جواب میں لارنس نے مجھے ایک خط بھیجا جس میں اس نے لکھا کہ ”میرے خیال میں پمفلٹ کا بغور مطالعہ اس نکتے کو ثابت کر دے گا جو میں اٹھانا چاہتا ہوں۔ یعنی یہ کہ غیر مہذب اور خونخوار لوگوں کو تہذیب یافتہ زندگی کے حصول کے لیے مدد کی ضرورت ہے۔“ اس بات پر سوائے اس کے کیا تبصرہ کیا جاسکتا ہے کہ امریکی ذہن اس حد تک مفلوج ہو چکے ہیں اس حد تک کنٹرولڈ ہیں کہ انہیں آزاد کرنے کیلئے نہایت ہی پیچیدہ قسم کی جراحی درکار ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ امریکیوں کی اکثریت ایسی ہے جنہیں قائل ہونے کی ضرورت نہیں۔ سیاستدانوں کا تو یہ حال ہے کہ جو

الفاظ ان کے منہ سے ادا ہوتے ہیں قطعی بے مغز اور بے معنی ہوتے ہیں جن میں معلومات کا عنصر صفر ہوتا ہے۔ سچائی کا سامنا کرنے کے لیے یہ قطعی تیار نہیں ہوتے اگر ان کا سامنا تنقید نگاروں یا اس نوجوان طبقہ سے ہو جائے جو ہر قسم کے خطرہ کو گلے لگانے کے لیے تیار ہوتے ہیں تو ان کے پاس سوائے آئیں بانیں شائیں کرنے یا منہ چھپانے کو کوئی چارہ نہیں ہوتا۔ یہاں سب صرف ایک نظریہ کے تحت چل رہے ہیں کہ جو کچھ امریکہ کر رہا ہے صحیح کر رہا ہے۔ ”اوکس بائیک“ نامی ایک کانگریسی رکن جس نے امریکی خارجہ پالیسی کے کئی سیاہ پہلوؤں سے پردہ اٹھایا اپنے ایک انٹرویو میں انکشاف کیا کہ کوئی بھی کانگریسی رکن خفیہ رپورٹیں دیکھ سکتا ہے مگر بہت سے رپورٹ پڑھنے پر راضی نہیں ہوتے کیونکہ ان میں امریکہ کے تمام سیاہ و سفید کھول کر رکھ دیئے جاتے ہیں۔ اور وہ امریکہ کی برائیوں سے لاعلم ہی رہتا چاہتے ہیں۔

یہ ذہن یوں ہی ایسے نہیں بن گئے۔ ایک پورا پراسیس ہے جس سے یہ گزرتے ہیں۔ جس طرح بچے کی پرورش کرتے ہوئے اس کے ذہن میں یہ بات بٹھائی جاتی ہے کہ اس نے سچ بولنا ہے، قتل نہیں کرنا، زنا نہیں کرنا، ڈاکہ نہیں ڈالنا، رشوت نہیں دینی، ٹیکس ایمانداری سے ادا کرنا ہے اسی طرح یہ بات بھی اس کے دماغ میں گھسادی جاتی ہے کہ کوئی بھی ایسا فعل جو اخلاقیات سے کتنا ہی کیوں نہ گرا ہوا ہو اگر امریکی سلامتی کے حق میں ہے تو ثواب کا کام ہے۔ اب اس میں دنیا بھر کے معاملات میں دخل اندازی حکومتوں کا گراٹا، مہماری کرنا، بے گناہوں کے خون سے ہولی کھیلنا سب ہی شامل ہے اسی لیے تو اس کی مذمت نہیں کی جاتی۔

ماضی میں امریکی صحافی اپنے ہم پیشہ روسی صحافیوں پر اس لیے تنقید کرتے تھے کہ وہ وطن پرستی میں مبتلا تھے اور خود وہ کیا کرتے ہیں۔ ”ایوننگ نیوز“ کے کرتا دھرتا ”ڈان راقر“ نے یوگوسلاویہ پر بمباری کے دوران واضح الفاظ میں اعلان کیا کہ میں امریکی رپورٹر ہوں اور ہر قیمت پر امریکہ کی حمایت کروں گا۔

جب آپ یہ فیصلہ کر لیتے ہیں کہ چاہے غلط ہو یا صحیح آپ نے حمایت اپنے ہی ملک کی کرنی ہے تو ایسے میں آپ کی اخلاقی اور پیشہ ورانہ ذمہ داری کا کیا ہوگا؟ مگر افسوس کہ ایسا ہی ہو رہا ہے۔ ہمارے ہاں صحافیوں کی اکثریت یہی کر رہی ہے۔ وہ ہر موقع پر امریکہ کی حمایت اپنا فرض سمجھ کر کر رہے ہیں۔ چاہے وہ قانونی یا اخلاقی حدود میں ہو یا نہ ہو۔ جمہوریت

آزادی اور خود مختاری کی دھجیاں اڑا رہا ہو، ظلم و بربریت کے پہاڑ توڑ رہا ہے۔ یہ اسے شاندار زبردست، بہت اچھے جیسے کمٹس سے نوازتے رہتے ہیں۔ مزید مثالیں پیش کرنا چاہوں گا۔ نیشنل پبلک ریڈیو کا سی ای او ”کیون کلوز“ امریکی پراپیگنڈہ ادارہ جس میں وائس آف امریکہ ریڈیو آزاد یورپ، ریڈیو لبرٹی اور ریڈیو مارٹی (جو کاسٹرو کے خلاف فلوریڈا سے کیوبا میں خبریں جاری کرتا تھا) کا سربراہ تھا۔ اس نے یوگوسلاویہ کی جنگ سے متاثر ہو کر کسٹن حکومت کو ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کی کہ ”خارجہ پالیسی کی ایسی شاندار کامیابی اس سے پہلے دیکھنے میں نہیں آئی۔“ کم و بیش یہی تبصرہ کارپوریشن فار پبلک براڈ کاسٹنگ کے سربراہ ”رابرٹ کونارڈ“ نے بھی فرمایا۔

جھوٹ بولنا بھی امریکی پالیسی کا اہم حصہ ہے۔ جھوٹ کے ذریعہ خوف کی فضا پیدا کر کے اپنے مقاصد حاصل کرنا معمول کی بات بن چکی ہے۔ بعض اوقات میڈیا اور عوام سیاستدانوں کے جھوٹ پکڑ کر مزہ لیتے ہیں۔ جیسے دولت کے متعلق جھوٹ، جنسی جھوٹ، منشیات کے استعمال کے متعلق جھوٹ وغیرہ مگر یہ تو نہایت چھوٹے چھوٹے بہت بے ضرر قسم کے جھوٹ ہوتے ہیں، گناہ صغیرہ۔ بڑے جھوٹ تو وہ ہیں جو دنیا کا نقشہ تبدیل کر دینے کی طاقت رکھتے ہیں۔

ہیر و شیمہ اور ناگاساکی پر جو ایٹم بم گرائے گئے تو اس کے بارے میں دنیا کو یہ جواز فراہم کیا گیا کہ جاپان کو زمینی جارحیت سے باز رکھنے کے لیے اور ہزاروں امریکیوں کی جانیں بچانے کے لیے ایسا نہایت مجبوری کے عالم میں کیا گیا ہے۔ بعد میں سامنے آنے والے حقائق میں ایک اہم حقیقت یہ بھی تھی کہ جاپان کئی ماہ سے ہتھیار ڈالنے کی کوشش میں تھا مگر امریکہ صرف اس لیے اسے نظر انداز کر رہا تھا کہ اسے ایٹمی دھماکہ کا جواز چاہیے تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ایٹمی بمباری جاپانیوں کو ذلیل کرنے کے لیے نہیں کی گئی تھی بلکہ روس کو خوفزدہ کرنے کے لیے کی گئی تھی ایٹم بم بھینکنے کے بعد یہ بات بلا مقصد نہیں کہی گئی تھی کہ یہ جنگ عظیم کا آخری حملہ نہیں بلکہ سرد جنگ کا پہلا حملہ ہے۔

1964ء میں سیکرٹری آف سٹیٹ ”ڈین رسک“ سے برازیل کی حکومت کا تختہ الٹنے کی کارروائی میں امریکی حکومت کی شرکت کے حوالے سوال کیا گیا تو اس نے واضح الفاظ میں اعلان کیا کہ اس میں ذرہ برابر سچ نہیں ہے۔ بعد میں ہر ایک نے دیکھا کہ امریکہ اس فوجی

انقلاب میں کس حد تک سرگرم تھا۔

1980ء میں ریگن انتظامیہ نے اعلان کیا کہ روسی اشیاء پر خون کے زہروالی کیمیائی دوا چھڑک رہے ہیں۔ اسے ”پہلی بارش“ کا نام دیا گیا اور اس کی وجہ سے ہزاروں افراد لقمہ اجل بنے۔ اور اس حوالے سے صدر ریگن نے اپنی دستاویز میں اور تقاریر میں بے شمار بار روس کو بدنام کیا۔ اس ”پہلی بارش“ کے بارے میں بعد میں معلوم ہوا کہ یہ پھولوں کے زیرے کا ذخیرہ تھا جو شہد کی مکھیوں کے ایک بہت بڑے جھنڈ نے بہت بلندی سے گرا دیا تھا۔ یہ تو محض تین مثالیں ہیں جو فوری طور پر منتخب کی گئی ہیں جھوٹ کی ایسی نجانے کتنی مثالوں سے امریکی تاریخ بھری پڑی ہے۔

اس حوالے سے یہی کہا جاسکتا ہے کہ حکومتیں جھوٹ بولتی ہیں۔ جو جتنی بڑی ہوتی ہے اتنا ہی بڑا جھوٹ بولتی ہے۔ شاید اسی لیے دنیا کی سب سے بڑی طاقت سب سے زیادہ اور سب سے سنگین جھوٹ بولتی ہے۔ اس کے جھوٹ کے نظریہ کی بنیاد یہی ہے کہ ”چھپالو“۔ سب کچھ خفیہ رکھو۔ ہر بات کو اپنے مفاد کے مطابق استعمال کرو۔

اچھے کام ریاستہائے متحدہ امریکہ کی خارجہ پالیسی کا حصہ نہیں ہیں۔ دنیا بھر میں ہونے والے وہ تمام کام جو واشنگٹن کی بڑھتی ہوئی بین الاقوامی خواہشات کے مطابق نہ ہوں انہیں کسی بھی طریقہ سے اپنی مرضی کے مطابق موڑ لیا جاتا ہے۔ اس کی تفصیل ”دخل اندازیوں“ والے باب میں ہے۔ امریکی خارجہ پالیسی کے انجن کو چلانے کے لیے جو ایندھن استعمال ہوتا ہے۔ یعنی وہ اہم مقاصد و اصول جن کی بنیاد پر خارجہ پالیسی کی عمارت کھڑی ہے کچھ اس طرح ہیں۔

1۔ گلوبلائزیشن یعنی پوری دنیا امریکہ کی مٹھی میں۔ ہر ملک میں مداخلت کرنے کی کھلی آزادی۔

2۔ اندرون ملک دفاعی ٹھیکیداروں کی مالی استعداد بڑھانا جو کانگریس کے ارکان اور وائٹ ہاؤس کے کینوں کو فیاضانہ نوازنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

3۔ کسی بھی ایسے ملک کی ترقی کو روکنا جس کے بارے میں اندازہ ہو کہ وہ سرمایہ دارانہ نظام کے مقابلے میں کامیابی حاصل کر سکتا ہے۔

4۔ دنیا بھر میں سیاسی، معاشی اور فوجی اجارہ داری کو اس حد تک بڑھانا کہ کوئی بھی علاقائی

طاقت امریکی برتری کے لیے خطرہ نہ بن سکے۔ ایسا عالمی نظام پیدا کیا جائے جو دنیا کی واحد عظیم طاقت کی مرضی اور مفاد کے مطابق ہو۔

لا تعداد دشمن، بے مقصد دھمکیاں

امریکہ اپنا دشمن خود پیدا کرتا ہے اور پھر بڑی محنت اور توجہ سے اس کی پرورش کرتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ دشمن کا وجود ہی اس کی زندگی کا باعث ہے۔ اگر دشمن نہ ہو تو وہ تمام کھیل کیسے کھیلے جاسکتے ہیں جن میں برس برس سے امریکی حکومتیں مصروف ہیں خود سوچیں دشمن نہ ہو تو قومی سلامتی اور دفاع کے نام پر ہڑپ کی جانے والی بجٹ کی رقم کے بارے میں کیا جواب دیں گے ان کی ملازمتوں کو تحفظ کیسے حاصل ہوگا، عوام کی نظر میں وہ محافظ کیونکر ٹھہریں گے، ہر طرف سے انہیں پذیرائی کس طرح حاصل ہوگی، نجات دہندہ، بہادر ترین اور سورما کا جو اپنا بت بنا لیا اسے پاش پاش ہونے سے کیسے بچاسکیں گے۔ ہر امریکی حکومت کو اپنے اقتدار کے لیے کامیابی اور نیک نامی کے لیے ایک مضبوط دشمن کی ضرورت ہے۔ خواہ وہ سوویت یونین ہو، صدام حسین یا اسامہ بن لادن۔

ایسے میں اگر دشمن کی طرف سے امن کی یا صلح کے معاہدوں کی پیشکش ہو تو امریکہ اسے نظر انداز کر دیتا ہے۔ سرد جنگ کے دوران سوویت یونین کی جانب سے مذاکرات کی ایسی پیشکش یہ کہہ کر مسترد کی جاتی رہی کہ یہ نامناسب ہیں یا نتیجہ خیز ثابت نہیں ہو سکتیں۔ ماسکو کی جانب سے کی جانے والی ایسی ہی ایک پیشکش ٹھکرانے پر ”لاس اینجلس ٹائمز“ نے تبصرہ کیا کہ ”اکثر اوقات مہنگے اور ناپسندیدہ پروگرام کو جاری رکھنے اور رائے عامہ اپنے حق میں ہموار رکھنے کی کوشش میں پالیسی سازوں کی مشکلات میں اضافہ ہو جاتا ہے۔“

1991ء میں دنیا کے حالات جس طرح تبدیل ہونا شروع ہوئے انہیں مد نظر رکھتے

ہوئے کولن پاول نے اپنے فوجیوں کو خبردار کرنا ضروری سمجھا کہ یہ تبدیلیاں عارضی ہیں اس کا یہ مطلب نہیں کہ انہوں نے دشمن کو زیر کر لیا ہے تو اس کی طرف سے غافل ہو جائیں۔ وہ کسی بھی وقت دوبارہ سر اٹھا سکتا ہے۔“ ہر لمحہ کسی نہ کسی دشمن کا خوف سر پر مسلط رکھنا امریکی پالیسی کا لازمی حصہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی لیبیا دشمن کے روپ میں سامنے آتا ہے تو کبھی کوریا، کبھی چین اسے آنکھیں دکھاتا ہے تو کبھی عراق، کبھی ایران اس کے مقابلے میں تن کر کھڑا ہو

جاتا ہے تو کبھی سوڈان، کبھی افغانستان کو دشمن قرار دیا جاتا ہے تو کبھی کیوبا کو۔ گویا ہر لمحہ کسی نہ کسی دشمن کا سایہ امریکہ کے سر پر منڈلاتا رہتا ہے۔ عوام کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ ان کی حکومت ان کے تحفظ اور دفاع کے لیے ہر لمحہ برسرِ پیکار ہے، دشمن کی سرکوبی میں مصروف ہے۔ ہر لمحہ لڑائی میں مصروف ہے۔ یہ لڑائی صرف ملکوں کے ساتھ ہی نہیں بلکہ کبھی فشیات کے، کبھی کیمیائی ہتھیاروں کے پھیلاؤ کے، کبھی انسانی حقوق کی پامالی کے، کبھی منظم جرائم کے اور کبھی دہشت گردی کے خلاف مستقل جاری و ساری رہتی ہے۔

ذیل میں ”واشنگٹن پوسٹ“ اور نیویارک ٹائمز میں 1999ء میں سات ہفتوں کے دوران دہشت گردی کے متعلق شائع شدہ مواد کی سرخیوں میں سے چند دی جا رہی ہیں تاکہ ہمارے اس تجزیے کا ذرا بہتر طور پر اندازہ ہو سکے۔ کس طرح عوام کے ذہنوں کو اپنی مرضی کے مطابق منجمد کیا جاتا ہے۔

- | | |
|-----------|---|
| 22 جنوری | 21 ویں صدی میں کیسی دہشت گردی ہوگی؟ (کلنٹن کا تجزیہ) |
| 23 جنوری | صدر کا دہشت گردی کے خلاف اعلان جنگ |
| 23 جنوری | دہشت گردی کے خلاف مزاحمت |
| 29 جنوری | دہشت گرد قوتوں میں اضافہ |
| یکم فروری | پنٹاگون کا دہشت گردی سے نمٹنے کا منصوبہ |
| یکم فروری | جو امریکہ کو دہشت گردی سے محفوظ رکھتا ہے۔ |
| 2 فروری | دہشت گردی کے خاتمے کیلئے مختص رقوم میں اضافہ |
| 16 فروری | یکسپس میں دہشت گردی |
| 17 فروری | کیا امریکہ نے بن لادن کو کند کر دیا؟ |
| 19 فروری | سفارتخانوں پر حملوں کا خوف موڑ دیا گیا۔ دہشت گردوں کا خوف دھندلا گیا۔ |
| 19 فروری | بن لادن کا اگلا نشانہ۔ بنگلہ دیش |
| 23 فروری | حملہ آوروں کی تیاری |
| 7 مارچ | مسلمان مجاہدین کی طرف سے امریکیوں کے قتل کی دھمکی۔ |
| 8 مارچ | ریگن بلڈنگ پر حملہ |

14 مارچ امریکہ سے دو گروپوں کی دہشت گرد تنظیموں کی حیثیت سے عہدوں کی اپیل۔

16 مارچ کلنٹن کا دہشت گردی کے خلاف لڑنے کی تربیت دینے کا منصوبہ
20 جنوری کو سیکرٹری دفاع ”ولیم ایس کوہن“ نے اعلان کیا کہ 6.6 بلین ڈالر کی رقم قومی میزائل دفاعی نظام پر خرچ کی جائیگی۔ اس کی ضرورت اور خرچے کی وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے اپنے ایک اور دشمن شمالی کوریا کو دھمکانا بھی ضروری سمجھا۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک ایسا ملک جو اپنی عوام کو خوراک بھی فراہم نہیں کر سکتا امریکہ پر حملے کا کس طرح متحمل ہو سکتا ہے۔ ایک اوسط سوچ رکھنے والا امریکی بھی سیکرٹری دفاع کے اس دھمکی آمیز اعلان پر ایک بار تو یہ ضرور سوچے گا کہ ان کا قائد یہ امتحانہ کبانی سنا کر بیوقوف بنانے کی کوشش کر رہا ہے۔

1993ء میں صدر کلنٹن نے جنوبی کوریا میں یہ اعلان کیا کہ شمالی کوریا کے لیے ہتھیاروں کی تیاری اس کی موت ہوگی کیونکہ جس روز اس کا استعمال کیا جائے گا وہی دن اس ملک کے خاتمے کا ہوگا۔

1991ء اور اس کے جدید خطروں کی افواہوں کی طرف واپس آئے جس کا پرچار امریکہ مسلسل کر رہا تھا۔ قومی سلامتی کونسل کی طرف سے باقاعدہ طور پر یہ اعلان کیا گیا کہ ”قوم اس وقت تاریخ کے سب سے بڑے خطرے سے گزر رہی ہے۔“ اس کے ساتھ ساتھ امریکیوں کو ممکنہ کیمیائی یا حیاتیاتی حملوں سے بھی خبردار کیا جاتا رہا۔ عجیب ایمرجنسی کی کیفیت پیدا کر دی گئی۔ کہیں پولیس کو خطرات سے نمٹنے کے لیے خصوصی تربیت دی جا رہی ہے تو کہیں شہری دفاع کی تنظیموں کو منظم کیا جا رہا ہے۔ ایک طرف خطرناک ہتھیاروں سے مقابلہ کیلئے چاق و چوبند فوجی دستے تیار کیے جا رہے ہیں تو دوسری طرف ایف ڈی آئی کا اشیائے ضروری سے لیس لمبا چوڑا یونٹ حملے کی جگہ پہنچنے کی تیاری کر رہا ہے۔ ایسا پہلی بار نہیں ہوا۔ اس قسم کی ہنگامی تیاریاں اکثر ہوتی رہتی ہیں صرف یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ امریکہ کتنے شدید خطرات سے دوچار ہے۔ اسی پر تو جنرل اکاؤنٹنگ آفیسر نے تبصرہ کیا تھا ”قومی محافظ یونٹ بے کار کی بھرتی ہے بلاوجہ کا خرچہ۔ جنہیں خود نہیں پتہ کہ ان کا مشن کیا ہے کیونکہ کہیں بھی ان کے مشن کی صحیح تعریف موجود نہیں ہے۔“ اسی قسم کا تبصرہ کرتے ہوئے واشنگٹن پوسٹ نے لکھا کہ ”اس قسم

کی ہنگامی تیاریاں اور حالت جنگ میں ہونے کے اعلانات دراصل ملک کے محافظوں کو مصروفِ ظاہر رکھنے اور دفاع کے نام پر بڑھتے ہوئے بجٹ کا جواز پیش کرنے کے لیے ہیں۔“

اپنے دشمن کو نیست و نابود کرنے کے امریکہ کے پاس بہت سے طریقے ہیں۔ ایک طریقہ تو خطرات کی پیدائش ہی ہے۔ خطرات کا وجود خود ہی پیدا کیا جاتا ہے اور پھر یہ اعلان کر دیا جاتا ہے کہ امریکہ اس کی لپیٹ میں ہے۔ نجانے کتنے ذہن اس قسم کے خطرات تخلیق کرنے میں ہمہ وقت مصروف رہتے ہیں۔ اکتوبر 1999ء میں بھی امریکیوں کو حیاتیاتی ہتھیاروں کے عذاب سے ڈرایا گیا تھا۔ جس کا آغاز ABC کے "Night Line" کے عنوان سے پانچ حصوں پر مشتمل پروگرام سے ہوا۔ اس میں ایک امریکی شہر پر حیاتیاتی ہتھیاروں سے ہونے والا جھوٹا موٹ کا حملہ دکھایا گیا۔ اس میں دہشت گردوں کے ایک گروہ نے شہر بھر میں ایٹھریکس کے جراثیم پھیلا دیئے جس کے نتیجے میں ہر طرف تباہی، دہشت اور موت کے سناٹے کا راج ہو گیا۔ اس کے فوراً بعد ٹیڈ کوپل نے واضح الفاظ میں امریکی عوام کو باور کرایا کہ مستقبل قریب میں کسی بھی وقت امریکہ پر ایسا ہی حملہ ہو سکتا ہے۔ پھر کچھ عرصہ بعد ایف بی آئی نے بھی اعلان کیا کہ ”متوقع دہشت گردوں کا پہلا نشانہ واشنگٹن ہوگا۔“ ایسے میں خوف و ہراس پھیلنا لازمی سی بات ہے۔ بہت بڑی تعداد میں لوگ ایسی دہشتناک گفتگو سے متاثر ہوئے۔ انہیں کہیں بھی کسی نے یہ نہیں بتایا کہ ایٹھریکس کا جراثیمی حملہ دیگر کیمیائی یا حیاتیاتی حملے کتنے خطرناک ثابت ہوں گے یا ان کے کیا اثرات مرتب ہوں گے۔ یا پھر ان سے بچاؤ کے لیے انہیں کیا کرنا چاہیے البتہ انہیں یہ ضرور بتایا جاتا رہا کہ یہ کیمیائی اور حیاتیاتی ہتھیار سوڈان کی ایک دواساز کمپنی تیار کرتی ہے ان کے ذہنوں میں مستقل یہ بات بٹھائی جاتی رہی کہ اس بار ان پر حملہ سوڈان میں تیار ہونے والے جراثیمی ہتھیاروں سے ہوگا۔ اس ملک کے خلاف ان کے دلوں میں نفرت اور اس کی طرف سے خوف بڑھتا گیا اور تب ہی تو امریکہ نے سوڈان پر شدید بمباری کی تو امریکیوں کی طرف سے اس کی قطعی مذمت نہیں کی گئی، کسی نے انسانی اور شہری حقوق کی پامالی کا نعرہ نہیں لگایا۔ کوئی اس بات پر نہیں چلایا کہ بلاوجہ بے گناہوں کی جان کیوں لی گئی۔ امریکہ کا طریقہ ہی یہ ہے کہ پہلے فرضی دشمن بنانا ہے اس دشمن کے فرضی خطرناک عزائم سے دنیا کو اور خاص طور پر اپنی عوام کو ڈرانا ہے۔ پھر جب اسے یقین آ جاتا ہے اب وہ اس دشمن سے اس حد تک خوفزدہ ہیں اس حد تک نفرت کرنے لگے ہیں کہ اگر

امریکہ اخلاقی حدود کی تمام حدیں پھلانگ کر بھی اس دشمن کے خلاف کارروائی کرے گا جب بھی سب اس کا ساتھ دیں گے تو وہ اس پر حملہ آور ہو جاتا ہے۔ دشمن ہمیشہ ایسا چنتا ہے جس کے بارے میں اسے یقین ہوتا ہے کہ یہ مستقبل میں مضبوط ہو کر اس کے مقابلہ میں کھڑا ہو سکتا ہے۔

ایک اور خطرہ جو بہت زیادہ مستعمل ہے ہوائی جہاز میں بم کی افواہ ہے۔ یہ خطرہ انسانی نفسیات کو مد نظر رکھتے ہوئے تخلیق کیا گیا ہے۔ ہوائی سفر سے لوگ دیسے ہی خوفزدہ ہوتے ہیں اور پھر سے یہ بتا دیا جائے کہ اس میں بم ہے یا یہ ہائی جیکنگ کا خطرہ ہے تو وہ ذہنی طور پر بالکل ہی ختم ہو جاتے ہیں۔ 14 اگست 1999ء کو ایف بی آئی نے اٹلانٹا سے ترکی جانے والی پرواز کو اڑان سے چند منٹ قبل روک لیا۔ جہاز کے 241 مسافروں کو عملہ اور سامان سمیت زبردستی اتار لیا گیا۔ ابتدائی پوچھ گچھ کے بعد ایک شخص کو پکڑ لیا۔ تمام مسافروں کے سامان کی مکمل تلاشی لی گئی اس دوران بم سونگھنے والے کتے اور دھماکہ خیز مواد کے ماہرین طیارہ میں داخل ہو گئے۔ انہوں نے چار گھنٹے سے زائد تلاشی جاری رکھی مگر کچھ نہیں ملا۔ ایف بی آئی کی غلط اطلاع کے باعث مسافروں کو شدید ذہنی عذاب سے گزرنا پڑا۔ اس سارے واقعہ کا پس منظر یہ بتایا گیا کہ ایف بی آئی کو خبر ملی تھی کہ اس جہاز پر سوار ہونے والا ایک مسافر قومی سلامتی کے لیے خطرہ بن سکتا ہے اور اس خوف کی وجہ سے صرف یہ تھی کہ اس شخص نے نقد پیسے دے کر ٹکٹ خریدا تھا۔ یہ کوئی ایک واقعہ نہیں ہے امریکی انٹرپورٹس پر اکثر اوقات ایسے تماشے نظر آتے رہتے ہیں۔ ذرا اس کی گہرائی میں جا کر دیکھیں تو سوائے اس کے کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ امریکیوں کو یہ احساس دلایا جائے کہ کوئی نا دیدہ دشمن ان کی جان لینے کے درپے ہے۔ وہ ہر لمحہ موت کے شکنجے میں ہیں، خطرہ کی لپیٹ میں ہیں اور ان کی حکومت ان کی واحد محافظ ہے۔ جس کے نزدیک ان کی جان سے بڑھ کر کسی چیز کی کوئی اہمیت نہیں۔

سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے مطابق 1993ء سے 1998ء کے دوران دنیا بھر میں ہونے والے دہشت گرد حملوں کے اعداد و شمار کچھ اس طرح ہیں۔

مغربی یورپ 766، لاطینی امریکہ 569، مشرق وسطیٰ 374، ایشیاء 158، یورپ

101، افریقہ 184 اور شمالی امریکہ 14۔

اب تو یہ بات بالکل واضح ہو چکی ہے کہ سرد جنگ کے دوران امریکی محکمہ دفاع اور

سی آئی اے سوویت یونین کی دفاعی اور معاشی قوت کو کیونکر اتنا بڑھا چڑھا کر بیان کرتے تھے۔ نیٹو (NATO) کا قیام بھی ایسی ہی ایک خطرناک کہانی کے نتیجے میں عمل میں آیا تھا۔ مغربی یورپ میں ”سرخ جارحیت“ کا خوف اس حد تک پیدا کر دیا گیا کہ نیٹو کے قیام کی حمایت کے سوا دنیا کے پاس کوئی چارہ ہی نہیں رہ گیا۔

سوویت یونین کے حوالے سے امریکہ کی جھوٹ اور دنیا بھر میں خواخواہ کی ہنگامی صورتحال اور خطرات کا خوف پیدا کرنے کی پالیسی کی حقیقت کا اندازہ 1968ء میں شائع ہونے والی ”گارڈین“ لندن کی ایک رپورٹ سے لگایا جاسکتا ہے۔ اخبار لکھتا ہے ”سرد جنگ کے آخر تک سوویت یونین کا مغرب پر حملہ کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا جبکہ سیاستدانوں اور فوجی قائدین کی جانب سے خود ساختہ سوویت خطرہ کا مسلسل واویلا کیا جا رہا تھا۔“

برطانوی چیف آف سٹاف کی ٹاپ سیکرٹ فائل میں واضح طور پر لکھا ہے کہ ”سوویت یونین یورپ میں جان بوجھ کر عام یا محدود کسی قسم کی جنگ شروع نہیں کرے گا۔“ دشمن خطرہ، دہشت، خوف..... یہ ہے حکومت کرنے کا صحیح طریقہ۔ پٹانگون، سی آئی اے ایف بی آئی میں موجود خطرناک اور شاطر ذہن ہر لمحہ یہ راگ الاپ کر کہ ہم جنگ کی حالت میں ہیں نجانے کتنی حکومتوں کا اقتدار بچا چکے ہیں۔

جنرل ڈگلس میک آر تھر نے 1957ء میں پٹانگون کے ایک اجلاس میں اس طرح اپنے خیالات کو زبان دی۔

”جب سے پیدا ہوئے ہیں ہم ایک عجیب سے خوف کی حالت میں ہیں۔ ہماری حکومتیں ہر امریکہ کو پیدائشی طور پر ہی دہشت اور خوف کا تحفہ دے کر حب الوطنی کے بخار میں مبتلا کر دینے کی پالیسی پر عمل پیرا ہیں۔ ہر لمحہ ہمیں اس احساس میں مبتلا رکھا جاتا ہے کہ ہم تاریخ کے نہایت ہی خطرناک دور سے گزر رہے ہیں اور ہمیں ایک نہایت ہی سفاک اور ظالم دشمن کا سامنا ہے۔ اگر ہم آنکھ بند کر کے اپنی سرکار کی بات پر یقین نہیں کریں گے، ان کے مطالبات پورے نہیں کریں گے اور مطلوبہ چندہ دے کر ان کے پیچھے نہیں چل پڑیں گے تو ہماری تباہی یقینی ہے۔ مگر کتنی عجیب بات ہے کہ آج تک ان خطرات کے ہوتے ہوئے نہ تو ایسی کوئی تباہ کاری حقیقت کا روپ دھار کا سامنے آئی ہے نہ کسی ناویدہ دشمن نے سامنے آ کر اپنا وار کیا ہے جس سے ہمیں مستقل ڈرا یا جاتا ہے۔“

لمحاتی سیاسی تصاویر اور سازشیں

امریکہ میں دائیں بازو سے تعلق رکھنے والے آزادی پسندوں سے زیادہ امریکی خارجہ پالیسی کے نقاد ہیں شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ دائیں بازو کی جماعتیں انہما پسند ہیں۔ انہما پسند خواہ دائیں بازو سے تعلق رکھتے ہوں یا بائیں بازو سے حکومت کے ارادوں اور پالیسیوں پر بر ملا تنقید کرتے ہیں البتہ اعتدال پسندوں کے خیالات ذرا مختلف ہیں۔ اعتدال پسندوں کے نزدیک اپنے قائدین کے حوالے سے یہ بیانات جاری کرنا درست نہیں کہ وہ سازشیں تیار کر رہے ہیں، ایک دوسرے کی پناہ میں گم ہو گئے ہیں، اپنے غلط ارادوں اور منصوبوں پر پردہ ڈال رہے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ ان کے نزدیک اسے مثبت انداز میں بھی لیا جاسکتا ہے۔ کیا وہ بہتری کے منصوبوں کے لیے ایک دوسرے سے نہیں مل سکتے مثال کے طور پر امداد باہمی کا نظام فوجی و جاسوسی نظام کی بہتری یا حکومتی نظام کی اصلاح وغیرہ اگر اعتدال پسندوں کے رویے کو کچھ زیادہ ہی مثبت کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اس بات سے کون انکار کرے گا کہ امریکہ نظریہ سازش پر یقین نہیں رکھتا یا سازشوں کا خالق نہیں ہے۔ امریکی خود اس بات کو تسلیم کرتے ہیں ”بین الاقوامی اشتراکی سازش“ اس کی سب سے بڑی مثال ہے کس طرح امریکہ نے اسے تخلیق کیا اور پھر طویل عرصے تک اس کی پرورش کی جاتی رہی یا یہاں تک کہ آج بھی اس کی حیثیت برقرار رکھی ہوئی ہے۔

1993ء میں ڈیوڈین برانچ میں لگنے والی آگ کے واقعہ کو لیجئے جس کے نتیجے میں 76 افراد موقع پر ہی لقمہ اجل بن گئے تھے۔ تمام واقعات اور شواہد سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہ حکومتی اداروں کی سازش ہے۔ ذرائع ابلاغ نے بہت شور مچایا مگر حکومت کی طرف سے ایسی کسی سازش کی مستقل تردید کی جاتی رہی۔ بالآخر چھ سال کے مسلسل انکار کے بعد جب انہیں اندازہ ہو گیا کہ اس معاملہ سے ان کی جان اتنی آسانی سے نہیں چھوٹے گی تو سرکاری طور پر اعتراف کر لیا گیا کہ واقعی ایف بی آئی نے 1993ء میں برانچ کے احاطے میں آتش گیر مادہ پھینکا تھا۔ اندازہ لگائیے کہ حکومت کے ”سازشی کل پرزے“ کس طرح کام کرتے ہیں اور پھر کہا جاتا ہے کہ ان پر سازشی ہونے کا الزام نہ لگایا جائے۔

امریکی سیاست کے پہلے واٹر گیٹ قانون کے مطابق آپ خواہ کتنے ہی سازشی

ذہن کے مالک ہیں، خود کو کتنا ہی شاطر کیوں نہ سمجھتے ہوں یہ حقیقت ہے کہ آپ کی حکومت جو کچھ کر رہی ہے وہ آپ کے تصور سے کہیں زیادہ برا ہے۔

امریکی سیاست کے دوسرے وائٹ گیت قانون کے مطابق کسی بات پر اس وقت تک یقین نہ کرو جب تک کہ سرکاری طور پر اس کی تردید نہ ہو جائے۔
یہ دونوں قوانین آج بھی کتابوں میں موجود ہیں۔

سرد جنگ کا تسلسل

اگرچہ نام نہاد ”اشتراکی خطرہ“ غائب ہو چکا ہے لیکن اب بھی ٹیکسوں کی رقوم سے بھری ہوئی گاڑیاں ”محکمہ دفاع“ کی طرف پابندی سے روانہ کی جاتی ہیں۔ تاکہ ان کا پیٹ بھرا جاسکے۔ اس کا جواز یہ پیش کیا جاتا ہے کہ محکمہ دفاع کی ذمہ داریاں اور فرائض پہلے کے مقابلے میں آج زیادہ بڑھ گئے ہیں اور اس میں مسلسل اضافہ ہی ہو گا۔ ظاہر ہے پوری دنیا میں جو ”خدمات“ انجام دی جا رہی ہیں۔ سینکڑوں امریکی فوجی زدہ کیتروں کی حیثیت سے دنیا کے نقشے پر بکھرے پڑے ہیں۔ کتنے ہی ممالک کے ”تحفظ“ کے لیے وہاں امریکی فوجی اڈے قائم کئے گئے ہیں اس کے ساتھ ساتھ سو سے زائد ممالک میں امریکی ہتھیار بردار دستے خصوصی حملہ آور دستے اور محافظ دستے ترتیب دینے کا کام جاری ہے۔ بہت سے ملکوں کو جہاں فوجی ہتھیار فراہم کئے جا رہے ہیں وہیں ان کی افواج اور محکمہ پولیس کو فن بے رحمی کی تربیت بھی دی جا رہی ہے۔ کم از کم نہیں تو سات یورپی ممالک میں تو ضرور امریکی ایٹم بم موجود ہے ایسی صورتحال میں اگر یہ کہا جائے کہ محکمہ دفاع کے ”فرائض“ پہلے سے زیادہ بڑھ گئے تو اس میں غلط کیا ہے۔

امریکی خارجہ پالیسی ساز بڑی مہارت اور عرق ریزی سے اپنے فرائض ادا کرتے ہیں۔ پوری دنیا پر نظر رکھنا کہ کس ملک میں حکومت ہمارے مفادات کے مطابق کام کر رہی ہے اور کہاں ہمارے احکامات کی روگردانی کی جا رہی ہے کہاں کس کا اقتدار قائم کرنا اور کس ملک کے حکمران کا تختہ الٹنا ہے کس ملک کو فوجی امداد کے ذریعہ اپنا تابع بنانا ہے اور کس کی معاشی امداد کر کے اس کا منہ بند کرنا ہے یہ سب وزارت خارجہ ہی کی ذمہ داری ہے۔ امریکہ کے نزدیک پسندیدہ ترین ملک وہ ہے جو بخوشی امریکہ کی اطاعت قبول کر لے جو آزاد منڈی یا

عالمی نجکاری کا خواب نہ دیکھے، جو اپنے لوگوں کی بھلائی کی خاطر بیرونی سرمایہ کاری کے اثرات سے غیر متعلق نہ رہے، جو امریکہ کو اپنا محافظ تسلیم کر لیں وغیرہ وغیرہ جبکہ امریکہ کے نزدیک وہ ناپسندیدہ ترین ریاستیں ہیں جو امریکی پالیسیوں کو خاطر میں نہیں لاتیں، جو اپنے وسائل کے مطابق اپنے طریقہ سے رہنا چاہتی ہیں، جو امریکہ یا نیٹو کی فوجی تنصیبات کو اپنے ساحلوں کے قریب پھینکنے نہیں دیتیں۔ ایسی ریاستوں کو سبق سکھانا امریکی خارجہ پالیسی کا اہم اصول ہے۔ جیسا کہ یوگوسلاویہ کو سکھایا گیا۔ عراق، البانیہ، بلغاریہ یا پھر کیوبا جس کے ساتھ اب تک ایسا ہو رہا ہے۔

حقائق اور واقعات پر نظر ڈالنے کے بعد یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ بیسویں صدی کیلئے امریکی خارجہ پالیسی کی بنیاد ”سچل پارٹینی“ کے اس نظریہ کی عملی تفسیر نظر آتی ہے کہ ”بعض اوقات بینک ڈاکے کے نقصان کا اندازہ لگانے کے لیے جو اخراجات اٹھتے ہیں وہ لوٹی ہوئی رقم سے کہیں زیادہ ہوتے ہیں لیکن یہ نقصان صرف اس لیے برداشت کیا جاتا ہے کہ اگر ڈاکوؤں کو ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے تو دوسروں کو شے ملے گی اور تمام بینکنگ نظام تباہ ہو جائے گا۔“ بالکل اسی طرح اگر امریکہ چند ممالک کو سبق نہ سکھائے اور دنیا کے سامنے باعث عبرت نہ بنا دے تو کوئی بھی اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کی کوشش کرے گا اور پھر اس کی اجارہ داری اور دنیا بھر پر قائم حکومت کا کیا ہوگا؟

ایک خیال یہ ہے کہ سرد جنگ ختم ہو چکی ہے۔ اگر تو سرد جنگ کی تعریف امریکہ اور سوویت یونین کے درمیان تنازعہ (خواہ کوئی بھی مقاصد ہوں) ہے تو پھر یہ یقیناً ختم ہو گئی ہے مگر دنیا بھر میں اپنی برتری قائم رکھنے کے لیے جو کچھ امریکہ کر رہا ہے کیا وہ سرد جنگ کا تسلسل نہیں ہے؟ سوویت یونین کے خاتمے کے بعد سے امریکی مداخلتیں زیادہ تکلیف دہ بلکہ ناقابل برداشت ہو چکی ہیں۔ جب تک دنیا دو بلاکوں میں تقسیم تھی یہی عراق اور یوگوسلاویہ جو امریکہ کے قریب ترین اور پسندیدہ ترین بلکہ منہ چڑھے تھے دنیا کا ٹھیکیدار بننے ہی امریکہ نے ان کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ جب طاقت کا توازن نہ رہے تو ایسا ہی ہوتا ہے۔

تسلل کی اس پالیسی کو اگر امریکی فرمانروائیکہا جائے تو قطعی بے جا نہ ہو گا مگر امریکی اسے ماننے کو تیار نہیں۔ ان کی تاریخی کتابوں میں شہنشاہیت کب کی ختم ہو چکی ہے۔ مگر کیا شہنشاہیت کی کوئی اور تعریف ہے کیا امریکہ جو کچھ کر رہا ہے وہ شہنشاہیت کی عملی شکل

نہیں۔ دنیا بھر پر سیاسی معاشی اور فوجی برتری۔ اپنی طاقت اور شان و شوکت کا واضح اظہار اگر یہ شہنشاہیت نہیں تو پھر شہنشاہیت کیا ہے؟

زمین کافی نہیں ہے

زمین پر حکومت کی تو کیا کی؟ بات تو یہ ہے کہ خلاء پر بھی آپ کی حکمرانی ہو۔ یہی امریکہ کا نظریہ ہے۔ خلا کی تسخیر کے بعد زمین پر واحد عظیم طاقت بننے کے بعد اب امریکہ خلاء پر مکمل اور غیر متزلزل حکمرانی کی نہ صرف منصوبہ بندی بلکہ عملی کوششیں کر رہا ہے۔ خلاء پر مکمل اجارہ داری کے بعد ہر چیز امریکہ کے اختیار میں ہوگی اس کی مرضی کہ وہ کسی کو خلاء کو استعمال کرنے کی اجازت دے یا نہ دے۔ اس کے بہت سے منصوبوں میں سب سے اہم خلائی جنگ کے ذریعہ اپنی برتری قائم کرنا ہے۔ اس سے زمین پر بھی اس کے مفادات اور سرمایہ کاری کا تحفظ ہوگا کیا کوئی ایک صدی قبل تک اس بات کا تصور کر سکتا تھا کہ خلا بھی زمین کی سی حیثیت اختیار کر جائے گی۔ کہاں تو اس کی تسخیر ہی ایک خواب تھا کہاں آج وہ ایک ایسا علاقہ ہے کہ جس کے ساتھ تجارتی، شہری، بین الاقوامی اور فوجی مفادات وابستہ ہیں اور جہاں سرمایہ کاری میں اضافہ ہو رہا ہے۔ 21 ویں صدی کے شروع میں ہی خلائی طاقت جنگ کا اہم حصہ ہوگی۔ امریکہ نے بلیسک میزائل کے دفاعی نظام کے ذریعہ خلائی حملوں کا توڑ کر لیا ہے۔ جو ڈبلیو ایم ڈی (تباہ کن ہتھیار) کے خلاف رکاوٹ بن جاتا ہے۔ امریکی حکمت عملی سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ دن دور نہیں جب خلاء پر بھی اس کا مکمل اختیار ہوگا۔ اور پھر خلاء سے خلاء میں ہی جنگ ہوا کرے گی۔ ایک طرف خلائی جنگ کی منصوبہ بندی ہے۔ تو دوسری جانب امریکہ خلاء کو ہتھیاروں سے پاک رکھنے کی مہم کا سب سے بڑا حامی نظر آتا ہے۔

1963ء میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے اجلاس میں مکمل اتفاق رائے سے ایک قرارداد منظور کی گئی جس کے مطابق دنیا کی کوئی حکومت خلاء میں اور زمین کے گرد ایٹمی اسلحہ یا کسی بھی قسم کے تباہ کن ہتھیاروں کی تنصیب نہیں کر سکتی۔

26 جنوری 1999ء کو اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل کوئی عنان نے جینوا میں منعقد ہونے والی تخفیف اسلحہ کی کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ”یہ تصور وقت کے ساتھ

ساتھ راج ہو رہا ہے اور کوئی اسے تسلیم کرنے سے انکار نہیں کرتا کہ خلاء کو ہتھیاروں سے پاک رکھا جائے گا۔“

دیوانے کا فلسفہ

”سرد جنگ کے بعد کی لازمی رکاوٹ“ کے عنوان سے پولیس سٹریٹجک کمانڈ کی طرف سے تیاری کی جانے والی 1995ء کی انٹرنل سٹڈی رپورٹ مارچ 1998ء میں منظر عام پر آئی۔ اس کے اہم اقتباس پر ذرا غور فرمائیے۔

”اس بات کی اہمیت کا اندازہ اس طرح کریں کہ جب ہم امریکی مخالف کے خلاف کسی اقدام کے باوجود اس کے بڑھتے قدم روکنے میں ناکام ہو جائیں تو یہ ہم جیسے ٹھنڈے دماغ اور مذہبی عقلی رجحان رکھنے والوں کیلئے نہایت تکلیف دہ ہے اور ہماری شخصیت مجروح ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کہ کچھ عناصر بے لگام ثابت ہو سکتے ہیں اور انکے ذہنوں میں شکوک پیدا کر کے اپنے مفادات حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ خوف کا یہ احساس ہی رکاوٹ کے سلسلے میں طاقت کا ذریعہ بن سکتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ امریکہ کے مفادات کا معاملہ آجائے تو یہ غیر منطقی اور تنگ نظر ثابت ہو سکتا ہے۔“

یہ الفاظ تحریر کرنے والے کو یقین ہو گا کہ امریکہ غیر منطقی، تنگ نظریہ قابو سے باہر ہونے کو محض ظاہر کر رہا ہے حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ یہ بحث طلب بات ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ امریکہ دنیا پر کیا کچھ تھوپ رہا ہے جس کی اس کتاب میں بھی بہت کھل کر وضاحت کی گئی ہے۔ نصف صدی سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے امریکی خارجہ پالیسی مستقل طور پر دیوانگی کا شکار ہے۔ مائیکل پیئرینی کا اس حوالے سے کہنا ہے کہ ”امریکی خارجہ پالیسی کو احقانہ کہا جاسکتا ہے کیونکہ اس کی موافقت میں دیئے جانے والے دلائل اتنے غیر منطقی اور غیر متاثر کن ہوتے ہیں کہ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے خارجہ پالیسی بنانے والے یا تو ڈھنی الجھنوں کا شکار ہیں یا پھر بالکل ہی نا تجربہ کار ہیں لیکن ایسا صرف اس وجہ سے ہے کہ لوگ یہ سمجھنے میں ناکام ہیں کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ اس سے یہ مطلب لیا جائے کہ قومی سلامتی کے رہنما خود بھی بدحواس ہیں تو یہ غلط ہے۔ بے شک وہ بے پناہ جھوٹ گھڑتے ہیں مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ بیوقوف ہیں۔

سپائی کمیشن

اس بات کو کچھ ہی عرصہ ہوا ہے کہ جنوبی افریقہ، گوئٹے مالا اور ایل سالوڈیر کی عوام نے سپائی کا ایک سرکاری کمیشن قائم کیا ہے جو ان کی حکومتوں سے سرزد ہونے والے جرائم کی تحقیق کر کے جج کا پتہ لگائے گا۔ سوال یہ ہے کہ کیا ایسا کوئی سپائی کمیشن امریکہ میں بھی قائم کیا جاسکتا ہے جو امریکہ سے سرزد ہونے والے جرائم کی تحقیقات کرے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ نجی تنظیموں کی جانب سے ایسے کئی غیر سرکاری کمیشن منظر ہام پر آئے جنہوں نے دیت نامہ، پانامہ اور عراق میں کی جانے والی امریکی زیادتیوں اور جرائم کے حوالے سے تحقیقات کیں مگر افسوس کہ انکی معلومات کو امریکہ نے منظم ذرائع ابلاغ کی جانب سے مکمل طور پر نظر انداز کر دیا گیا۔

امریکی میں سرکاری سپائی کمیشن کی غیر موجودگی میں یہ کتاب بطور شہادت پیش کی جا

رہی ہے۔

وائٹنسن ڈی سی

جنوری 2000ء

امریکہ پر دہشت گردوں کی ”نظر کرم“

یوں محسوس ہوتا ہے کہ دہشت گردوں کے خلاف جنگ میں امریکہ کے مقدر میں ناکامی لکھ دی گئی ہے۔ 17 اگست 1998ء کو افریقہ میں قائم دو امریکی سفارتخانوں پر بمباری کے افسوسناک واقعہ کے بعد مشیر برائے قومی سلامتی ”سینڈی برگر“ نے اعلان کیا کہ ”امریکیوں کو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ جس دنیا میں ہم رہتے ہیں وہاں امریکی قیادت کی اعلیٰ خوبیوں کی وجہ سے کچھ عناصر اس کی مخالفت پر کمر بستہ ہیں جو جب بھی موقع ملتا ہے ہمیں دہشت گردی کا نشانہ بنانے سے نہیں چوکتے۔“ اس سوال کے جواب میں کہ دہشت گرد امریکہ سے کیا چاہتے ہیں؟ بروکنگز انسٹیٹیوٹ کے شعبہ خارجہ پالیسی کے سربراہ ”رچرڈ ہائس“ نے کہا کہ ”بات یہ نہیں ہے کہ ہم کچھ کر رہے ہیں جس کی وجہ سے وہ ہمارے ساتھ ایسا کر رہے ہیں۔ بات صرف یہ ہے کہ ہم عالمی طاقت ہیں دنیا کا طاقتور ترین ملک، ایک سیکولر ملک جس نے خود کو عظیم ثابت کر دیا ہے اور انہیں یہ ہی بات پریشان کرتی ہے۔“

اسی قسم کی بات ”نیویارک ٹائمز“ کے تھامس فریڈمین نے لکھی۔ وہ کہتا ہے کہ ”دہشت گردوں کے کوئی خاص نظریات یا مطالبات نہیں ہیں بلکہ وہ امریکہ، اسرائیل اور دیگر فرضی اسلام دشمنوں کے خلاف خواہ مخواہ کی نفرت میں مبتلا ہیں۔“

آخر میں صدر کلنٹن کے کلمات بھی سن لیجئے۔ وہ فرماتے ہیں کہ چونکہ ہم دہشت گردی کے خلاف متحد ہو کر دنیا بھر میں امن اور جمہوریت کے فروغ کے لیے کام کر رہے ہیں اس لیے دہشت گردوں کا نشانہ بنے ہوئے ہیں۔

یہ اقتباسات ان تقاریر، اعلانات اور عوامی خطابات سے لیے گئے ہیں جو امریکہ پر دہشت گرد حملوں کے بعد ہمارے قائدین ہمارے ذہنوں میں بٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔

ہمیں یہ سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ امریکہ پر ہونے والے دہشت گرد حملے امریکہ کی زیادتیوں اور خامیوں کی وجہ سے نہیں ہیں بلکہ اس کی خوبیوں اور خاص طور پر اس خوبی کی وجہ سے ہیں کہ اس نے خود کو دنیا کا طاقت ور ترین ملک ثابت کر دیا ہے۔ چونکہ مخالفین سے اس کا باختیار اور کامیاب ہونا مضمم نہیں ہوتا اس لیے وہ اسے دہشت گردی کا نشانہ بناتے ہیں۔ مگر افسوس کہ ہمارے قائدین کبھی بھی یہ نہیں سوچتے کہ دہشت گرد بھی انسان ہیں یقیناً ان کے ذہنوں میں اپنے اس انتہائی اقدام کی کوئی نہ کوئی معقول دلیل اور منطقی وجہ ہوگی۔ بہت سے لوگ دنیا بھر میں ہونے والی سماجی، سیاسی اور مذہبی منافقت، ناہمواریوں اور نا انصافیوں سے اس بری طرح متاثر ہوتے ہیں کہ بالآخر دہشت گردوں کا روپ دھارنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ ہمارے قائدین کبھی یہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہوتے امریکہ کے خلاف ہونے والی دہشت گرد کارروائیاں دنیا بھر میں ہونے والی امریکی زیادتیوں کا رد عمل بھی ہو سکتی ہیں۔ ان زیادتیوں کی ہلکی سی جھلک ملاحظہ کیجئے۔

1981ء میں لیبیا کے دو ہوائی جہاز مار گرائے 1983ء اور 1985ء میں بیروت پر بمباری 1986ء میں لیبیا پر بمباری 1987ء میں ایران کے جہاز کو بمباری کر کے ڈبو دیا گیا 1988ء میں ایرانی مسافر بردار ہوائی جہاز کو مار گرایا 1989ء میں لیبیا کے مزید دو ہوائی جہاز مار گرائے 1991ء میں عراقیوں پر شدید بمباری عراق کے خلاف پابندیاں عائد کر دی گئیں 1998ء میں سوڈان اور افغانستان پر وحشیانہ بمباری اسرائیل کی تشدد کی پالیسی کے باوجود اس کی واضح حمایت اور عربوں کی اپنے دفاع کی کوششوں پر شدید مذمت اسرائیل کی دہشت گردی کو حق بجانب ثابت کرنے کے لیے دوہرے معیار کا اطلاق جو 1996ء میں اس نے اقوام متحدہ کے کمپ قائم میں 106 لبنانیوں کے قتل عام کی صورت میں کی تھی لیبیا کے خلاف مسلسل کارروائیاں جو پچھلی دو دہائیوں سے جاری ہیں مسلم ممالک سے مطلوبہ آدمیوں کا اغواء جن میں ملائیشیا، پاکستان، لبنان اور البانیہ وغیرہ شامل ہیں اسلام کی مقدس ترین سرزمین سعودی عرب اور پرشین خلیجی علاقے میں بڑی تعداد میں زبردستی اپنے فوجی اڈے قائم کرنا وغیرہ وغیرہ۔ یہ تو محض چند امریکی اقدامات ہیں۔ اپنے ایمان سے بتائیے کیا یہ کسی بھی مسلمان کا خون کھولنے کے لیے کافی نہیں ہیں۔ پہلے ان زیادتیوں پر نا انصافیوں پر اس کا خون کھولتا ہے اسے جوش آتا ہے مگر جب وہ کچھ نہیں کر پاتا تو دہشت گرد بن جاتا ہے۔ مگر وہ امریکہ کو

”شیطان اعظم“ کہتا ہے تو کیا وہ غلطی پر ہے؟ ایک پاکستانی ”ایمل کاسی“ جس نے 1993ء میں سی آئی اے کے ہیڈ کوارٹر کے سامنے 5 افراد کو گولیاں مار کر ہلاک کر دیا تھا اپنی گرفتاری کے بعد ایف بی آئی کو بتایا کہ اس نے امریکہ کی مشرق وسطیٰ سے متعلق پالیسیوں اور عراق پر بمباری کے خلاف احتجاجاً یہ انتہائی قدم اٹھایا تھا۔ 1997ء میں کانسی کی سزا کے دو روز بعد پاکستان کے شہر کراچی میں کار میں سوار چار امریکیوں کو گولیاں مار دی گئیں۔ ظاہر ہے کسی ایک کو پکڑ لینے سے سلسلہ رک تو نہیں سکتا، نجانے کتنے ہیں جو امریکہ سے شدید ترین نفرت میں مبتلا ہیں، وجہ پر دھیان دینے اور اسے تسلیم کر کے ختم کرنے کی بجائے خود کو حق بجانب اور مظلوم ثابت کرنے کے لیے لوگوں کو پکڑنے کی پالیسی کی وجہ سے ہی آج امریکہ شدید قسم کی دہشت گردی کی لپٹ میں ہے۔ کراچی میں ہونے ان چار افراد کے قتل کے حوالے سے تبصرہ کرتے ہوئے سی آئی اے کے دہشت گردی کے توڑ کے سابق ماہر نے کہا کہ ”اس کا تعلق بھی ایمل کاسی سے ہے۔“ اس قسم کے تجزیہ پر کیا تبصرہ کیا جائے کہ وہ یہ سمجھنے کو تیار ہی نہیں کہ یہ دہشت گردی کسی انسان کا ذاتی فعل نہیں دنیا بھر میں ہونے والے ظلم اور زیادتی کے خلاف شدید احتجاج ہے۔

1988ء میں امریکہ نے ایرانی مسافر بردار طیارہ مار گرایا تھا جس پر ایران نے رد عمل کے طور پر بین ایم 103 پر بمباری کی۔

1998ء میں افریقہ میں دو امریکی سفارتخانوں پر عراق پر بمباری کی آٹھویں سالگرہ کے موقع پر عین اس روز حملے ہوئے جس تاریخ کو پہلا امریکی فوجی دستہ سعودی عرب پہنچا تھا۔

1991ء میں عراق پر امریکی بمباری کے دوران پورے مشرق وسطیٰ اور دیگر کئی ممالک میں واقع امریکی اداروں پر حملے ہوئے۔

اگر انہیں دہشت گرد حملے کہا جائے تو یقیناً زیادتی ہوگی۔ یہ تو ظلم کے خلاف رد عمل ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا امریکی اہلکاروں اور ذرائع ابلاغ کو ان حملوں کی وجوہات کے حوالے سے کوئی اشارے نہیں ملے ہوں گے یقیناً ملے ہوں گے مگر اس حوالے سے بہرے اور گوشتے بننے کی پالیسی سب سے بہتر ہے۔

اچھے اور برے دہشت گرد

اسرائیل میں خود کش حملوں کے دوران درجنوں لوگوں کے مارے جانے پر 13 مارچ 1996ء کو امریکہ نے مصر میں ایک ہنگامی خوف شکن کانفرنس کا انعقاد کیا جس میں پوری دنیا سے 27 رہنماؤں نے شرکت کی۔ اس وقت جب ادھر صدر کلنٹن اس بات پر زور دے رہے تھے کہ ہمیں خوف و ہراس پھیلانے والوں کی کھل کر مذمت کرنی چاہیے اور یہ کہ مستقبل میں مشرق وسطیٰ میں تشدد کے لیے کوئی جگہ نہیں۔“ عین اسی وقت ادھر عراق میں صرف صدر صدام کو غیر مستحکم کرنے کے لیے امریکہ عراقی پیشکش گاڑی لاکھوں ڈالرز سے مدد کر رہا تھا جو بغداد اور دیگر عراقی شہروں میں بم دھماکوں میں مصروف تھے۔ ایک اندازہ کے مطابق نہایت کم عرصے کے دوران سو سے زائد شہری صرف بغداد میں اس بمباری سے ہلاک ہو گئے تھے۔

مصری کانفرنس میں شرکت کرنے والے ممالک صرف دو ہفتے بعد دہشت گردی کے خاتمے کے سلسلے میں واشنگٹن میں اکٹھے ہوئے جہاں نہ صرف دہشت گردی کے خاتمے کو موضوع بحث بنایا گیا بلکہ دنیا بھر میں دہشت گرد گروپوں کو پہنچنے والی مالی امداد پر بھی خوب بحث ہوئی۔ اس سے اگلے مہینے ہی صدر کلنٹن نے خوب دھوم دھڑکے کے ساتھ دہشت گردی کے خلاف اس ایکٹ پر دستخط کیے جس میں امریکی کارپوریشنوں اور دہشت گردوں کی حمایت کرنے والے ملزم ممالک کے درمیان لین دین کی ممانعت کی گئی تھی۔ اس کے چار ماہ بعد کلنٹن انتظامیہ نے نہایت خاموشی کے ساتھ جوڈاں پر سے پابندی اٹھائی تاکہ امریکی تیل کمپنی تیل کے متعلق معاملات طے کر سکے۔ اسی عرصے کے دوران شام پر سے بھی اس لیے پابندی اٹھائی گئی تاکہ مشرق وسطیٰ میں ان کبیات چیت میں دمشق کی شرکت کی حوصلہ افزائی ہو۔ دہشت گردی سے نمٹنے کے لیے فروری 2000ء میں ایک بین الاقوامی کانفرنس کے انعقاد کی تجویز کو امریکہ نے یہ کہتے ہوئے سرد خانے میں جھونک دیا کہ اس سے کوئی عملی فائدہ نہیں ہو گا۔ اس تجویز کردہ کانفرنس کو تیسری دنیا کی اقوام کی ”غیر جانبدار تحریک“ کے 119 ارکان کی حمایت حاصل تھی۔

اس کانفرنس میں بعض ایسے نکات اٹھائے جانے کا فیصلہ کیا گیا تھا جن سے کوئی نہ

کوئی نتیجہ سامنے آنے کی امید تھی۔ ”حزب اللہ“ اور ”حماس“ کی مثالیں سامنے رکھتے ہوئے جو اسرائیل میں لڑ رہے تھے ”دہشت گرد“ اور ”آزادی کیلئے لڑنے والوں“ کے درمیان تفریق کی جانی تھی۔ 1999ء میں یوگوسلاویہ پر نیٹو کی بمباری کو سامنے رکھتے ہوئے ”سیاسی دہشت گردی“ کے حوالے سے یہ سوال بھی زیر غور آتا تھا کہ کیا کسی ریاست کی مسلح افواج کے حملے دہشت گردی کے زمرے میں آتے ہیں جس میں بڑے پیمانے پر شہریوں کی ہلاکت بھی ہوئی ہو؟

ایف بی آئی کی دہشت گردی کی تعریف

ایف بی آئی کے نزدیک بین الاقوامی دہشت گردی کی تعریف یہ ہے کہ ”طاقت کا غیر قانونی استعمال۔“ افراد کے خلاف یا پر اپنی کوتاہ کرنے یا حکومت شہری آبادی یا اس کے کسی حصے پر دباؤ ڈالنے یا سیاسی و سماجی مقاصد کے حصول کیلئے کسی ایسے گروپ یا فرد کی طرف سے تشدد کا ارتکاب جس کا تعلق کسی ملکی طاقت سے ہو یا جس کی سرگرمیاں قومی حدود سے تجاوز کر جائیں۔“

ایف بی آئی کی اس تعریف کا مقصد اگرچہ ریاستہائے متحدہ امریکہ کے خلاف الزامات کی وضاحت کرنا تھا لیکن یوں محسوس ہوتا ہے کہ امریکی حکومت کے لاقصد اقدامات کو اس ایکٹ کے ذریعہ تحفظ دیا گیا ہے۔ ایسے بہت سے اقدامات آپ کو اس کتاب میں بمباری، مداخلت، تشدد، کیمیادی و حیاتیاتی جنگ و جدل کی سرخیوں کے ساتھ نظر آئیں گے۔

”افغان دہشت گرد حوا..... دنیا کیلئے امریکی تحفہ“

اسامہ بن لادن۔ جسے افریقہ میں امریکی سفارتخانوں پر بمباری کا اصل ذمہ دار قرار دیا جاتا ہے ہمیشہ سے امریکہ کے لیے قابل نفرت افراد کی فہرست میں شامل نہیں تھا۔ اس نے اور بہت سے اسلامی بنیاد پرستوں نے سوویت یونین کے خلاف جنگ میں امریکہ کے لیے دائیں بازو کی حیثیت سے کام کیا۔ اس وقت اسامہ بن لادن امریکہ کا پسندیدہ سپاہی تھا کہ وہ امریکی مفادات کے لیے کام کر رہا تھا۔ اس وقت یہ بنیاد پرست مجاہدین تعریف کے قابل تھے۔ اچھے دہشت گرد تھے کہ امریکہ کیلئے دہشت گردی میں مصروف تھے۔ مگر پھر جہاد کی کامیابی کے بعد یہ طاقتیں اپنے راستے سے بھٹک گئیں۔ ان کے خیالات بدلنے لگے۔ ان کے اقدامات خوفناک ہونے لگے یہ امریکہ کے ہی خلاف ہونے لگے۔ ایک سے ہو گئے۔ امریکہ کے یہ اچھے دہشت گرد ڈبرے دہشت گردوں کی شکل اختیار کر گئے۔

افغانستان سے سوویت فوجوں کے انخلاء کا سہرا مجاہدین کے سر ہے اور ان مجاہدین کا یہ ایمان ہے کہ انہیں یہ کامیابی اللہ کی مدد سے ملی ہے جو سب سے بڑا ہے اس نے ہی انہیں ناقابلِ تسخیر بنا دیا۔ امریکہ کے اس دعوے کو وہ قطعی اہمیت نہیں دیتے کہ اس فتح کا کریڈٹ دراصل امریکہ کو جاتا ہے جس نے نہ صرف ان کی مدد کے لیے اپنی فوج فراہم کی بلکہ سیاسی اور مالی لحاظ سے ان کی بھرپور مدد اور پشت پناہی کی جو کسی بھی جنگ میں فتح کے لیے لازمی ہے۔

انہوں نے امریکہ کو دودھ میں سے مکھی کی طرح نکال پھینکا اور سوویت یونین سے بارہ سال تک جنگ لڑنے کے بعد اقتدار کی خاطر ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہو گئے۔ ان کی مدد کے لیے مختلف مسلم ممالک سے نوجوان اکٹھے ہونا شروع ہو گئے۔ ایک اور سخت جنگ شروع ہو گئی اور اب یہ لڑائی کافروں کے خلاف بھی تھی۔ پہلے ان میں جذبہ جہاد کو جلا دی گئی اور پھر انکی تربیت کا آغاز ہوا جس کے نتیجے میں مجاہدین یا دہشت گردوں کی ایسی کھیپ تیار ہوئی جو شہادت کا جام نوش کرنے کے لیے ہر لمحہ تیار تھی۔ بنیاد پرستوں، غیر ملکی تشدد اور مسلح حملوں کی اس لہر کے دوران ایک نیا کلچر پیدا ہوا جسے ”کلاشکوف کلچر“ کہا جاتا ہے۔ اس پر 1996ء میں پاکستانی وزیراعظم بے نظیر بھٹو نے شکایت کی کہ ”افغانستان سے سوویت فوجوں کے انخلاء کے سلسلے میں امریکی امداد کے نتیجے میں میرا ملک جنونی حملوں کا شکار بن رہا ہے۔ افغانستان کی جنگ کے اثرات سے نمٹنے کے لیے ہمیں اکیلا چھوڑ دیا گیا ہے۔ ہمیں جو شدید ترین خطرات درپیش ہیں ان میں سب سے زیادہ فحش فروشی اور وہ مذہبی جنونی شامل ہیں جو افغان جنگ میں قائدین کا کردار ادا کرتے رہے ہیں۔“ اس پر البیریا میں لاس انجلس ٹائمز کے نمائندہ ماہر عمرانیات نے جواباً شکایت کی کہ ”آپ کی حکومت نے ان بد معاشوں کو پروان چڑھانے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ اب اگر یہ آپ کے اور پوری دنیا کے خلاف ہو گئے ہیں تو کیسی شکایت؟ کیا یہ غلط ہے کہ سولہ ہزار عربوں کو افغانستان میں تربیت دے کر قاتل مشینیں بنایا گیا تھا۔“ ہو سکتا ہے کہ اس کے اعداد و شمار بالکل درست نہ ہوں مگر یہ حقیقت ہے کہ ایک اندازہ کے مطابق افغان جنگ میں پندرہ ہزار تجربہ کار سپاہی شامل تھے اور یہ سب افغانی نہیں تھے ان میں عرب بھی تھے۔ مگر دنیا بھر میں انہیں افغانی ہی سمجھا جاتا ہے خواہ ان کا تعلق افغانستان سے ہو یا سعودی عرب سے۔

ڈل ایٹ سنڈیز کے پروفیسر اقبال احمد کے مطابق ”مغرب میں پراپیگنڈہ کیا جاتا ہے کہ تشدد اور مقدس جنگ اسلام کی میراث ہیں جبکہ حقیقت یہ ہے کہ بین الاقوامی جہاد موجودہ دور کا تصور ہے جو کہ 20 ویں صدی کے دوران دریافت ہوا ہے۔ افغانستان میں سوویت جارحیت کے بعد یہ تصور سامنے آیا اس سے قبل جہاد کو قومی، سیاسی اور سیکولر دائرے میں استعمال کیا جاتا تھا۔“

ذیل میں پیش کی جانے والی افغانوں کے خون خرابے کے حوالے سے کچھ نمایاں - اور قابل غور معلومات پر بھی ایک نظر ڈال لیجئے۔

میراہیل کانسی، جس نے سی آئی اے کے دو ملازم مارے، ایک انجینی کے دو ملازم زخمی کئے اور سی آئی اے ہیڈ کوارٹر کے باہری آئی اے کے لیے کام کرنے والے ایک ملازم کو 1993ء میں زخمی کیا، افغان بارڈر سے ملنے والے ایک پاکستانی صوبے میں پل کر جوان ہوا۔ اس صوبہ کو مجاہدین کا خاص اڈہ سمجھا جاتا ہے۔ اہیل کانسی کے باپ اور دیگر رشتہ داروں کے سی آئی اے کے ساتھ خصوصی روابط تھے۔ وہ پاکستان میں سی آئی اے کے انٹیلی جنس آپریشن کے لیے کام کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اہیل کانسی کو جاننے والے سی آئی اے کے جہادی بچوں میں سے ایک کہہ کر پکارتے تھے۔

1993ء میں ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر ہونے والی بمباری کے نتیجے میں چھ افراد مارے گئے ایک ہزار سے زائد زخمی ہوئے اور نقصان کا اندازہ نصف بلین ڈالر لگایا گیا۔ اس بمباری کے ذمہ داروں میں افغان جنگ کے جگنو سپاہی شامل تھے۔

اکتوبر 1995ء میں نیویارک میں اقوام متحدہ کی عمارت، ایف بی آئی آفس اور لنکن اور ہالینڈ سڑکوں پر بمباری کے منصوبہ میں شریک جن دس افراد کو سزا ہوئی ان کا قائد شیخ عمر عبدالرحمن نامی ایک شخص تھا جو افغان جنگ میں مجاہد کی حیثیت سے شریک رہا تھا اور جس نے سی آئی اے کے ایک ایجنٹ کے ذریعہ امریکہ کا ویزہ حاصل کیا تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت بھی اس کا تعلق سی آئی اے سے ہوگا۔

1996ء میں نیویارک میں، بحر الکابل پر محو پرواز 12 امریکی جہاز طیاروں اور ان میں سوار چار ہزار مسافروں پر بمباری کے جرم میں جن تین افراد کو سزا سنائی گئی ان میں سے ایک ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر بمباری کا نامزد ملزم رمزی احمد یوسف بھی تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اسے مجاہدین نے دھماکہ خیزی کی تربیت دی تھی۔ تحقیقاتی ایجنسیوں نے اس کے کمپیوٹر میں وہ دستاویز بھی دیکھی جس میں امریکی حکومت کی طرف سے اسرائیل کی مدد کرنے پر امریکیوں کو سزا دینے کا عزم کیا گیا تھا۔

رمزی یوسف کو فلپائن جیٹ طیارے پر بمباری کے سلسلہ میں 1994ء میں بھی اس کی غیر حاضری میں سزا سنائی گئی تھی۔ اس بمباری کے نتیجے میں ایک مسافر مارا گیا تھا۔ ایک

رپورٹ کے مطابق رمزی یوسف فلپائن کی ایک انتہا پسند مسلم تنظیم ”ابوسیاف“ کی کارروائیوں میں بھی شریک تھا۔

مارچ 1995ء میں پاکستان کے شہر کراچی میں دو امریکی ڈپلومیٹ مارے گئے جبکہ تیسرے کو کار میں جاتے ہوئے ایک حملے میں زخمی کر دیا گیا۔

دہشت گردی کی اس کارروائی کی تحقیقات کے لیے پاکستان آنے والی ایف بی آئی کی ٹیم نے یہ اعلان کیا کہ ان کے خیال میں یہ حملہ رمزی یوسف کی گرفتاری کے خلاف ممکنہ رد عمل ہے جسے پچھلے ماہ امریکی اور پاکستانی ایجنٹوں نے پاکستان میں گرفتار کر کے امریکہ کے حوالے کر دیا تھا۔

نومبر 1995ء میں سعودی عرب کے شہر ریاض میں اقوام متحدہ کی عمارت کے باہر دھماکہ خیز مواد سے بھرے ہوئے ٹرک کے پھٹنے سے پانچ امریکی اور دو بھارتی ہلاک ہو گئے۔ اس حملے کے ذمہ دار چار سعودیوں میں سے تین نے بتایا کہ انہوں نے آتش تھیاریوں اور دھماکوں کی تربیت افغانستان سے حاصل کی تھی۔

جون میں سعودی عرب ہی کے شہر دہران میں جو انیس امریکی ایئر مین اپنی رہائش گاہ پر بمباری سے ہلاک ہوئے تھے اس کی ذمہ داری بھی اسی گروپ نے قبول کی۔ :

1995ء کے موسم گرما میں فرانس مسلسل دہشت گردی کی زد میں رہا۔ یہاں لگاتار آٹھ دہشت گرد حملے ہوئے جن کا آغاز ریلوے اسٹیشن پر بم پھٹنے سے ہوا تھا جس میں آٹھ افراد ہلاک اور ایک سوسائٹھ زخمی ہوئے۔ فرانس کے قانون نافذ کرنے والے ادارے کے افسران نے اس حوالے سے بتایا کہ ”دہشت گردی کے سلسلے میں اب تک جتنے بھی افراد کی گرفتاری عمل میں آئی ہے وہ سب کے سب پاکستان یا افغانستان سے تربیت حاصل کر کے آئے ہیں۔“

چینیا کے گوریلوں نے جو ساہا سال سے مسلم معاشرہ کے قیام کے لیے روسیوں سے نبرد آزما ہیں اپنی فوج میں مشرق وسطیٰ اور افریقہ کے ”افغانیوں“ کو اہم عہدے دے رکھے ہیں ان کی صفوں میں شامل گوریلوں کی اکثریت افغانستان سے فوجی تربیت حاصل کی ہے روسی افسران کے مطابق تاجکستان کے چار سے پانچ ہزار مجاہدین شمالی افغانستان کے کیپٹنوں سے تربیت یافتہ تھے جو 1993ء میں سابقہ سوویت سینٹرل رشین ری پبلک کی سیکور

حکومت کے خلاف لڑے اور پھر واپس چلے گئے۔

چین کے مغربی صوبوں میں بھی ان لڑاکے افغانوں نے چینی مسلمانوں کو فوجی تربیت دی اور ان کے ساتھ مل کر چینی حکومت کے خلاف مسلح جنگ کی۔

1992ء سے مصر بھی حکومت مخالف دہشت گرد حملوں کی لپیٹ میں ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس میں بھی پاکستان اور افغانستان کے کیمپوں سے فوجی تربیت حاصل کرنے والوں کا ہاتھ ہے۔ اتھوپیہ کے دورے کے دوران جو صدر حسنی مبارک پر قاتلانہ حملہ ہوا تھا اسے بھی انہی عناصر کی کارروائی قرار دیا جاتا ہے۔

مورا کو میں سیاحت کو اہم صنعت کی حیثیت حاصل ہے۔ اسے غیر مستحکم کرنے کے لیے اگست 1994ء میں تین افغانوں نے مورا کو کے سیاحوں کے ہوٹل کو نشانہ بنایا۔ اس حملے میں کئی سیاح مارے گئے۔

نوے کی دہائی کے دوران افغانستان سے تربیت حاصل کرنے والے کشمیری اور دیگر قوم پرست بھارت سے آزادی حاصل کرنے کے لیے کشمیر کی پہاڑیوں پر بھارتی فوج سے نبرد آزما رہے۔

الجزیرہ میں 1992ء کے انتخابات کے مسترد ہونے کے بعد سے افغانستان سے فوجی تربیت حاصل کرنے والوں نے مسلح اسلامی گروپ کو مستحکم بنیادوں پر منظم کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ یہ گروپ اسلامی ریاست کے قیام کے سلسلہ میں ہونے والی مسلح جدوجہد کے نتیجہ میں کئی ہزار گوری ہلاکتوں کا ذمہ دار ہے۔

1992ء کے آغاز میں بوسنیا میں افغانوں اور بوسنیا کے مسلمان سپاہیوں کے ساتھ مل کر لڑائی میں حصہ لیا۔ انہوں نے مسلم دیہاتوں کو سربوں کے قبضہ سے چھڑانے کے لیے سریانکی اڈوں پر حملے کئے۔ نومبر 1995ء میں سعودی عرب میں بمباری کے مجرم نے جس کا اوپر حوالہ دیا گیا ہے بتایا کہ وہ بوسنیا میں بھی مسلمان فوجیوں کے ساتھ مل کر لڑ چکا ہے۔

1999ء میں لیبیا کے صدر کرنل معمر قذافی نے لندن سے شائع ہونے والے ایک غربی اخبار کو انٹرویو میں بتایا کہ ”ہماری حکومت نے افغانوں کی اسلامی جہادی تحریک کو کچل دیا ہے اور وہ بری طرح سے تباہ حال اور مایوس ہو کر واپس چلے گئے ہیں۔ امریکی خفیہ اداروں کے تربیت یافتہ ان مسلح گروپوں نے قتل اور دھماکوں کو پیشہ ہی بنالیا ہے۔“

دنیا کے بہت سے ممالک میں اور بھی بہت کچھ ہوا اور یہ سب کرنے والے وہ ہیں جنہیں سابق امریکی صدر رونالڈ ریگن نے آزادی کی لڑائی لڑنے والوں کا نام دیا تھا۔

ایک امریکی دانشور نے 1996ء میں پاکستان میں اس تمام صورتحال پر ان الفاظ میں تبصرہ کیا۔ ”اے مرغیوں کے اپنے ڈربے کی طرف آنے کے بجوانہ عمل سے تشبیہ دی جا سکتی ہے۔ آپ پوری دنیا کی شمولیت حاصل کرنے کیلئے نتائج کی پرواہ کئے بغیر کئی بلین ڈالرز اشتراکیت کے خلاف جہاد میں نہیں جھونک سکتے مگر ہم نے ایسا ہی کیا۔ افغانستان میں قیام امن ہرگز ہماری خواہش نہیں تھی بلکہ ہمارا اصل مقصد تو اشتراکیوں کی موت اور روسیوں کو باہر نکالنا تھا۔“

باب 3

خفیہ قتل

”میں ہر ایک کو مٹانا نہیں چاہتا..... صرف اپنے دشمنوں کو“
مائیکل کورلین، دی گاڈ فادر، حصہ دوم

صدر کلنٹن نے 26 جون 1993ء کو عوام کے سامنے اعلان کیا کہ آج امریکہ نے عراق پر میزائلوں سے حملہ کیا جس کے نتیجے میں آٹھ آدمی ہلاک اور کئی زخمی ہو گئے۔ اس حملہ کی توجیہ پیش کرتے ہوئے صدر نے کہا کہ عراق نے سابق امریکی صدر جارج بش کے دورہ کویت کے دوران ان کے قتل کا جو منصوبہ بنایا تھا یہ حملہ اس کے رد عمل کے طور پر کیا گیا ہے۔ (یہ منصوبہ محض الزام تھا اور الزام سے زیادہ اس کی کوئی حقیقت نہیں تھی) صدر کلنٹن نے یہ بھی کہا کہ یہ حملہ ریاستی دہشت گردی میں ملوث لوگوں کو یہ پیغام دینے کے لیے بے حد ضروری تھا کہ اگر انہیں مہذب دنیا میں رہنا ہے تو مہذب رویہ کا مظاہرہ کریں۔

ذیل میں دنیا بھر کی ان ممتاز شخصیات کے ناموں کی فہرست دی جا رہی ہے جنہیں خفیہ طور پر قتل کرنے یا ان کے قتل کی منصوبہ بندی میں امریکہ دوسری جنگ عظیم کے خاتمے کے بعد سے اب تک ملوث رہا ہے۔ (سی آئی اے کے ”بذلہ سنج“ عام طور پر اس قسم کے منصوبوں کو ”زبردستی کی خودکشی“ کا نام دیتے ہوئے انجینی کی ہیلتھ آرژیشن کمیٹی کے سپرد کر دیتے ہیں)

سال	شخصیت	ملک
1949ء	کم کو	کوریائے شمالی
1950ء کی دہائی		سی آئی اے / اندونازی ہٹ لسٹ پر
		مغربی جرمنی کی دوسو سے زیادہ

سیاسی شخصیات تھیں جنہیں سوویت
حملے کے موقع پر راستے سے ہٹا دیا
گیا تھا۔

چینی وزیراعظم جن پر کئی قاتلانہ حملے ہوئے۔	چو این لائی	50ء کی دہائی
صدر انڈونیشیا	سویکارنو	50ء کی دہائی اور 1962ء
وزیراعظم شمالی کوریا	کم ال سنگ	1951ء
ایرانی وزیراعظم	محمد مصدق	1953ء
فلپائن کے قائد حزب اختلاف	کلارو ایم ریکینو	50ء کا درمیانی عرصہ
بھارتی وزیراعظم	جواہر لعل نہرو	1955ء
مصری صدر	جمال عبدالناصر	1957ء
کمبوڈیا کا رہنما	نورودوم سہانوک	1959ء اور 60ء کی دہائی
عراقی رہنما	برگینڈیر جنرل عبدالکریم	1960ء
صدر کوسٹاریکا (دو قاتلانہ حملے ہوئے)	جوس فگرس	1950ء-1970ء
ہیٹی کا رہنما	فرینکوکس (پایا ڈوک)	1961ء
وزیراعظم کانگو	پئیرک لومبا	1961ء
جمہوریہ ڈومینیک کا رہنما	جنرل رافیل ترودجیلو	1961ء
صدر جنوبی ویت نام	نودنہ ڈیم	1963ء
صدر کیوبا (کئی قاتلانہ حملے اور قتل کے منصوبے)	فیڈل کاسترو	60ء کی دہائی
کیوبا کی حکومت کا اعلیٰ عہدیدار	راؤل کاسترو	60ء کی دہائی

جمہوریہ ڈومینیکا کا قائد حزب اختلاف	فرانسکو کمانو	1965ء
فرانسیسی صدر	چارلس ڈیگالی	1965-66
رہنما کیوبا	چی گوریا	1967ء
صدر چلی	سلواڈور ایلینڈ	1970ء
چلی کی فوج کا سربراہ	جنرل ریئے شینڈر	1970ء
رہنما پانامہ	جنرل عمر تو ز بھوس	70ء کی دہائی اور 1981ء
چیف آف انٹیلی جنس پانامہ	جنرل مینٹول نوریکا	1972ء
صدر زائرے	مبو تو سیسے سیکو	1975ء
صدر لیبیا (بے شمار قاتلانہ حملے اور قتل کے منصوبے)	معمر قذافی	86ء-1980ء
ایرانی رہنما	آیۃ اللہ خمینی	1982ء
مراکو کی فوج کا کمانڈر	جنرل احمد لیبی	1983ء
وزیر خارجہ نکاراگوا	میگنیل ڈی اسیکوٹو	1983ء
سینڈینا نیشنل ڈائرکٹوریٹ کے نوکمائش۔		1984ء
لبنانی شیعہ رہنما	شیخ محمد حسین فضل اللہ	1985ء
عراقی صدر	صدام حسین	1991ء
اسلامی مجاہد رہنما	اسامہ بن لادن	1998ء
صدر یوگوسلاویہ	سلوبوڈان میلوسوویچ	1999ء

اگر انہیں خفیہ قاتلوں کی کمی پڑ جائے

1975ء میں امریکن نیوی کے ایک ماہر نفسیات کمانڈر تھامس نیروت نے انکشاف

کیا کہ نیوی کی ذمہ داریوں میں قتل کرنے کی تربیت دینا بھی شامل ہے۔ ایسے ملازمین کو خصوصی طور پر یہ تربیت دی جاتی ہے وہ فطرتاً کسی کو مارنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ اگر انہیں

خاص قسم کے حالات میں ایسا کرنا پڑ جائے تو وہ کیا کریں یہی وجہ ہے کہ انہیں قتل کرنے کی باقاعدہ تربیت دی جاتی ہے۔ ان تربیت حاصل کرنے والوں کو ”خفیہ قاتل“ یا ”مارنے والے“ کہا جاتا ہے۔ خفیہ قاتل بنانے کے لیے سزایافتہ قاتل بھی فوجی جیلوں سے رہا کر دیئے جاتے ہیں۔ ”خفیہ قاتلوں“ کی تربیت کا آغاز اس نکتہ سے ہوتا ہے کہ دشمن انسان نہیں ہے۔ اس کے بعد مختلف طریقوں سے ان کی برین واشنگ کی جاتی ہے۔ ایسی تشدد آمیز فلمیں دکھائی جاتی ہیں جن میں لوگوں کو اذیتناک طریقوں سے مرتے بے رحمی سے قتل یا زخمی ہوتے دکھایا گیا ہو۔ نیروت کا یہ انکشاف جو کچھ ہو رہا ہے اس کے بارے میں ایک آئینہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ ایک بہت بڑی حقیقت جس کی روشنی میں ہم صرف تصور کر سکتے ہیں کہ درحقیقت اس پانچ طرفہ عمارت میں اس وقت کوئی منصوبہ تیار کئے جا رہے ہیں اور کتنے زیر عمل ہیں؟

امریکہ کے نزدیک کلمہ کفر کیا ہے؟

حکومت ایران کی طرف سے مصنف سلمان رشدی کو اس کی کتاب ”شیطانی آیات“ میں کلمہ کفر کہنے پر ”کافر“ قرار دے کر موت کا حقدار ٹھہرائے جانے پر مغربی دنیا ششدر رہ گئی تھی۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ بھی ”کافروں“ کی مذمت کرتے ہوئے انہیں موت کا حقدار ٹھہراتا رہتا ہے۔ کاسٹرو ایلینڈ، سویکارنو اور ایسے کئی ”کافر“ جن کی فہرست پچھلے صفحات میں موجود ہے امریکہ کے نزدیک موت کے حقدار ہیں کیونکہ وہ امریکہ کے مقدس مقاصد اور اس کی خارجہ پالیسی پر ایمان لانے کیلئے تیار نہیں ہوتے۔

گردش زمانہ

سینٹ کمیٹی (اسے چرچ کمیٹی بھی کہا جاتا ہے) کی 1975ء کی ”خفیہ قتال کی رپورٹ“ پر ایک نظر ڈالیے۔ کمیٹی کہتی ہے کہ ”مکمل جانچ پڑتال کے بعد کمیٹی اس بات پر قطعی یقین نہیں کرتی کہ یہ اقدام (خفیہ قتال) امریکی کردار کو ظاہر کرتے ہیں اس کی نمائندگی کرتے ہیں۔ یہ بہترین بھرپور پاکیزہ اور ایماندار زندگی کے لیے ان نظریات کے مظاہر نہیں ہیں جو اس ملک کے عوام کو دیئے گئے ہیں اور جن سے دنیا بھر کی امیدیں وابستہ ہیں۔ ہم ان خفیہ قتال کے منصوبوں کو گردش زمانہ کی تبدیلیاں سمجھتے ہیں۔“

جس وقت ”سینٹ کمیٹی“ نے یہ تحریر کیا تھا وہ سی آئی اے کے کم از کم ایک درجن

خفیہ قتال کے منصوبوں سے واقف تھی پھر بھی اسے گردش زمانہ کی تبدیلیاں کا نام دے دیا گیا۔ کیا آج بھی کانگریسی ارکان مندرجہ بالا فہرست میں دیئے گئے چالیس سے زائد واقعات کو گردش زمانہ کی تبدیلیاں قرار دیں گے؟ کیا وہ وضاحت کریں گے کہ گردش زمانہ کی یہ تبدیلیاں ٹرومین سے لے کر کلنٹن تک دس ادوار صدارت میں کس طرح جاری رہیں۔

چرچ کمیٹی کی رپورٹ کے منظر عام پر آنے کے بعد سے کچھ عرصہ سے امریکی صدور نے یہ دلیہ بتالیا ہے کہ جہاں کوئی خفیہ قتل ہوا یہ شاید دنیا کو قائل کرنے کے لیے فوری طور پر عوامی بیان جاری کر دیتے ہیں کہ ”حقیقت میں ہم یہ ہرگز نہیں چاہتے تھے۔“

1976ء: فورڈ نے ایک صدارتی حکمنامہ پر دستخط کیے جو یہ تھا۔ ”ریاستہائے متحدہ کا کوئی ملازم کسی سیاسی خفیہ قتل یا اس کی سازش میں شریک نہیں ہوگا۔“

1978ء: صدر کارٹر نے بھی خفیہ قتال کو روکنے کا سرکاری حکم جاری کیا۔

4 دسمبر 1981ء: صدر ریگن نے بھی صدر فورڈ کی طرز کا ایک حکمنامہ جاری کیا۔ لیکن جب 13 نومبر 1984ء کو صدر ریگن ”بین الاقوامی اشتراکی سازش“ کے سلسلہ میں ایک

ساتھ کی محاذوں پر سرگرم ہوئے تو انہوں نے فوری طور پر یہ حکمنامہ منسوخ کر دیا۔ اخبارات نے اس کی تفسیح کو ”قتل کرنے کا لائسنس“ قرار دیا۔ ہر ایک کو دہشت گرد قرار دے کر قتل کر دینے کا اجازت نامہ۔

10 اپریل 1985ء کو صدر ریگن نے ”قتل کا اجازت نامہ“ منسوخ کر دیا کیونکہ ایک ماہ قبل سی آئی اے نے امریکہ کی ایک ناپسندیدہ شخصیت شیخ فضل اللہ کو قتل کرنے کیلئے بیروت میں کچھ قاتل خریدے تھے۔ قتل کے اس منصوبہ میں کاربم استعمال کیا گیا جس کے نتیجہ میں 80 لوگ مارے گئے مگر ان میں شیخ فضل اللہ شامل نہیں تھے۔

11 اگست 1985ء کو ایک بار پھر ”قتل کرنے کے لائسنس“ کا اجراء ہو گیا۔ جس کا سبب جون میں ٹی ڈبلیو اے (TWA) کے ہوائی جہاز کا انواء تھا۔

12 مئی 1986ء کو کانگریسی اعتراضات کو تسلیم کرتے ہوئے ایک نئے سرکاری حکمنامہ پر دستخط ہوئے جس کی زبان غیر متنازعہ تھی۔

واضح طور پر ریگن کے اقدامات سے کہیں یہ ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ وہ خفیہ قتل کے حق میں ہیں یا خلاف۔ یہ سب تعلقات عامہ کا حصہ ہے اور یہی گذشتہ کئی سالوں سے امریکی

پالیسی کی بنیاد ہے کہ کچھ اور کچھ عوام کو سنانے کیلئے سب کی زبان ایک ہوتی ہے وائٹ ہاؤس سے جو بھی عوامی پیغام آتا ہے وہی ہر ایک کی زبان پر ہوتا ہے۔ تعلقات عامہ کی اہمیت کا اندازہ ان سے زیادہ کون کر سکتا ہے۔

13 اکتوبر 1989ء: بش نے ”خفیہ قتال“ کو ایک نئے معنی پہنائے۔ انہوں نے ایک ”قانونی یادداشت“ جاری کی جس کے ذریعہ قانونی دائرے کے اندر رہتے ہوئے ”حادثاتی“ قتل کی اجازت دے دی گئی۔ ”یہ صدارتی فیصلہ افواج کو بھی اپنے دائرہ اختیار میں لاتا ہے کہ اگر امریکی افواج کسی دوسری قوم کی جنگجو افواج کے مقابل صف آراء ہوں مثال کے طور پر گوریلا افواج، دہشت گرد یا دیگر تنظیمیں جن سے امریکی سلامتی کو خطرہ ہو تو ایسی صورت میں یہ خفیہ قتل نہیں کہلائے گا۔“ بالفاظ دیگر خفیہ قتل اس وقت تک جائز ہیں جب تک ہم چاہتے ہیں۔ واہ واہ کیا بات ہے۔

کلنٹن انتظامیہ نے خفیہ قتال کے بارے میں امریکی پالیسی کے حوالے سے کوئی سرکاری حکمنامہ یا بیان جاری نہیں کیا۔

غور طلب رپورٹ

وائٹ ہاؤس کیشن 1954ء نے سی آئی اے کی خفیہ سرگرمیوں کے حوالے سے اپنی مطالعاتی رپورٹ میں جہاں اور بہت سی معلومات جمع کی ہیں وہیں خفیہ قتال کے حوالے سے یہ اقتباس بھی زبان زد عام ہو گیا۔ اسے ماہرین نفسیات کہتے ہیں۔

”اب یہ بات مکمل طور پر عیاں ہو چکی ہے کہ ہمیں ایسے سنگدل اور بے رحم دشمن کا سامنا ہے جس کا مقصد کسی بھی قیمت پر عالمی برتری حاصل کرنا ہے۔ اس قسم کے کھیل کے نہ تو کوئی اصول ہوتے ہیں اور نہ ہی اس پر مہذب دنیا کے تسلیم شدہ اصول لاگو ہوتے ہیں اگر امریکہ کو قائم رہنا ہے تو اسے اپنے ان صاف سقرے اور ایماندارانہ اصولوں پر اصرار نہ کرنا ہوگا جو ہمیشہ سے امریکی کردار کا حصہ رہے ہیں۔ ہمیں خفیہ معلومات حاصل کرنے کے لیے معلومات در معلومات کے نظام کو موثر بنانا ہوگا اور اپنے دشمن کو تباہ بردار کرنے کیلئے زیادہ سمجھداری اور زیادہ متانت سے کام لیتے ہوئے ان سے زیادہ موثر طریقے اختیار کرنے ہوں گے جو دشمن ہمارے خلاف استعمال کر رہا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس بات کی بھی بے حد

ضرورت ہے کہ امریکیوں کے ذہنوں میں اس متضاد فلسفے کو اس طرح سے بٹھا دیا جائے کہ وہ نہ صرف اسے سمجھیں بلکہ اس کی حمایت بھی کریں۔“

حیت بھی میری پت بھی میرا

اگر امریکی حکومت کسی امریکی رہنما کے قتل کے منصوبہ کے شک میں جیسا کہ پچھلے صفحات میں بیان کیا گیا ہے عراقی انٹیلی جنس ہیڈ کوارٹر پر بمباری کر سکتی ہے اور اپنی سلامتی اور تحفظ کے جواز کے ساتھ اقوام متحدہ کے چارٹر میں پناہ حاصل کر کے اس کی گود میں جا کر بیٹھ سکتی ہے تو پھر اس کے ستائے ہوئے ممالک کے لیے بھی کھلی دعوت ہونی چاہیے۔ کیا پانامہ، لیبیا، کیوبا اور امریکہ کا شکار ایسے ہی کئی ممالک کو ان مواقع اور قوانین سے فائدہ اٹھانے کا حق نہیں؟ کیوبا کئی بار سی آئی اے کے ہیڈ کوارٹر کو بم سے اڑانے کے حق کا دعویٰ کر سکتا تھا۔ یہ کہنا بہت آسان تھا مگر وہ ایسا نہیں کر سکتا کیونکہ اسے نہ تو وائٹ ہاؤس نے ماننا تھا نہ امریکی عدالتیں اس قانونی جواز کو تسلیم کرتیں۔ ”فولادی پردے کے پیچھے دیکھنا ان کے بس کی بات نہیں۔“

امریکی فوج اور سی آئی اے کے تربیتی کتابچوں سے اقتباسات یا..... نفیس لوگوں کے خوبصورت خیالات

”خفیہ قتال کا مطالعہ“ (سی آئی اے کی طرف سے تحقیق 50ء کی دہائی کی گئی)
اندھے قتل کے سلسلہ میں ”سازشی حادثہ“ سب سے موثر طریقہ ہوتا ہے کیونکہ
منسوبہ کامیابی سے مکمل ہو جانے پر ہنگامہ کافی کم ہوتا ہے اور معمول کی تحقیقات ہوتی ہیں۔
سب سے کامیاب حادثہ 75 فٹ یا اس سے زیادہ بلندی سے سخت سطح پر گرنا ہے۔ اس کے
علاوہ لقمہ میں پھنس کر مرنا، سیرھیوں سے لڑھکنا، بغیر گرل کی کمزریوں یا پلوں سے گرنا بھی
نہایت موثر حادثات میں شمار ہوتے ہیں جن میں کامیابی یقینی سمجھی جاتی ہے۔ ضرورت صرف
اس بات کی ہے کہ کام اچانک اور فوراً کیا جائے۔ اس کام میں پھرتی بے حد ضروری ہے۔ ذرا
سی غفلت سو فیصد کامیابی کو ناکامی میں بدل سکتی ہے۔ نہایت پھرتی سے ٹخنوں سے پکڑ کر
کنارے سے الٹ دیا جائے کہ اسے سوچنے سمجھنے کا موقع ہی نہ ملے۔ اگر قتال حاضر دماغی
سے کام لیتے ہوئے اپنے شکار کی چیخ کو نکلنے سے پہلے ہی گھونٹ دے تو نہ موقع واردات سے
اپنی عدم موجودگی کی شہادت پیش کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے نہ کسی قسم کا سراغ لگایا جاسکتا
ہے۔“

”نشرہ آور ادویات بھی اس سلسلہ میں نہایت موثر ثابت ہو سکتی ہیں۔ اس کے لیے

ضروری ہے کہ قاتل نے ڈاکٹری یا نرسنگ کی تربیت حاصل ہوئی ہو اگر قاتل تربیت یافتہ ہے اور قتل ہونے والا زیر علاج تو یہ سب سے آسان اور یقینی طریقہ ہے۔ مارفین کی ایک زائد خوراک نہایت پرسکون موت کا باعث بنتی ہے جس کا سراغ لگانا بھی نہایت مشکل ہوتا ہے۔ دوا کی خوراک کتنی مقدار میں مریض کے جسم میں داخل کی جائے کہ یقینی موت کا باعث بنے اس کا دار و مدار اس بات پر ہے کہ آیا آپ کا شکار نشہ آور ادویات کے استعمال کا عادی ہے یا نہیں۔ اگر نہیں تو پھر دوائے کافی ہیں۔ اگر شکار مارفین یا ایسے کسی نشہ کا عادی ہے تو اسے اس کا انجکشن لگایا جاسکتا ہے۔ اس قسم کی موت کا سبب الکحل کی زیادتی قرار دیا جاتا ہے۔“

تیز دھار آلات کی مدد سے بھی موثر اور یقینی کامیابی کا حصول ممکن ہوتا ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ قاتل کو جسمانی اعضاء کا تھوڑا بہت علم ضرور ہو۔ گو کہ دل پسلیوں کے پنجرے میں محفوظ ہوتا ہے اور اس تک آسانی سے نہیں پہنچا جاسکتا مگر اس پر ہونے والا وار ہمیشہ سو فیصد کامیابی کا پیش خیمہ ثابت ہوتا ہے۔ چاقو کی نوک یا خنجر اور کپھاڑی کی مدد سے ریزہ کی ہڈی کو شدید چوٹ پہنچا کر بھی اپنا مقصد حاصل کیا جاسکتا ہے۔

گلا دبانے اور سانس گھوٹنا بھی نہایت قابل اعتبار طریقہ ہے۔ حلقوم اور رگوں کو سانس کی نالی کے دونوں اطراف سے نہایت بے رحمی سے اور تکلیف دہ انداز میں دبا کر مطلوبہ نتائج حاصل کیے جاسکتے ہیں۔

کانفرنس روم کا طریقہ

اس میں دو قاتلوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ پہلا قاتل پھرتی سے کانفرنس روم میں داخل ہوتا ہے جبکہ دوسرا خاموشی سے نشانہ باندھ کر دروازہ کے درمیان میں کھڑا رہتا ہے۔ پہلا قاتل بغیر وقت ضائع کیے اپنے ٹارگٹ پر فائرنگ کر کے اٹلے قدموں پیچھے کی طرف لوٹتے ہوئے گروپ کو خوفزدہ کرنے کے لیے آخری قدم پر مخصوص انداز میں چنگھاڑ کے اپنا میگزین خالی کر دیتا ہے۔ اس دوران دوسرا قاتل گروپ کو نشانہ پر رکھتا ہے تاکہ کوئی فرد کسی قسم کا رد عمل نہ ظاہر کر سکے۔ ضرورت پڑنے پر وہ تین فائر کرتا ہے۔ فائرنگ ختم کر کے وہ واپس چلنے کا حکم دیتا ہے۔ دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے خالی میگزین تبدیل کرتا ہے جبکہ دوسرا کاریڈور کو نشانہ پر رکھتا ہے۔ باہر نکلتے ہوئے پہلا نشانہ کی مخالف سمت فائرنگ کرتا ہے اور ایک

برسٹ گروپ کے پاس مارتا ہے۔ کارروائی کامیاب ہو جاتی ہے اور پیچھے مخالفین کو ذمہ دار ٹھہرانے کے لیے صرف پراپیگنڈہ باقی رہ جاتا ہے۔

”دہشت گردی اور شہری گوریلا“ (امریکی فوج کی جانب سے یہ تحقیق 60ء کی دہائی میں کی گئی)

”آبادی اور وسائل کو قابو میں رکھنے کے طریقے“

1۔ شناختی کارڈ: شناخت کا موثر نظام اس پروگرام کیلئے بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔
2۔ اندراج: شناختی کارڈ کے نظام کے بعد خاندان کے اندراج کو ضروری سمجھا جاتا ہے۔ جس میں خاندان کے افراد کا بمعہ ذرائع آمدن کے شمار کیا جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں فتنہ انگیز طبیعت رکھنے والوں اور ارد گرد رہنے والوں کے ساتھ تعلقات کی بھی خاص طور پر جانچ پڑتال کی جاتی ہے۔

3۔ بلاک کے ذریعہ قابو پانا: بلاک در بلاک ہر ایک رہائشی کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کرنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ان لوگوں کے بارے میں آگاہی حاصل کی جائے جو فتنہ پروروں کی حمایت کرتے ہیں ان سے ہمدردی رکھتے ہیں یا پھر انہیں کسی بھی قسم کی مدد فراہم کرتے ہیں۔

4۔ پولیس پٹرول (گشتی پولیس): اس کا مقصد فتنہ پروروں کی سرگرمیوں پر نظر رکھنا ہے۔ یہ معلومات حاصل کرنا بھی اس کی ذمہ داری ہے۔ کہ فتنہ پرور قوتیں جاسوسی اور نقل و حمل کے لیے کونے ذرائع استعمال کرتی ہیں اور ان کی روزمرہ کارگزاریاں کیا ہوتی ہیں۔

5۔ کرنفو: عوام کو گھروں میں رہنے کے اس حکم کا مقصد یہ ہے کہ حکام فتنہ پرور عناصر کی شناخت کر سکیں۔ جو بھی کرنفو کی خلاف ورزی کرتا ہے وہ شری پسند ہے یا پھر ان کا ہمدرد اور ان کے خلاف ان کی جگہ کی بنیاد پر کارروائی کی جاسکتی ہے۔

6۔ شناختی مقام: سفر کے راستوں پر چیک پوائنٹس کے قیام کا مقصد شناخت کے عمل کو کامیاب بنانا ہے۔ شناختی کارڈ یا اجازت نامہ کے اجراء کا پروگرام اس وقت مفید ثابت نہیں ہو سکتا جب تک اس دستاویز کی تصدیق کا نظام موجود نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ سفر کے

راستوں پر جیک پوائنٹس ضروری ہیں۔

”وسائل کا سنبھالنا“

(امریکی فوج کی یہ رپورٹ 1960ء میں تیار کی گئی)

کسی ادارے کا ایسا ملازم جسے تنخواہ دار حکومتی مقرر کے طور پر منتخب کیا گیا ہو اسے گورنر یا تنظیم میں بھیجے کے عمل کا جو چیزیں لازمی حصہ ہیں ان میں کاؤنٹر انٹیلی جنس ایجنٹ کی طرف سے اس کے والدین کی گرفتاری اسے جیل بھیجنا یا پھر اس کی پٹائی کرنا شامل ہے۔ (رپورٹ میں یہ واضح نہیں کیا گیا کہ یہ سب کچھ اس شخص کو مقرر بننے پر مجبور کرنے کے لیے کیا جاتا ہے یا پھر اس کو قابل اعتبار بنانے کے لیے)

”گرفتاریوں، سزاؤں یا مصالحت سے ملازم کی قیمت بڑھائی جاسکتی ہے اس سلسلے میں یہ احتیاط نہایت ضروری ہے کہ کسی طور پر یہ ظاہر نہ ہو کہ وہ مجرم ہے۔“
”ملازم کو ترقی کی یقین دہانی موثر ہتھیار ثابت ہوتی ہے۔ اس کے ذریعہ گوریلوں میں سے دشمنی کے جراثیم ختم کئے جاسکتے ہیں۔“

”حکومت چونکہ محبت وطن شہریوں کی فراہم کردہ اطلاعات یا پھر پکڑ جانے والے فتنہ پردازوں سے حاصل کی گئی معلومات پر ہی انحصار نہیں کر سکتی اس لیے اسے ایسے ملازمین کی ہمہ وقت ضرورت رہتی ہے جو اس کے لیے مجرموں کی حیثیت سے کام کر سکیں۔“

ان کتابچوں کے حوالے سے سرکاری محکمہ دفاع کا موقف یہ ہے کہ ان میں قابل اعتراض مواد نقب زلوں کے ذریعہ شامل کیا گیا ہے۔ ڈی اور ڈی (DOD) کے بیان کے مطابق ”ایسی کوئی شہادت موجود نہیں ہے کہ ان کتابچوں کو تیار کرنے والوں نے جان بوجھ کر فوج یا محکمہ دفاع کی پالیسیوں کی خلاف ورزی کی کوشش کی ہے۔“ تاہم اس معاملہ پر تحقیق کرنے والے جوزف کینیڈی کا کہنا ہے کہ ”دی سکول آف امریکا“ جہاں یہ کتابچے استعمال کئے گئے تھے کے دو افسران نے 1980ء کے آغاز میں اپنے اعلیٰ افسران کے سامنے اس قابل اعتراض مواد کے حوالے سے سوالات اٹھائے تھے جس کا تسلی بخش جواب دینے کی بجائے انہیں بری طرح سے جھڑک دیا گیا تھا۔

سیڑھی ہے کیونکہ حواسِ غصہ سے محرومی جتنی زیادہ ہوگی اتنی ہی تیزی سے مغلوب اثرات قبول کرنے لگتا ہے اور پھر وہ وقت بھی آتا ہے جب وہ آپ کے اشاروں کا غلام بن جاتا ہے۔
”آزادی کے متوالے“

(سی آئی اے کا کتابچہ۔ 1984ء)

سولہ صفحات پر مشتمل اس ”مزاحیہ کتاب“ میں 40 تراکیب کے ذریعہ نکار اگوا کے لوگوں کی رہنمائی کی گئی ہے کہ وہ مارکسی ظلم و تشدد سے کس طرح نجات حاصل کر سکتے ہیں۔ ان ”مفید“ تراکیب میں چند ایک ملاحظہ فرمائیے۔

غسل خانوں کی تالیوں کو اسفنج سے بند کر دو۔ بجلی کے تار نکال دو۔ ہڑکوں پر درخت کاٹ کر ڈال دو۔ گاڑیوں میں لدے ہوئے سامان کو توڑ پھوڑ دو۔ ہوٹلوں میں جھوٹی ریزرویشن کے لیے فون کرو۔ فون پر جرائم آگ لگنے کی اوپر خوراک کی چوری کی جھوٹی اطلاعات دو اور حکومت سے خوراک حاصل کر کے ذخیرہ کر لو۔ روشنیاں اور نلکے کھلے چھوڑ دو۔ لیٹر باکس سے ڈاک چراؤ۔ کام پر تاخیر سے جاؤ۔ بیماری کا بہانہ کر کے ہر تھوڑے دن بعد چھٹی کر لو۔ بجلی کے سرکٹ نکال دو۔ بجلی کے بل پھاڑ دو۔ کتابوں کو پھاڑ کر پرزے ہوا میں اڑاؤ۔ افواہیں پھیلاؤ۔ اپنے افسران اور سپروائزر کو فون پر دھمکیاں دو۔

”گوریلا جنگ میں نفسیاتی نقل و حرکت“

(سی آئی اے کا کتابچہ۔ 1984ء)

یہ کتابچہ نکار اگوا میں بائیں بازو کے سینڈینستا حکومت کے خلاف برسرِ پیکار امریکہ کے حمایت یافتہ گوریلوں کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ جس میں کچھ اس قسم کا سبق دیا گیا ہے۔
”سینڈینستا حکومت کے تمام اہلکاروں اور ایجنٹوں کو اغواء کر کے عوامی جگہوں پر رکھو۔ حکومت کے خلاف نعرہ بازی اور لعن طعن کرو۔ اگر گوریلا کسی فرد پر فائرنگ کرتا ہے تو علاقے کے لوگوں کے سامنے یہ ثابت کرو کہ یہ عوام کا دشمن تھا۔ اگر وہ شخص بچ نکلنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو یہ ثابت کرو کہ اب اس نے دشمن کو خبردار کر دیا ہوگا اور اب وہ اس کے بدلے میں زنا، لوٹ مار اور تباہی مچا دیں گے۔“

سینڈینستا حکومت کی اہم شخصیات کو جان سے مارنے کی فہرست میں شامل اعلیٰ

عدالتوں، امن عدالتوں اور ہائی کورٹوں کے جج حضرات، پولیس اور ریاستی سلامتی کے ادارہ کے اعلیٰ افسران، سینڈیٹا دفاعی کمیٹی کے چیف وغیرہ کے ناموں کے حوالے سے ”ہیلی سکیلر“ نامی ایک لکھاری نے تبصرہ کیا کہ ”مطلوبہ لوگوں کی فہرست عدالتوں کے ججوں سے شروع ہوتی ہے اور ”وغیرہ“ پر ختم ہوتی ہے اور یہ ہر ایک کے قتل کا سٹوکیٹ ہے۔ جس کو جی چاہے موت کے گھاٹ اتار دو۔ اجازت نامہ تحریری شکل میں ہے۔“

پولیس نے ایسے شہریوں کی طرف سے جھوٹے بیانات پر مبنی رپورٹ تیار کر کے ہدایات جاری کیں جو کسی تحریک میں شامل نہ تھے۔ ان ہدایات کے مطابق ہر وہ شخص ہٹ لسٹ پر موجود تھا جو گوریلا صف میں شامل نہ ہونا چاہتا ہو۔

کتابچے میں آگے چل کر لکھا ہے کہ اگر ضروری ہو تو کسی ”خاص کام“ کے لیے پیشہ ور مجرموں کو کرایہ پر حاصل کیا جا سکتا ہے۔ جبکہ خصوصی ذمہ داری دوسروں کو دی جائے تاکہ اپنے مقصد کے حصول کی خاطر شہید پیدا کیا جاسکے۔ مظاہرین کا حکام کے ساتھ مقابلہ کرایا جائے تاکہ ہنگامہ ہو اور فائرنگ کے نتیجہ میں ایک سے زائد شہید حاصل ہو سکیں۔ ایسی صورتحال پیدا کی جائے جسے مقتدر ٹولے کے خلاف استعمال کیا جاسکے۔ کسی بڑے جھگڑے کا اہتمام کیا جائے جس کے لیے لوگ چاقو، بلیڈ، زنجیر، لاشمی اور لوہے کے سریوں سے لیس ہو کر لڑنا چاہیں۔ اس لڑائی میں معصوم اور سادہ لوح لوگ حصہ لینے کے لیے بے چین ہو جائیں۔ ان تمام کتابچوں کے مطالعہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اشتراکیت کے بارے میں مغربی دنیا کو کیا کچھ کس طرح بتایا جا رہا ہے۔

عالمی عدالت کے فیصلہ کے مطابق امریکہ نے اس کتابچے کو پیش کر کے اور پھیلا کے ان اقدامات کی حوصلہ افزائی کی ہے جو انسانی حقوق کے قوانین اور جینوا کنونشن 1949ء کے اصولوں کے خلاف ہیں۔

Kubark - جاسوسی کا توڑ پوچھ گچھ

(سی آئی اے کی جولائی 1963ء کی رپورٹ)

”پوچھ گچھ کی صورتحال ان لوگوں کے لیے پریشان کن ہوتی ہے جنہیں پہلی بار اس کا سامنا ہو۔ پوچھ گچھ کا مقصد ہی اس پریشانی کو بڑھانا ہوتا ہے۔ عام طور پر پوچھ گچھ کے موقع پر کپڑے اتروالیے جاتے ہیں کیونکہ روزمرہ استعمال کا لباس انسان میں اس کی ”میں“ کو زندہ رکھتا ہے اس کی پہچان قائم رہتی ہے اور اس میں برداشت اور دفاع کی قوت بڑھتی ہے۔“

”ذیل میں پوچھ گچھ کے موقع پر استعمال ہونے والی تشدد کی کچھ اذیت ناک ترکیبوں کا ذکر کیا جا رہا ہے جن میں گرفتاری، قید تہائی، حواسِ خمسہ سے محرومی کا دھمکیاں برین واشنگ، بے حس کرنا، ترغیبی بازگشت، مصنوعی نیند طاری کر کے کانوں میں اپنی مرضی کی باتیں ڈالنا، خوف، تکلیف اور سنگین نتائج کی دھمکیاں شامل ہیں۔“

”انسانی وسائل کے استحصال کی تربیت“

(سی آئی اے کا کتابچہ - 1983ء)

بعض انسانی رویوں میں تبدیلی لانے یا انہیں قابو میں رکھنے کے لیے نفسیاتی طریقوں کی مدد سے ان میں تابعداری کا عنصر پیدا کیا جاتا ہے۔ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ اطاعت گزار فطری بھی ہو سکتی ہے اور زبردستی بھی پیدا کی جاسکتی ہے۔

اطاعت گزار یا تابعداری پیدا کرنے کے لیے جس طریقہ پر عمل کیا جاتا ہے وہ کچھ یوں ہے کہ مغلوب کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر دونوں ہاتھ بھی پشت پر باندھ دیئے جاتے ہیں۔ اسی حالت میں اسے نہانے کیلئے کہا جاتا ہے اور غسل کے عمل کے دوران ایک محافظ مستقل سر پر کھڑا رہتا ہے۔ مکمل طبی معائنہ کیا جاتا ہے جس کے دوران تمام جسمانی اعضاء کی جانچ پڑتال کی جاتی ہے۔ اس پوری تربیت کے دوران کم سے کم آرام کا موقع دیا جاتا ہے۔ اگر اس لینے کی اجازت بھی ملتی ہے تو کوئی چارپائی، گدایا کبل نہیں دیا جاتا، مقصد اسے آرام طلبی سے روکنا ہوتا ہے۔ رفع حاجت کے کسی تعمیر شدہ غسلخانے کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ اسے ایک ڈول تھما دیا جاتا ہے اور اس دوران بھی محافظ اس کے سر پر کھڑا رہتا ہے۔ ذہنی طور پر اسے اتنا پریشان کیا جاتا ہے کہ اس کے حواسِ خمسہ ساتھ چھوڑنے لگتے ہیں۔ یہی کامیابی کی پہلی

باب 5

تشدد

”پہلا دھچکہ ہی اتنا اذیتناک تھا کہ بس موت کی خواہش رہ گئی تھی۔“ یہ الفاظ گلوربا لیسپرائزے ریز کے ہیں جس پر ہوڈراس میں تشدد کیا گیا۔ اس کی چھاتیوں اور پیشاب دانی میں بجلی کی تاریں لگا کر شکا دیئے گئے۔

اذیت رساں جو زیریا کا اس حوالے سے کہنا ہے کہ اذیت کا نشانہ بننے والے ہمیشہ موت کی درخواست کرتے ہیں کیونکہ موت اذیت سے بہتر ہے۔

14 جولائی 1999ء کو ترکی میں پیش آنے والے اس واقعہ کو ملاحظہ کیجئے۔ پولیس زبردستی ایک کرؤش خاندان کے گھر میں داخل ہوئی اور اعلان کیا کہ وہ ان کی بیٹیوں 14 سالہ میڈین اور اس کی چھوٹی بہن دیوراں کو پوچھ گچھ کے لیے اپنے ساتھ لے جا رہی ہے۔ یہ سن کر دیوراں تو لباس تبدیل کرنے کے لیے اپنے کمرے میں چلی گئی جبکہ میڈین سیدھی کھڑکی میں گئی اور سب کی آنکھوں کے سامنے نیچے چھلانگ لگا دی۔

”پیری بیٹی نے ایک بار پھر اذیت سہنے کی بجائے موت کو ترجیح دی۔“ میڈین کی ماں نے روتے ہوئے اس کے اقدام کا پس منظر واضح کیا تھا۔

اینٹنٹی انٹرنیشنل کی رپورٹ کے مطابق ”اذیت رسانی تو تھوڑے عرصے بعد ختم ہو جاتی ہے مگر انسان سے اس کی ناراضی چھین لیتی ہے۔ وہ پہلے جیسا نہیں رہتا۔“

اذیت رسانی اور دیگر غیر انسانی، ظالمانہ اور ذلت آمیز سلوک وسرؤاؤں کے خلاف ہونے والے کنونشن کے آرٹیکل 2، 2S کے مطابق حالات کوئی بھی ہوں۔ خواہ حالت جنگ ہو یا جنگ کا خطرہ یا پھر اندرونی عدم استحکام کی صورتحال درپیش ہو کسی بھی قسم کے ہنگامی حالات میں اذیت رسانی کو درست قرار نہیں دیا جاسکتا۔“

1988ء میں سنٹرل اینٹی سلیپ جنس ایجنسی کے ڈپٹی ڈائریکٹر آف آپریشن رچرڈ سنولز نے واضح الفاظ میں کہا کہ جسمانی تشدد ہو یا کسی بھی قسم کا ذلت آمیز سلوک اسے نہ صرف بدتر بلکہ تاریخی طور پر غیر موثر ہونے کی وجہ سے مسترد کر دیا گیا ہے۔

اس قسم کے بیانات جاری کرنا سی آئی اے کی عادت ہے اس طرح یہ ثابت کرنے کی کوشش کرنا ہے کہ اس کا تشدد سے دور کا واسطہ بھی نہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا کوئی اس بات پر یقین کرے گا کہ تشدد کے ذریعہ زبان نہیں کھلوائی جاتی یا پھر اس مقصد کے لیے یہ موثر نہیں؟ سی آئی اے اور رچرڈ سنولز ذرا اس سوال کا جواب دیں کہ اگر میڈین (ادھر دیا گئے ترکی کے واقعہ کی مثال) خود کشی نہ کرتی تو کیا وہ تشدد کے سامنے زبان کھولنے پر مجبور نہ ہو جاتی؟ تشدد کی اثر پذیری اس وقت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے جب اس کا مقصد معلومات اکٹھی کرنے سے زیادہ سزا دینا ہوتا ہے۔ صرف اس لیے شکار پر ظلم و ستم کیا جاتا ہے اسے اذیت پہنچائی جاتی ہے کہ وہ مخالفانہ کارروائیاں نہ شروع کر دے اس کے ساتھ ساتھ اس کے دل میں اور اسکے ساتھیوں کے دلوں میں خوف پیدا ہو جائے۔ ان مقاصد کے حصول کے لیے گزشتہ کئی دہائیوں سے سی آئی اے اور تشدد کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ (اس سلسلے میں یہ ذہن میں رکھنے کی ضرورت ہے کہ ترکی حکمت عملی کے معاملہ میں امریکہ کا نہایت قریبی حلیف ہے) تشدد کے حوالے سے کارروائیوں کو ایجنسی اس حد تک خفیہ رکھتی ہے کہ نہایت قریبی رازداروں کو بھی اس کی ہوا نہیں لگتی۔ یہی وجہ ہے کہ یہ تکلیف دہ تفصیلات عرصہ دراز تک باہر نہیں نکلتیں مگر تمام تر رازداری کے باوجود جستجو رکھنے والے اندر کی خبر حاصل کر ہی لیتے ہیں۔ آئیے ذرا تشدد کے ان واقعات پر بھی ایک نظر ڈال لیں جنہوں نے ایجنسی کی اندھیری کوٹھڑیوں سے نکل کر بلا خردن کی روشنی دیکھ لی۔

یونان

1940ء کے اواخر میں سی آئی اے انٹرل سکیورٹی ایجنسی کے ”وائی پی“ کی جدید انداز میں تنظیم نو میں مصروف تھی۔ اس سے قبل ”کے وائی پی“ تشدد سمیت خفیہ پولیس کے تمام پسندیدہ ”امور“ سرانجام دے رہی تھی۔ 1967-76ء تک کے فوجی دور حکومت میں جسے عرف عام میں خونخوار تشدد کا دور کہا جاتا ہے یہ نہایت مستعد رہی۔ اس حوالے سے ایمنسٹی انٹرنیشنل

کی ایک رپورٹ میں کہا گیا کہ ”تشدد کے سوال پر امریکی پالیسی ہمیشہ یہ رہی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو سکے اس سے انکاری رہو اور جہاں انکار ممکن نہ ہو وہاں کم سے کم تسلیم کرو۔ یہ پالیسی سرکاری بیانات اور شہادتوں سے صاف ظاہر ہوتی ہے۔“ ایمنسٹی نے اس سلسلے میں ایک امریکی اٹارنی ”تھمر بیکیت“ کو یونان بھیجا جس نے 1969ء میں اپنی رپورٹ میں لکھا کہ ”بعض اذیت رسالوں نے قیدیوں کو بتایا کہ تشدد کے لیے جو اوزار وہ استعمال کرتے ہیں وہ امریکی فوجی امداد کی شکل میں آتے ہیں۔ ان میں سے ایک چیز سفید رنگ کی موٹی دھری تار کا بنا ہوا وہ چابک ہے جس کی مدد سے سائنٹفک انداز میں تشدد کیا جاتا ہے اور یہ اذیت رسال کے کام کو بہت آسان بنا دیتا ہے۔ دوسرا اوزار لوہے کا وہ حلقہ ہے جسے ناقابل بیان اذیت دینے کے لیے کانوں یا سر کے گرد کس دیا جاتا ہے۔“ آگے چل کر بیکٹ لکھتا ہے کہ ”تشدد کرنے والوں کے لیے امریکی حمایت اتنی ہی ضروری ہے جتنی زندہ رہنے کے لیے ہوا پانی یا خوراک۔ امریکی امداد کے بغیر وہ یہ کام نہیں کر سکتے۔“

انسپیکٹر باسل لیمر کی وہ مختصر سی تقریر بھی ملاحظہ فرمائیے۔ جو سینکڑوں قیدیوں نے سنی اور جو ساری صورتحال نہایت احسن طریقہ سے واضح کرتی ہے۔ انسپیکٹر باسل لیمر اپنی اس میز کے پیچھے بیٹھا تھا جس پر امریکی امداد کا نشان سرخ، نیلے اور سفید رنگ کے مصافحہ کے انداز میں ملے ہوئے ہاتھوں کی شکل میں نمائش پذیر تھا۔ قیدیوں پر یہ ظاہر کرنا اس کا مقصد تھا کہ ان کی مزاحمت قطعاً بے فائدہ ہے۔ ان کا حوصلہ پست کرنے کے لیے اس نے جو الفاظ استعمال کیے وہ یہ ہے ”جب تم یہ سوچتے ہو کہ تم کچھ کر سکتے ہو تو بالکل پاگل لگتے ہیں۔ تمہاری اس سوچ کو پاگل پن کے سوا کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ تم یہ جان لو کہ دنیا دو حصوں میں تقسیم ہے۔ ایک طرف اشتراکی ہیں اور دوسری جانب آزاد دنیا۔ یعنی روسی اور امریکی۔ ان کے علاوہ اور کوئی نہیں۔ خود ہم کیا ہیں؟ امریکی۔ میرے پیچھے حکومت ہے، حکومت کے پیچھے نیو اور نیو کی پشت پر ریاستہائے متحدہ امریکہ۔ ہم امریکی ہیں تم ہم سے نہیں لڑ سکتے۔“

ایران

ایران میں تشدد کے حوالے سے بدنام خفیہ سروس ساواک (Savak) 1950ء میں سی آئی اے اور اسرائیل کے اشتراک میں تعاون سے عمل میں آئی۔ ایران میں سی آئی اے کے

سابق تجزیہ نگار جیسی جے لیف کے مطابق ساوک کو تشدد کے طریقوں کی ہدایات ایجنسی کی طرف سے ملتی تھیں۔ 1979ء کے انقلاب ایران کے بعد ایرانیوں کو ساوک کے لیے بنائی گئی سی آئی اے کی وہ فلم ملی جس کے ذریعہ خواتین پر تشدد کے طریقے سکھائے گئے تھے۔

جرمنی

1950ء میں سی آئی اے نے مغربی یورپ میں سودیت تنظیموں کے مشتبہ جاسوسوں کو میونخ میں تشدد کا نشانہ بنایا جسے ”انٹنی سودیت آپریٹر“ کا نام دیا گیا۔ اس میں سی آئی اے نے تشدد کے جو طریقے اختیار کئے ان میں سے چند ایک ملاحظہ فرمائیے۔ آدی کے پر تارپن کا تیل لگانا، کمرے میں بند کر کے بہرہ کر دینے کی حد تک اونچی آواز میں انڈیٹیشن موسیقی لگا دینا حتیٰ کہ وہ اپنے ہوش و حواس کو بیٹھے۔ یہ تو وہ طریقے ہیں جو ضبط تحریر میں لائے جاسکتے ہیں ان کے علاوہ ایسے ایسے پر تشدد طریقے اختیار کئے گئے جن پر گفتگو کسی طور مناسب محسوس نہیں ہوتی۔

ویتنام

”گرین ہیرس“ نے 60ء کے عشرے میں ویتنام میں فرائض کی انجام دہی کے لیے تعینات اپنے ارکان کو خاص طور پر یہ سکھایا کہ تفتیش اور تحقیقات کے دوران لازمی عنصر کے طور پر تشدد کا استعمال کس طرح سے کرنا ہے۔ سی آئی اے کی طرف سے ہونے والے بدنام زمانہ ”فوکس آپریشن“ کا مقصد ویت کا تک انفراسٹرکچر کی تباہی تھا۔ اس آپریشن میں مشتبہ افراد پر تشدد کے جن طریقوں کا استعمال کیا گیا ان میں مردوں اور عورتوں کے جسموں کے نازک حصوں اور شرمگاہوں میں بجلی کے جھکے دینا، کانوں میں چھانچ اندر تک لوہے کے اوزار داخل کر کے ان کے ذریعہ دماغ پر اس وقت تک دھک دینا جب تک کہ وہ شخص مرنے جائے، بیل کی کاہڑ کے ذریعہ مشتبہ افراد کو اونچائی سے زمین پر اس لیے بھینکنا کہ ان سے زیادہ اہم مشتبہ لوگوں کو زبان کھولنے پر مجبور کیا جائے۔ ہماری رائے میں تو کسی کو اس طرح بھینکنا واضح طور پر قتل ہے جسے تشدد کی قسم قرار دینا کسی طور درست نہیں۔

جینوا کنونشن کی صریحاً خلاف ورزی کرتے ہوئے امریکہ نے قیدیوں کو اپنے جنوبی ویتنامی حلیفوں کے حوالے کر دیا۔ یہ جانتے بوجھے کہ ان پر تشدد کیا جائے گا اور اہم بات یہ

ہے کہ تشدد کی ان کارروائیوں کے دوران امریکی افران بھی موجود ہوتے تھے۔

بولیویا

1967ء میں کیوبا کاسٹرو مخالف عناصر نے سی آئی اے کے ساتھ مل کر ”چی گودیرا“ کی تلاش کی مہم میں ایسے گھرتیار کیے جہاں وہ بولیویائی لائے جاتے تھے جن پر چی گودیرا کی گوریلا فوج کی مدد کرنے کا شبہ ہوتا ہے۔ یہاں ان پر تشدد بھی کیا جاتا تھا۔ جب بولیویا کے وزیر داخلہ کو ان تشدد کارروائیوں کا علم ہوا تو انہوں نے مشتعل ہو کر مطالبہ کیا کہ سی آئی اے فوری طور پر ایسی کارروائیاں بند کر دے۔

یوراگوئے

60ء کے اواخر میں امریکی دفتر برائے تحفظ عامہ (سی آئی اے کے بین الاقوامی ترقی کے شعبہ کا ایک حصہ) کے ایک ملازم ”ڈین میٹریا“ کو جس نے غیر ملکی پولیس فورس کو تربیت دی اور مسلح کیا تھا مونٹی ویڈیو یوراگوئے میں تعینات کیا گیا۔ اس حوالے سے عام خیال یہ ہے کہ ”میٹریا نے“ کی آمد سے پہلے بھی یوراگوئے میں سیاسی قیدیوں پر تشدد کیا جاتا تھا مگر 1970ء میں برازیل کے ایک کثیر الاشاعت اخبار ”جرئل ڈوبرازیل“ نے یوراگوئے کی خفیہ پولیس کے سابق چیف ”الچینڈرو اوئیرو“ کا چونکا دینے والا انٹرویو شائع کر کے اصل حقائق پر پردہ اٹھایا۔ ”اوئیرو“ نے اس انٹرویو میں انکشاف کیا کہ ”امریکی مشیروں نے بالعموم اور ”میٹریا نے“ بالخصوص تشدد اور اذیت رسانی کو تقبیل کے روزمرہ معمولات کا حصہ بنا دیا اور تشدد کے ایسے ایسے ساختھک طریقوں سے روشناس کرایا کہ عقل حیران رہ گئی۔ ان طریقوں میں قیدیوں کو ذہنی اذیت میں مبتلا کرنے کے لیے ان میں مایوسی پیدا کرنے کا نفسیاتی حربہ بے حد آزمودہ ثابت ہوا۔ اس طریقے میں قیدی کے ساتھ والے کمرہ میں ٹیپ ریکارڈ لگا دیا جاتا تھا جس میں عورتوں اور بچوں کی چیخیں ریکارڈ ہوتی تھیں۔ ان آوازوں کے بارے میں قیدی کو بتایا جاتا کہ یہ اس کے اہلخانہ کی آوازیں ہیں جن پر دوسرے کمرے میں تشدد کیا جا رہا ہے۔“ اس انٹرویو نے ان امریکی اہلکاروں کو بری طرح سے پریشان کر دیا جو جنوبی امریکہ اور واشنگٹن میں تعینات تھے۔ واشنگٹن میں ”اوپن ایس“ کے ڈائریکٹر نے صفائی پیش کرتے ہوئے یہ موقف اختیار کیا کہ مونٹی ویڈیو کے تینوں برازیلی رپورٹر یہ بات ماننے سے انکار کر رہے

ہیں کہ یہ خبر انہوں نے لگائی ہے۔ البتہ ہم نے حقیقت کا سراغ لگا لیا دراصل یہ ”جرنل ڈوبرازیل“ کے کپوزنگ روم میں سے کسی کی شرارت تھی جو اخبار میں اس خبر کی شکل میں شائع ہو گئی۔

”میٹریانے“ نے موٹی ویڈیو میں واقع اپنے گھر کے گودام میں ایک ساؤنڈ پروف کمرہ تعمیر کرا رکھا تھا۔ جہاں وہ یورگوئے کے پولیس افسران کو تشدد کے طریقے سکھایا کرتا تھا اور ان تراکیب کا عملی مظاہرہ بھی کیا جاتا تھا۔ ایسے ہی ایک مظاہرہ میں چار فقیروں پر تشدد کا ایک نیا دریافت شدہ طریقہ آزمایا گیا۔ ان مغلوب فقیروں کے جسم کے مختلف حصوں پر بجلی کی مختلف دوشیج کے اثرات کا مظاہرہ کیا گیا۔ اس تجربہ کے اختتام پر چاروں کے چاروں فقیر ہلاک ہو چکے تھے۔ اپنی پر تشدد کارروائیوں کے حوالے سے ”میٹریانے“ کا مقولہ یہ تھا کہ مطلوبہ نتائج کے حصول کے لیے ٹھیک ٹھاک جگہ پر ٹھیک ٹھاک مقدار میں ٹھیک ٹھاک درد لازمی ہے۔“

اس کا کہنا تھا ”اس طریقہ سے آپ جو چاہتے ہیں وہ حاصل کر لیتے ہیں یہی وجہ ہے کہ میں ہمیشہ حاصل کر لیتا ہوں۔ اس سلسلے میں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ سب کچھ الٹ پلٹ کر دینے کی اس کارروائی میں راز اگوانے کے لیے اگر آپ اذیت رسانی کے دوراٹھنے کو حتی الامکان بڑھادیں تو مطلوبہ نتائج یقینی طور پر حاصل کر سکتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ اس سے آپ کو فوری معلومات حاصل ہو جائیں بلکہ یہ سیاسی طریقہ مستقل طور پر دلوں میں خوف بٹھانے کے لیے نہایت آزمودہ ہے۔

برازیل

یورگوئے میں دفتر برائے عوامی تحفظ کے لیے کام کرنے سے قبل ”ڈین میٹریانے“ برازیل میں تعینات تھا۔ یہاں وہ دوسرے امریکیوں کے ساتھ سی آئی اے آئی ڈی اور او پی ایس کے لیے کام کر رہے تھے برازیل کی سکیورٹی فورسز کو قیدیوں پر تشدد کی تربیت اور اس سلسلے میں استعمال ہونے والے آلات کی فراہمی میں مصروف رہا۔ یہاں تربیت دینے والے امریکیوں نے اس بات پر خاص طور پر زور دیا کہ بجلی کے کتنے جھکے دیئے جائیں کہ شکار ہلاک نہ ہو اور مطلوبہ نتائج بھی حاصل ہو جائیں کیونکہ بعض اوقات تشدد کے دوران ہونے والی

ہلاکتیں مسائل کا باعث بن جاتی ہیں۔

گوئے مالا

1960ء سے 1980ء کے دوران گوئے مالا کی سیکورٹی فورسز خاص طور پر G2 نامی فوجی یونٹ نے نہایت ہی ظالمانہ قسم کی پرتشدد کارروائیاں جاری رکھیں۔ تشدد کے جو طریقے اختیار کئے گئے ان میں عضوئے تناسل کے ارد گرد بجلی کے جھٹکے دینے کا عمل نہایت ہی اذیتناک تھا۔ اس سلسلے میں ملٹری فیلڈ ٹیلیفون استعمال کئے جاتے تھے جو چھوٹے جزیئر سے منسلک ہوتے تھے۔ تشدد کی کارروائیوں کے لیے آلات اور ہدایات بہم پہنچانا ”انگل سام“ کی ذمہ داری تھی۔ امریکہ اور مختلف ممالک میں پھیلے ہوئے اس کے حواری اس تکنیک کے استعمال میں ماہر ہو چکے تھے۔ سی آئی اے کی ہدایات اور اس کے فراہم کردہ آلات کی مدد سے G2 نے اذیت رسانی کے مراکز کا جال بھیلایا اس کے آزمودہ طریقوں میں اعضاء کے نکلے کرنا، جسم کو داغنا اور بجلی کے جھٹکے دینا سب سے زیادہ اہم تھا۔ اس فوجی یونٹ کے پاس مردے جلانے کا اپنا مرکز تھا جس کا مقصد ہر قسم کی شہادت اور ثبوت کو مکمل طور پر مٹا دینا تھا۔ سی آئی اے نے G2 کو مکمل طور پر اپنے جاسوسوں سے بھر دیا تھا جن میں 80ء کی دہائی اور 1990ء کے آغاز کے G2 کے تین سربراہ اور نچلے درجے کے بے شمار افسر شامل تھے جنہیں ایجنسی تنخواہ دیتی تھی۔ ایجنسی کی مہربانیوں سے فائدہ اٹھانے والوں میں جنرل ”ہیکٹر گریماجو موریلز“ بھی تھا جو کہ 1989ء کے فوجی دور میں وزیر دفاع تھا جب امریکی سنسٹر ”ڈیانا اورنز“ کو اغواء کیا گیا۔ سنسٹر ڈیانا کو سگریٹوں سے داغایا گیا کئی بار اس کی بے حرمتی کی گئی۔ اورنز ان اذیتناک ایام کا ذکر کرتے ہوئے کہتی ہے کہ ”اذیت رساں اپنے مغلوب کے خلاف طاقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے خوشی سے پھولے نہیں ساتے تھے۔ ایک روز ایک اذیت رساں نے ایک بہت بڑا خنجر میرے ہاتھ میں تھما دیا اور اپنا ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھتے ہوئے اس دوسری عورت کے پیٹ میں گھوپٹنے کا حکم دیا۔ میرا خیال ہے کہ میں نے اس عورت کو ہلاک کر دیا ہوگا۔ ان میں ایک صاف رنگت کا آدمی جسے سب ”پلینڈرو“ پکارتے تھے ان کا بس“ یعنی انچارج تھا۔ وہ امریکی لہجہ میں ہسپانوی زبان بولتا تھا۔ جب اس شخص کو اندازہ ہوا کہ میں امریکی ہوں اس نے مجھ پر تشدد بند کرنے کا حکم دے دیا۔ صاف ظاہر ہے کہ اس نے یہ کام

انسانی بنیادوں پر نہیں بلکہ سیاسی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے کیا تھا۔“
 1996ء میں امریکہ میں ”اورژ“ نے اپنی فریم آف انفارمیشن ایکٹ کی درخواست کے جواب میں سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کی جانب سے بہت سی دستاویز وصول کیں۔ جن میں سے صرف ایک میں جس پر 1990ء کی تاریخ درج تھی ”پلچنڈرو“ کا خاص پیرائے میں اس طرح ذکر کیا گیا تھا۔

”نہایت اہم اس کیس میں ”شمالی امریکن“ کا مسئلہ جس کا اورژ نے ذمہ دار کے طور پر نام لیا ہے کہ دیکھنا ضروری ہے اور سفارتخانہ اس حوالہ سے بہت حساس ہے لیکن یہ مسئلہ ایسا ہے کہ ہمیں عوامی سطح پر رد عمل ظاہر کرنا ہوگا۔“
 اس سے اگلے دو صفحات مکمل طور پر تہ دین شدہ تھے۔

ایل سیلواڈور

80ء کے دور میں پھیلنے والی سرکشی کے خلاف سیلواڈور کی بہت سی سیکورٹی فورسز نے اذیت رسانی کی تربیت حاصل کی۔ ان سب ہی قوتوں کے امریکی فوج یا سی آئی اے کے ساتھ نہایت قریبی روابط تھے۔ جنوری 1982ء میں ”نیویارک ٹائمز“ نے سیلواڈور کی فوج کے ایک صحراؤرد کا انٹرویو شائع کیا جس نے اس حلقہ کے بارے میں انکشاف کیا جہاں چھوٹی عمر کے قیدیوں پر مختلف طریقوں سے تشدد کا مظاہرہ کیا جاتا ہے۔ اس کے بیان کے مطابق اس سلسلے میں امریکی فوج کے آٹھ مشیر ”گرین بیرٹس“ کے طور پر خدمات سرانجام دے رہے تھے۔

فوجی رگروٹوں کو تربیت دیتے ہوئے ان کے ذہن میں یہ بات بٹھادی جاتی ہے کہ ”کسی پر رحم نہیں کھانا بلکہ صرف نفرت کرنی ہے اور انہیں انسان سمجھنے کی ضرورت نہیں جو ہمارے ملک کے دشمن ہیں۔“

سیلواڈور نیشنل گارڈ کے ایک سابق ممبر نے 1986ء کی برطانوی ٹیلی وژن کی دستاویزی فلم کی تصدیق کرتے ہوئے کہا کہ ”میں بارہ افراد پر مشتمل اس دستے میں شامل تھا جس نے خود کو اذیت رسانی کے لیے وقف کر رکھا تھا۔ ہم ہر لمحہ ان لوگوں کی تلاش میں رہتے تھے جن پر گوریلے ہونے کا شبہ ہوتا تھا۔ اس سلسلے میں نو ماہ تک ہمیں امریکی فوجیوں نے

گوریلوں کے خلاف جنگ کی تربیت دی تھی۔ اس تربیت کا ایک نہایت اہم حصہ اذیت رسانی تھی۔ جس کے متعلق ہمیں خصوصی ہدایات دی جاتی تھیں۔

ہونڈراس

1980ء کے دوران امریکہ نے بدنام بیالین 316 کی مکمل حمایت کی جس نے سینکڑوں شہریوں کو اغواء کر کے تشدد کی دیگر کارروائیوں کے ساتھ بجلی کے جھٹکے دے کر اور دم کھنٹ کر ہلاک کرنے کے نئے ریکارڈ قائم کر دیئے۔ اسے تشدد کا سامان سی آئی اے نے فراہم کیا جبکہ ہونڈراس اور امریکی اہلکاروں نفسیاتی اور جسمانی اذیت کے طریقے سکھائے۔ پر تشدد کارروائیوں میں پوچھ گچھ کے ہر موقع پر سی آئی اے کے افسران نہ صرف موجود تھے بلکہ انہوں نے اس میں عملی طور پر حصہ لیا۔ سی آئی اے نے ارجنٹائن کے بغاوت کے خلاف ماہرین کو بے شمار پیسہ فراہم کیا کہ وہ ہونڈراس کے باشندوں کی مزید تربیت کریں۔ اس وقت ارجنٹائن اپنی اس ”گندی جنگ“ کے لیے مشہور تھا جس میں اذیت رسانی، بچوں کا اغواء اور ہلاکتیں شامل تھیں۔ سی آئی اے اور ارجنٹائن کے ماہرین بیالین 316 کو مل تربیت دے رہے تھے۔ امریکہ نے تو بیالین کی حمایت اس وقت بھی جاری رکھی جب اس کے ڈائریکٹر جنرل ”گنستادو الواریز مارٹینیز“ نے امریکی سفیر کو بتایا کہ وہ فتنہ انگیزوں کو مٹانے کے لیے ارجنٹائن کا طریقہ واردات اختیار کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ایک طرف تو 1983ء میں ریگن انتظامیہ نے الواریز کو ”ہونڈراس میں جمہوریت کے قیام کے عمل میں کامیابی حاصل کرنے پر خراج تحسین“ پیش کرتے ہوئے Legion of Merit کے ایوارڈ سے نوازا اور دوسری طرف یہی امریکی انتظامیہ بیالین کی زیادتیوں پر پردے ڈالتے ہوئے کانگریس اور عوام کو بہکاتی رہی۔

پانامہ

1989ء میں پانامہ پر امریکی قبضہ کے دوران بعض امریکی فوجی پانامہ کی دفاعی افواج کے سپاہیوں پر تشدد کی کارروائیوں میں مصروف رہے۔ ایسے ہی ایک واقعہ میں ایک ذہنی سپاہی کے کھلے ہوئے زخم میں جستی تار داخل کر دی گئی جسے اسے شدید اذیت سے دوچار کیا۔ ایک اور واقعہ کے مطابق ایک ذہنی سپاہی کو اس بازو سے لٹکے پر مجبور کیا گیا جس پر گہرا زخم

آنے کی وجہ سے ٹانگے لگے ہوئے تھے۔

اپنے گھر میں

یہ حصہ ان قارئین کے لیے خصوصی طور پر تحریر کیا گیا ہے جو یہ یقین کرنے کے لیے تیار نہیں کہ امریکی حکومت، شہری اور فوجی اہلکار غیر ملکیوں پر تشدد کی کارروائیوں میں خوفناک حد تک شریک ہیں۔ ان قارئین کے لیے یہ انکشاف نہایت اہمیت کا حامل ہوگا کہ ان امریکیوں نے اپنے جیسے بہت سے امریکیوں کے ساتھ کیا کچھ کیا ہے اور کر رہے ہیں۔

60ء اور 70ء کی دہائیوں کے دوران ”سان ڈیگو“ اور ”مینے“ میں امریکی نیوی سکولوں میں طالب علموں کو بچاؤ، دفاع اور بھاگنے کے طریقے سکھائے جاتے تھے کہ قیدی بننے کی صورت میں وہ انہیں استعمال کر سکیں۔ ان کورسز میں صحرا میں زندہ رہنے کی تربیت بھی دی جاتی تھی جس کے دوران طلباء کو چھپکیاں کھانے پر مجبور کیا جاتا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ نیوی کے افسروں اور کیدائس کے ساتھ بی مارپیٹ کرنا، ذلت آمیز طریقہ سے جھاڑنا اور تحقیر کرنا اس تربیت کا حصہ تھا۔ اس کے علاوہ ”شیر کوکھو“ کے طریقہ میں 16 کیوبک فٹ کے ڈبے میں 22 گھنٹے کے لیے بند کر دیا جاتا۔ ”پانی کا بورڈ“ نامی طریقہ میں بورڈ کے ساتھ اس شخص کو اس طرح کس دیا جاتا کہ سر نیچے کی طرف اور ٹانگیں اوپر۔ چہرے پر ایک تولیہ ڈال کر اس پر ٹھنڈا بخ پانی بہایا جاتا۔ منہ میں کپڑا ٹھنسا ہونے کی وہ سے اس کا دم گھٹتا، قے آتی ایسے میں وہ غرغراتا، سانس لینے کی کوشش کرتا۔ اس کا مقصد ڈوبنے سے بچاؤ کی تربیت دینا تھا۔ اس قسم کے ظالمانہ تربیتی عوامل کے حوالے ایک سابق طالب علم نیوی پائلٹ لیفٹیننٹ وینڈل رچرڈ بینک نے دعویٰ کیا کہ یہ تربیت کا حصہ نہیں بلکہ طلباء کو تشدد کے لیے تجربہ کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ ایسی ہی ایک تربیتی مشق کے دوران اس کی کمر کی ہڈی ٹوٹ گئی اور وہ کسی کام کا نہیں رہا۔ اس نے سوال کیا کہ طالب علموں کے نازک حصوں میں لوہے کی سلاخیں گھسانا، پیشاب کرنا، محافظوں کے سامنے مشت زنی اور سکھانے والے کے ساتھ جنسی فعل پر مجبور کرنا کس تربیت کا حصہ ہے؟ اور اس کا کیا مقصد ہے؟

1992ء میں ایک شہری بورڈ نے بتایا کہ 1973ء سے 1986ء کے تیرہ سالہ

عرصہ میں شکاگو پولیس کے افسران اور کمانڈرز مغلوں کے ساتھ منظم قسم کے تشدد اور ظالمانہ

کارروائیوں میں ملوث رہے جن میں عضو تناسل اور جسم کے نازک حصوں پر بجلی کے جھٹکے، وحشیانہ مار پیٹ، سروں پر پلاسٹک کے تھیلے چڑھا کر دم گھونٹنا، قیدی کے منہ میں بندوق کی تالی رکھ کر ٹریگر دبا دینا، قیدیوں کے ہاتھ باندھ کر کہوں پر لٹکا کر تلووں پر مارنا اور اذیتناک نفسیاتی حربوں کا استعمال شامل تھا۔ ظالمانہ تشدد سمجھ کر زندہ بچ جانے والوں کی تعداد بہت ہی کم ہوتی تھی جن میں سے بعض کو رہا بھی کر دیا جاتا تھا مگر وہ تمام عمر کے لیے اہنازل ہو جاتے تھے۔ 40 سے زیادہ تشدد کے ایسے کیس جمع کئے گئے بے شمار کا کچھ پتہ ہی نہیں چلا۔ ان میں سے ایک کے وکیل کا اس حوالے سے کہنا ہے کہ تشدد کا نشانہ بننے والے تمام مظلوم یا توسیہ فام ہیں یا لاطین جبکہ تشدد کرنے والے سفید فام افسران تھے۔

انسانی حقوق کی تنظیم کی جیلوں میں قیدیوں کی صورتحال کے حوالے سے سامنے آنے والی تحقیقات کے مطابق نیویارک، کیلیفورنیا، فلوریڈا اور ٹینیسی میں واقع 20 سے زائد جیلوں میں قیدیوں کی حالت نہایت دگرگوں ہے۔ ان پر تشدد بھی کیا جاتا ہے اور علاج معالجہ پر بھی توجہ نہیں دی جاتی یہاں علاج کا معیار اقوام متحدہ کے مقرر کردہ کم از کم معیار سے بھی گیا گزرا ہے۔ یہاں قیدیوں کے ساتھ تشدد کے مختلف طریقے اختیار کئے جاتے ہیں جن میں قیدی کے ہاتھ باندھ کر 145 ڈگری پانی کے ٹب میں داخل ہونے پر مجبور کرنا، آٹھ سیکنڈ کے لیے 50 ہزار ولٹ کے جھٹکے دینا بجلی کے متواتر جھٹکوں سے قیدیوں کی اموات، طوفانی بارش، شدید گرمی یا سردی میں انہیں کھلی جگہ پر بنجروں میں قید رکھنا، اس وقت تک قید تھائی جب تک وہ حواس باختہ نہ ہو جائے جیسی کارروائیاں شامل ہیں۔

تشدد کے حوالے سے ایمنسٹی انٹرنیشنل کی بھی کئی رپورٹس منظر عام پر آ چکی ہیں جن میں ”تشدد..... علاج کا فقدان اور قیدیوں پر لاس اینجلس، کیلیفورنیا پولیس کی طاقت کے مظاہرے“ کے عنوان سے رپورٹ 1992ء میں سامنے آئی جبکہ 1996ء میں ایک اور چونکا دینے والی رپورٹ نے سب کو اپنی جانب متوجہ کر لیا جس کا عنوان تھا ”پولیس کی بربریت اور نیویارک شٹی پولیس ڈیپارٹمنٹ کی بوہتی ہوئی طاقت۔“

ایمنسٹی انٹرنیشنل کے مطابق امریکی پولیس طاقت کے بے جا استعمال پر تشدد کارروائیوں اور اپنے غیر انسانی اور ظالمانہ رویوں کے باعث مستقل بین الاقوامی انسانی حقوق کے قوانین کی خلاف ورزی کی مرتکب ہو رہی ہے۔

مندرجہ بالا واقعات سے یہ تاثر لینا درست نہیں ہوگا امریکی حکومت تشدد کی ان کارروائیوں سے پریشان نہیں ہے۔ اس سلسلے میں یہ وضاحت ضروری ہے کہ 1996ء میں کانگریس نے ایک قانون منظور کیا تھا جس کے ذریعے پہلی بار اس بات کی اجازت دی گئی تھی کوئی بھی امریکی شہری کسی غیر ملک میں خود پر ہونے والے تشدد پر اس غیر ملکی حکومت کے خلاف امریکی عدالت میں مقدمہ کر سکتا ہے۔ ان میں ایک ”چھوٹی“ سی بندش ضرور تھی کہ اس قانون کے تحت جن ممالک کے خلاف کارروائی کی جاسکتی تھی جو انہیں ریاستہائے متحدہ امریکہ سرکاری طور پر اپنا دشمن قرار دے چکی ہے اور یہ ”دہشت گرد“ ریاستیں کہلاتی ہیں جبکہ دیگر ریاستوں کے لیے صورتحال 1990ء کی دہائی والی ہی ہے جب ایک امریکی ”سکاٹ نٹسن“ نے خود پر ہونے والے تشدد پر امریکی عدالت میں سعودی عرب کے خلاف مقدمہ دائر کیا تھا۔ ایک سرکٹ کورٹ آف ایپلز کے مطابق اسے مقدمہ کرنے کا حق تھا مگر سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ نے سعودیوں کی مدد کرتے ہوئے یہ کیس سپریم کورٹ میں داخلے سے جانے کو کہا۔

ناپسندیدہ افراد

80ء کی دہائی میں سی آئی اے کے دنیا بھر میں پرتشدد کارروائیوں، قتل و غارتگری اور خبیثات فروشی جیسے قابل نفرت کاموں میں ملوث ہونے کے نہ صرف بے شمار انکشافات ہوئے بلکہ ایسے ایسے شواہد سامنے آئے کہ امریکی حکومت کے پاس سوائے مذمت کے کوئی راستہ نہیں بچا۔ ان حالات سے نمٹنے کے لیے ”ناپسندیدہ افراد“ کی اصطلاح سامنے لائی گئی جس کا مقصد بالخصوص امریکی عوام اور بالعموم دنیا پر یہ ثابت کرنا تھا کہ اس قسم کی ناپسندیدہ کارروائیوں میں ملوث افراد امریکہ کے نزدیک بھی اتنے ہی قابل نفرت ہیں جتنے باقی دنیا کے نزدیک اور امریکی حکومت بھی ان سے اتنا ہی دور بھاگتی ہے۔ جتنا کوئی بھی مہذب اور شائستہ امریکی شہری بھاگ سکتا ہے۔ میڈیا نے ہمیشہ کی طرح نہایت تابعداری سے نہ صرف اس اصطلاح بلکہ اسی نظریہ کو بھی اختیار کر لیا کہ سی آئی اے کا ان ناپسندیدہ افراد سے صرف اتنا تعلق ہے کہ وہ معاوضہ کے بدلے معلومات فراہم کرتے ہیں۔ ان کے ساتھ سی آئی اے کے تعلق کے ہر نئے انکشاف کے بعد بیرون ملک غیر قانونی سرگرمیوں اور انسانی حقوق کی خلاف ورزیاں کرنے والے سی آئی اے کے تحواہ دار ملازمین کے خلاف ملنے والی شہادتوں کے بعد ہر بار نئے سرے سے سرکاری سطح پر یہ باور کرانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ قومی سلامتی کے تحفظ اور اہم معلومات کے حصول کے لیے سی آئی اے کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ ان ناپسندیدہ افراد کے ساتھ تعلق رکھا جائے۔ یہ جدید سفید براق نظریہ زندہ و جاوید حیثیت اختیار کر چکا ہے یہی وجہ ہے کہ آج بھی جب میڈیا ناپسندیدہ افراد کے ساتھ کام کرنے پر سی آئی اے پر تنقید کرتا ہے تو اس کے سوا کوئی تمبرہ نہیں کرتا کہ یہ تعلق اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ معلومات کے عوض ادائیگی کی جاتی ہے۔

مگر اس میں کسی قسم کا کوئی شک و شبہ نہیں ہونا چاہیے کہ یہ لوگ صرف مخبر ہی نہیں ہیں۔ یہ بات باآسانی سمجھ میں آ جانی چاہیے۔
یہ لوگ خانہ جنگی میں بھی سی آئی اے اور امریکہ کے حلیف ہوتے ہیں۔ امریکی پراپیگنڈہ کے ذریعہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے یہ لوگ آزادی اور جمہوریت کی جنگ لڑ رہے ہیں۔

ہم ان کے مقاصد میں کامیاب بنانے کے لیے ان کی مدد کرتے ہیں کیونکہ ہمارے بھی وہی مقاصد ہیں جو ان کے ہیں۔ ہم ان میں سے کچھ کو اپنے فوجی سکولوں کے لیے منتخب کر لیتے ہیں اور پھر انہیں کامیابی کی اسناد دیتے ہیں۔ ہم انہیں امریکہ میں ہی کھلاتے پلاتے ہیں، تحفے تحائف دیتے ہیں، عورتیں مہیا کرتے ہیں۔ انہیں تربیت دیتے ہیں، ہتھیار اور یونیفارم فراہم کرتے ہیں۔ ہم انہیں خفیہ نقل اور تشدد کے طریقے سکھاتے ہیں۔ ہم انہیں مطلوبہ افراد کے بارے میں مکمل معلومات فراہم کرتے ہیں جو کہ سی آئی اے کی تحقیقات کا نچوڑ ہوتی ہیں، پھر ان مطلوبہ افراد میں سے کچھ نقل ہو جاتے ہیں کچھ تشدد کا نشانہ بن جاتے ہیں۔ ہم ان کی زیادتیاں چھپاتے ہیں اور انہیں زیادہ سے زیادہ آسانیاں مہیا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ نشیات کی سنگلنگ کرتے ہیں مگر ہم انہیں بچاتے ہیں۔ وہ ہمارے دوست ہیں ہم ان کے ساتھ اس لیے اتنا اچھا برتاؤ کرتے ہیں کہ وہ ہماری خاطر اپنے ملکوں سے غداری کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں ہمارے اپنے معیار ہیں۔ ہمارے سوا جو ان ناپسندیدہ افراد کو ان کے مذموم مقاصد کے حصول کے لیے سرمایہ فراہم کرتا ہے ہم اسے ”دہشت گردوں کا سرپرست“ قرار دیتے ہیں۔ لیبیا کے صدر معمر قذافی کی مثال سامنے ہے۔

سی آئی اے ان ناپسندیدہ افراد کو سرمایہ فراہم کر کے معلومات کے علاوہ بھی بہت کچھ حاصل کرتی ہے۔ جن میں سرفہرست دباؤ ڈالنا اور پھر قایم پالینا ہے۔ یہ غیر جمہوری ظالمانہ اور دہرے معیار حیران کن ہی نہیں افسوسناک بھی ہیں جو دیکھنے والوں کو یہ سوال کرنے پر مجبور کرتے ہیں کہ اگر امریکہ کے لیے غیر ممالک کی خانہ جنگی میں حصہ لینا اتنا ہی ضروری ہے تو وہ ہمیشہ ناپسندیدہ افراد کی پشت پناہی اور حمایت ہی کیوں کرتا ہے؟

امریکی خلوت خانہ کے مزید ناپسندیدہ ڈھانچے

جنگ عظیم دوم کے بعد کے دور میں امریکی خارجہ پالیسی نے بہت سے ناپسندیدہ افراد کو گلے لگایا۔ ان میں سابق نازی (ان میں کلوں باری جیسے مجرم بھی شامل تھے) اٹلی کے فاشسٹ، جاپان کے دشمن فوجی، جاپانی سائنسدان جو امریکیوں سمیت دیگر جنگی قیدیوں پر خوفناک تجربے کرنے کے حوالے سے پچھانے جاتے تھے اور ہزاروں ایسے افراد جو جنگ کے دوران دشمن سے ملے ہوئے تھے شامل تھے۔ یورپ اور ایشیاء کے بہت سے ممالک میں دشمن کے مددگاروں کو سرعام ذلیل و خوار کیا گیا، جیلوں میں قید کیا گیا اور جنگ کے بعد قائم ہونے والی حکومتوں اور شہری گروپوں نے ایذا نہیں دے دے کر انہیں ہلاک کیا لیکن چین، اٹلی، یونان، فلپائن، کوریا، لبنان، مغربی جرمنی، ایران، سوویت یونین، ویتنام اور ایسے کئی ممالک میں جو فاشسٹ اور شریک کار سزاؤں کے عمل سے بچنے میں کامیاب ہو گئے وہ امریکی حلیف بن گئے۔ انہوں نے امریکہ کے اشاروں پر ناچنا شروع کر دیا نئی حکومتیں بنانی ہوں یا حکومتوں کے تختے الٹنے ہوں، خانہ جنگیوں میں حصہ لینا ہو یا حزب مخالف کو دبانا ہو، اطلاعات کی فراہمی ہو یا انتخابی و سیاسی جوڑ توڑ ہو امریکہ کے لیے انہوں نے یہ ”خدانات“ سرانجام دینا شروع کر دیں کہ وہ امریکی حلیف جو بن گئے تھے کوئی ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا کہ ان کی پشت چڑھ کر امریکہ کا مضبوط ہاتھ تھا۔

88ء کیا وائٹ ہاؤس کی پبلکن پارٹی کی میشل ری پبلکن ہیرٹیج گروپس کونسل میں مشرقی اور مرکزی یورپ میں نازیوں کے اصل حامی موجود تھے۔ ان میں سے بہت سی شخصیات جارج بش کی صدارتی مہم میں امریکی قومیتوں کے ملاپ کے حوالے سے خاصی سرگرم تھیں حالانکہ وہ اس سے اچھی طرح باخبر تھے کہ ان کے ماضی کے کارنامے کوئی راز نہیں تھے۔ ظاہر ہے کہ جلد یا بدیر اس قسم کے راز منکشف ہو کر طشت از بام ہو جاتے ہیں یہاں بھی ایسا ہی ہوا۔ ان میں سے ایک سرگرم رکن ”لیز لوپیزز“ جو جنگ کے دوران ہنگری کی نازی حامی حکومت کے اہلکار کی حیثیت سے برلن کے سفارتخانہ میں فرائض سرانجام دے چکا تھا۔ اس کی اس حیثیت کا انکشاف سب سے پہلے 1971ء میں ”وائٹ ہاؤس“ نے کیا۔ وقت کے ساتھ یہ معاملہ کچھ دب گیا مگر ستمبر 1988ء میں ایک بار پھر یہ نہایت نمایاں انداز میں اس

طرح سامنے لایا گیا کہ ہر ایک کو اپنی جانب متوجہ ہونے پر مجبور کر لیا جس پر روری پبلکن پارٹی کے کرتادھرتا پریشان ہو کر رہ گئے اور انہوں نے فوری طور پر 'پیزنز' اور اس سے ملتا جلتا ماضی رکھنے والے پارٹی کے چار اراکین کو انتخابی مہم سے علیحدہ کر کے منظر عام سے ہٹاتے ہوئے کچھلی صفوں میں بھیج دیا۔

ناپسندیدہ افراد کے ساتھ امریکہ کا رابطہ اور تعلق چند سالوں کی بات نہیں یہ تو عشروں پر محیط ہے۔ ماضی کی اس قدر طویل وابستگیاں ثابت ہو جانے کے باوجود یہ ظاہر کرنے کی کوشش کرتا کہ یہ تعلق محض اپنے فائدے کے لیے ایک بد صورت عورت کے ساتھ عارضی شادی سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا سوائے ایک یہودہ مذاق کے کچھ نہیں ہے۔ وہ کونسی کشش ہے جس نے اتنے سالوں سے انہیں ایک بندھن میں باندھ کر رکھا ہوا ہے کہ وہ لازم و ملزوم کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ اپنی حیثیت کو قائم رکھنے کی خواہش ترقی پسند تحریکوں یا اشتراکیت سے کراہیت اور اس بات کا خوف کہ کہیں یہ حیثیت جو بھائی ہے جھمن نہ جائے انہیں ایک دوسرے سے جوڑے ہوئے ہے۔ وہ دنیا بھر میں امریکی مفادات کے لیے کام کرتے ہیں اور بدلے میں سب کچھ حاصل کرتے ہیں جس کی خواہش کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کے بغیر ان دونوں کا وجود بے معنی ہے۔ کیا ان کی مدد کے بغیر امریکہ کے لیے واحد عالمی طاقت بننا ممکن تھا اور کیا امریکی مدد کے بغیر ان کا بیج جانا ممکن تھا.....؟

نئے ناپسندیدہ افراد کی تربیت

کانگریس میں گزارے ہوئے 24 سالوں کے دوران کسی ایک مواقع پر بھی ایسی کوئی شہادت میرے سامنے نہیں آئی جس سے یہ اندازہ ہوتا کہ امریکی فوج کی مداخلت کے باعث کسی ملک کی فوج نے اپنے لوگوں پر ڈھائے جانے والے ظلم اور زیادتیوں کا سلسلہ روک دیا ہو۔

(سینٹر نام ہارکن "ڈی۔ آئیو" 1999ء)

سکول آف امریکا

فورٹ بینک، جارجیا میں قائم فوجی سکول "سکول آف امریکا" کئی برسوں سے احتجاج پسند عناصر کے قبضہ میں ہے۔ اس کے بہت سے فارغ التحصیل لاطینی امریکہ میں انسانی حقوق کی سنگین قسم کی خلاف ورزیوں میں ملوث پائے گئے ہیں اکثر کی پہچان قتل و غارت اور پر تشدد کارروائیاں ہیں جبکہ "سکول آف امریکا" کا دعویٰ ہے کہ ان کے ہاں طلباء کو انسانی حقوق کی پاسداری اور جمہوریت کی تعلیم سکھائی جاتی ہے۔ ان کے اس دعویٰ کی حیثیت جانچنے کے لیے ذرا اس نکتہ کو ذہن میں رکھئے کہ لاطینی امریکہ کی قوموں کے درمیان جنگوں کی شرح بہت ہی کم ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ کسی دوسرے ملک کی فوج نہیں تو پھر فوجی کون ہیں جنہیں لڑنے کے لیے تیار کیا جا رہا ہے؟ کیا ان کے اپنے شہری ہیں؟ یہ حقیقت ہے کہ پچھلے کئی سالوں سے "سکول آف امریکا" میں لاطینی امریکہ کے سینکڑوں ہزاروں فوجیوں اور پولیس کے اہلکاروں کو جبراً مغلوب کر کے اپنے مقاصد کے حصول کے لیے تربیت دی جا رہی ہے۔ طلباء اشتراکیت کے خلاف نفرت پیدا کرنے کے

ساتھ جوابی فتنہ پروری، فوجی خبر رسائی، منشیات کے خلاف کارروائیوں، اختلاف رائے کرنے والے کو صفحہ ہستی سے مٹانے اور سماجی تبدیلی کے لیے اٹھنے والی ہر تحریک کا سرکھنے کی تربیت دی جاتی ہے۔

”سکول اور امریکا“ کے نظریہ کے مطابق اشتراکیت اور جمہوریت اپنے روایتی طرز حیات کے تحفظ کے لیے مغربی ممالک کے پختہ عقیدے سے ٹکراتے ہیں۔ ”سکول آف امریکا“ کے حوالے سے مندرجہ ذیل واقعہ بھی خاصی اہمیت کا حامل ہے۔

1994ء میں نئے سال کے پہلے دن، جس روز ”نارتھ امریکن فری ٹریڈ ایگریمنٹ“ (NAFTA) عمل میں آیا اسی روز میکسیکو کی ریاست چیپاس کے کسانوں نے ڈیپٹھانیشیل لبریشن آرمی کی مدد سے ارد گرد کی آبادیوں پر قبضہ کر لیا۔ میکسیکو کی فوج نے اس کے خلاف نہایت سخت جوابی کارروائی کی۔ اسن دامن کی صورتحال بذ سے بدتر ہوتی چلی گئی۔ جیسے جیسے تنازعہ بڑھتا گیا NAFTA کے لیے جس کی لگامیں واشنگٹن کے ہاتھ میں تھیں اس تجارتی معاہدہ پر عملدرآمد ناممکن ہوتا چلا گیا۔ یہ حسن اتفاق بھی ہو سکتا ہے اور نہیں بھی۔ شاید تو اسے حسن اتفاق ثابت کرتے نظر نہیں آتے۔ ڈیپٹھانیشیل بغاوت آج بھی جاری ہے اور سکول آف امریکا کی فہرست میں میکسیکن اندراج بڑھتا جا رہا ہے۔

سالوں کے اعتبار سے طلباء کی تعداد کی مندرجہ ذیل فہرست سے آپ بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں۔

1994ء میں 15، 1995ء میں 24، 1996ء میں 148، 1997ء میں 333 اور 1998ء کے آغاز تک 219-1998ء تک میکسیکو کے پاس ”سکول آف امریکا“ کے تربیت یافتہ افران کی خاصی تعداد ہو چکی تھی۔ ”سکول آف امریکا“ کے ان نئے تربیت یافتہ ”ماہرین“ نے جلد ہی ایک ”قابض فوج“ بنا لیا ”چیپاس“ کو فوجی نظام کے تحت لے آئی۔ یہاں اس نے فوجی کمپ قائم کئے جہاں تشدد اور قتل و غارت کیا جاتا تھا۔ مقامی لوگوں کو گھر سے بے گھر کرنا اور تحریکوں کو باجبار کاوشیں کھڑی کر کے روکنا ان کے روزمرہ معمولات کا حصہ تھا۔

ستمبر 1996ء میں بنیاد پرست مذہبی گروپوں کے دباؤ کے تحت پینٹاگون ہسپانوی زبان کے سات تربیتی کتابچے منظر عام پر لانے پر مجبور ہو گیا جو 1991ء تک ”سکول آف

امریکا“ میں پڑھائے جاتے تھے۔ ”نیویارک ٹائمز“ نے اس حوالہ سے اپنے ایک ادارہ میں لکھا۔

”آج امریکی خود اپنی آنکھوں سے وہ حزب الاخلاق اسباق پڑھ سکتے ہیں جو 1980ء کے دوران ”سکول آف امریکا“ میں امریکی فوج نے ہزاروں لاطینی فوجیوں اور پولیس افسروں کو پڑھائے ہیں۔ بیٹھاگون کی جانب سے حال ہی میں جاری ہونے والے ”سکول آف امریکا“ کے تربیتی کتابچے میں تفتیش اور تحقیقات کے دوران تشدد کے طریقے سکھانے کے ساتھ ساتھ جس سے پوچھ گچھ کی جارہی ہو اس کے رشتہ داروں کی گرفتاری، اسے مختلف طریقوں سے بلیک میل کرنے اور اذیت ناک سزائیں دینے کی سفارش بھی کی گئی ہے۔“

”سکول آف امریکا“ کے کئی فارغ التحصیل فوجی انقلابات برپا کر چکے ہیں۔ ”واشنگٹن پوسٹ“ کی 1968ء میں منظر عام پر آنے والی رپورٹ میں ایسے کئی چونکا دینے والے افشاءات ہیں۔ یہ سکول پورے لاطینی امریکہ میں ”انقلابات کا سکول“ کے نام سے مشہور ہے اس کے علاوہ قتل و غارت، انسانی حقوق کی خلاف ورزیاں اور پرتشدد کارروائیاں بھی اس کی پہچان ہیں۔ اس کے کھاتے میں بے شمار قتل ہیں جن میں سے چند ایک چبھ چبھ واقعات کا تذکرہ ضروری ہے۔ کولمبیا میں ارباب قتل عام ایل موزوٹ قتل عام آرچ بشپ آسکر دومیر کا خفیہ قتل امریکی جرج کی چار خواتین کا بے رحمی کے بعد قتل ایل سیلواڈور میں جیسوٹ قتل عام پیرو میں لاکھ قتل عام چلی میں اقوام متحدہ کے کارکنوں پر تشدد کے بعد قتل وغیرہ۔

دسمبر 1981ء میں ایل سیلواڈور کے دیہات ایل موزوے میں نہایت وحشیانہ تشدد کے بعد تقریباً ایک ہزار افراد کو قتل کر دیا گیا جن میں زیادہ تر بوڑھے عورتیں اور بچے تھے۔ خون ریزی کرنے والے بارہ سپاہیوں میں سے دس ”سکول آف امریکا“ کے فارغ التحصیل تھے۔

اسی طرح نومبر 1989ء میں جیسوٹ کے چھ پادریوں اور دو عام شہریوں کے قتل کے حوالے سے روتھ کمیشن نے انکشاف کیا کہ اس وحشیانہ کارروائی میں شریک 26 افراد میں سے 19 ایل سیلواڈور کے وہ آفیسر تھے جو ”سکول آف امریکا“ کے تربیت یافتہ تھے۔

سکول آف امریکا کے تربیت یافتہ طالب علموں کے ہاتھوں ہونے والی زیادتیوں اور ظلم و بربریت کی مکمل تصویر کبھی بھی سامنے نہیں آ سکے گی کیوں کہ لاطینی امریکی فوج کے ارکان عام طور پر قانون سے بالاتر ہوتے ہیں۔ ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا ہے کسی جرم میں ملوث ان ارکان کے خلاف تحقیقات ہوئی ہوں اور یہ تو اس سے بھی کم ہوتا ہے کہ ان کا مشتبہ افراد کی حیثیت سے نام ظاہر کیا جائے۔

”سکول آف امریکا“ ہمیشہ یہ دعویٰ کرتا ہے کہ وہ اپنے طلباء کو یہ نہیں سکھاتے کہ تشدد کس طرح کرنا ہے، اذیت رسانی کے لیے کونسے طریقے استعمال کرنے ہیں یا انسانی حقوق کی خلاف ورزیاں کیسے کرنی ہیں مگر جب اس کے تربیتی کتابچے منظر عام پر آنے سے دودھ کا دودھ اور پانی پانی ہو گیا تو اس نے ایس او ایلے نے ایکدم بیان بدلتے ہوئے کہا کہ سارا کورس تبدیل کر دیا گیا ہے۔

1996ء کے کورس کی فہرست ملاحظہ فرمائیے 42 کورسوں میں سے صرف ایک جمہوریت اور انسانی حقوق کے حوالے سے ہے جس کا نام ہے ”جمہوریت اور انسانی حقوق کے مسائل“۔ 1997ء میں صرف 13 طلباء نے یہ کورس اختیاری مضمون کی حیثیت سے پڑھا جبکہ 118 طلباء نے ”ملٹری اٹلی جنس“ کا انتخاب کیا۔ انسانی حقوق کے حوالے سے کورس کا دورانیہ دیگر کورسز کے مقابلے میں نہایت ہی کم رکھا گیا ہے۔ ”سکول آف امریکا“ میں یہ کورس پڑھانے والے استاد ”چارلس کال“ کا کہنا ہے کہ سکول میں انسانی حقوق کی تعلیم کو سنجیدگی سے نہیں لیا جاتا بھی وجہ ہے پورے تربیتی کورس کے دوران طلباء کی نہایت ہی معمولی تعداد یہ مضمون پڑھنا پسند کرتی ہے۔

رسائی

کئی دہائیوں پر مشتمل بے تحاشا پبلیٹی، دن بدن بڑھتے ہوئے مسلح احتجاج، ہزاروں گرفتاریوں اور تیزی سے کم ہوتی ہوئی کانگریس کی حمایت کے باوجود بھی کیا پیٹھا گون ”سکول آف امریکا“ کے ساتھ چنار رہے گا؟ اس کے ساتھ تعلقات قائم رکھے گا اور اس پر انحصار کرتا رہے گا؟ ایسی کوئی اہم چیز ہے جس نے امریکی فوج کو اس حد تک بے شرم بنا دیا ہے؟ اس کا جواب ذرا تفصیل مگر نہایت واضح ہے۔ سکول آف امریکا اس کے طلباء اور ان کے ساتھ

ساتھ دنیا بھر کے ممالک میں امریکی ہتھیاروں کی ترسیل کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ امریکی خارجہ پالیسی کے ایک خاص پہلو کا حصہ ہیں۔ یہ پہلو ”رسانی“ کہلاتا ہے۔ دنیا کے وہ ممالک جو امریکی افواج کو اپنے ہاں بیٹھنے کیلئے فوجی اڈہ بنانے کی اجازت نہیں دیتے وہاں فوجی ساز و سامان کی ترسیل کے ساتھ ساتھ نہ امریکی ماہرین تکنیک کاروں اور انسٹرکٹرز کو لازمی ضرورت کی حیثیت سے بھیج کر اپنا مقصد حاصل کر لیا جاتا ہے۔ گویا فوجی ساز و سامان کی آڑ میں ان ممالک میں اپنی فوجیں داخل کی جاتی ہیں۔

اس سلسلے میں امریکی سینٹرل کمانڈ کے کمانڈر انچیف جنرل ”ٹامس شواریز کوف“ کا کانگریس کے سامنے دیا جانے والا بیان شہادت کی حیثیت رکھتا ہے۔

”ہم مختلف ممالک کو سلامتی کے حوالے سے جو مدد فراہم کرتے ہیں یہی ہمارے لیے وہاں تک ”رسانی“ کا سب سے اہم ذریعہ ہے۔ اگر ہمارے دوست اس مدد کی اجازت نہ دیں تو ہمارے لیے امریکی افواج کو اپنے مطلوبہ علاقے تک پہنچانا ممکن نہیں اور نہ ہی ہم ایک خاص وقت تک اپنی فوجوں کو وہاں رکھ سکتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ اگر ہمارا فوجی اعانت کا پروگرام ختم کر دیا جائے تو دنیا پر ہمارا دباؤ اور اثر ختم ہو کر رہ جائے گا۔ اور ہم واپس اسی مقام پر آ جائیں گے جہاں ہمارے پاس ہتھیاروں کے استعمال اور دشمن پر قابو پانے کے نہایت ہی کم مواقع رہ جائیں گے۔ ہماری حکمت عملی کا دوسرا اہم پہلو ”موجودگی“ ہے۔ یہ علاقے کے استحکام کے حوالے سے امریکی مفادات اور کارگزاریوں کو ظاہر کرتی ہے۔ امریکی سینٹرل کمانڈ کی حکمت عملی کا تیسرا پہلو ”مشترکہ فوجی مشقیں“ ہے۔ یہ بھی علاقہ کے حوالے سے ہماری ذمہ داریوں اور فیصلوں کا اظہار ہوتی ہیں۔ یہ تعاون کو بڑھاتی ہیں اور اپنے دوستوں کے ساتھ اتحاد و یکجہت کی فضا میں کام کرنے سے ہماری صلاحیتوں میں اضافہ ہوتا ہے۔“

پس ثابت ہوا کہ امریکی فوجی امداد فوجی مشقیں اور بحری بندرگاہوں کے دورے وغیرہ سکول آف امریکا کی طرح قریبی تعلقات قائم رکھنے کے لیے بار بار مواقع فراہم کرتے

ہیں۔ یہاں تک کہ امریکی افسروں اور غیر ملکی فوجی شخصیات کے درمیان جو ملاقاتیں ہوتی ہیں ان میں ان ہزاروں غیر ملکیوں کے بارے میں مکمل معلومات پر مشتمل فائلیں تیار کرنے کا موقع مل جاتا ہے اسی طرح زبان سیکھنے کے ساتھ علاقے کی تصاویر اور نقشہ جات کا حصول بھی ممکن ہو جاتا ہے۔ قصہ مختصر یہ کہ ذاتی تعلقات و ذاتی معلومات سے لے کر ملک کے تجزیاتی معائنہ اعداد و شمار حکومت کی تبدیلی کی صورت میں کل آٹاٹے، حکومت کی تبدیلی کو روکنے کی صورتحال کا جائزہ، ممکنہ انقلاب اور انقلاب کی ناکامی یا پھر ممکنہ حملہ کی صورتحال کے جائزہ تک تمام معلومات حاصل کر لی جاتی ہیں۔

امریکی فوج کی موجودگی نہ صرف اشتراک اور شراکت کا مقصد پورا کرتی نظر آتی ہے بلکہ یہ ”سکول آف امریکا“ میں تربیت حاصل کرنے والے امیدواروں کے انتخاب میں بھی مدد دیتی ہے جو صرف لاطینی امریکہ ہی نہیں بلکہ ان مختلف ممالک کے ہزاروں فوجی اور پولیس افسران بھی ہوتے ہیں جو امریکہ کے دوسرے فوجی سکولوں میں تربیت کے حصول اور تعلیمی قابلیت میں اضافہ کرنے کے لیے آتے ہیں۔ اس طریقہ سے رسائی کا کام خود بخود آسان ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ترقی کی خاطر انتہائی معلومات کے حصول کے لیے اور پیشہ ورانہ قابلیت بڑھانے کے لیے ایک فوج کے دوسری فوج کے ساتھ رابطے کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے بلکہ معمول کا حصہ ہیں۔ خواہ امریکہ اور ان فوجی طلباء کے ممالک کے درمیان۔ غارتی تعلقات خراب ہی کیوں نہ ہوں جیسے کہ گذشتہ سالوں میں الجزائر، شام اور لبنان کے ساتھ رہے مگر ان سرد تعلقات کو فوجی رابطوں میں اس لئے رکاوٹ نہیں بنایا جاتا کہ یہ تعلقات ”رسائی“ کے حوالے سے بے پناہ اہمیت کے حامل ثابت ہوتے ہیں۔

تاریخی طور پر یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ فوج کے فوج کے ساتھ مضبوط اور قریبی تعلقات بالآخر شہری اداروں کی تباہی اور انسانی حقوق کی سنگین خلاف ورزیوں کا باعث بنتے ہیں جیسا کہ لاطینی امریکہ میں ہوا یہی وجہ ہے کہ اب وہاں کی نوآبادیہ جمہوری حکومتیں اپنی فوجوں کو پیرکوں تک محدود رکھنے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔

اصلاح شدہ جدید سکول آف امریکا

1999ء میں کانگریس کی جانب سے ”سکول آف امریکا“ کے لیے مختص فنڈز کی

فراہمی روکنے کے فیصلہ نے محکمہ دفاع کو پریشان کر دیا۔ اس سے قبل فیصلہ کو قانون کی شکل دے کر اس پر عملدرآمد ہوتا محکمہ دفاع نے نومبر میں ہنگامی اعلان کیا کہ سکول کے حوالے سے وہ 2000ء کے موسم بہار میں کچھ اہم تبدیلیاں کر رہے ہیں جن کے مطابق سکول میں فوجی تربیت سے زیادہ تعلیم پر توجہ دی جائے گی فوجیوں کے ساتھ ساتھ عام شہریوں کو بھی داخلہ دیا جائے گا، جمہوری اصول بھی پڑھائے جائیں گے اور اس کا نام تبدیل کر کے ”سینئر فار ایٹر امریکن سکیورٹی کارپوریشن“ رکھ دیا جائے گا وغیرہ وغیرہ۔

اس کے باوجود یہ سوال بدستور جواب طلب ہے کہ آخر اس سکول کو قائم رکھنے کی کیا ضرورت ہے؟ کیا یہاں اور لاطینی امریکہ میں ضرورت کے مطابق کافی تعداد میں معیاری تعلیمی ادارے موجود نہیں ہیں؟ جب امریکیوں کے لیے یونیورسٹی کی تعلیم مفت نہیں ہے تو ہم غیر ملکوں کو کیوں فراہم کر رہے ہیں؟ اس کے جواب میں ”رسائی“ کا وہی عنصر کارفرما ہے جو تبدیلی نہیں ہونے دیتا۔ جہاں تک اس افسانہ کا تعلق ہے کہ فوجیوں کے ساتھ عام شہریوں کو بھی داخلہ دیا جائے تو اس سلسلے میں یہ حقیقت واضح کر دینی ضروری ہے اور آنے والا وقت یہ ثابت بھی کر دے گا کہ حال اور مستقبل کے وہی سیاستدان اور رہنما یہاں داخلہ لے کر ”تعلیم اور تربیت“ حاصل کریں گے جن کی اتنی رسائی ہوگی۔

امریکہ میں غیر ملکوں کی فوجی تربیت کے سلسلہ میں بے شمار سہولیات ہر قسم کے حالات میں موجود رہیں گی جبکہ بیٹھاگون کی جانب سے بیرون ملک فراہم کی جانے تربیت اس کے علاوہ ہے۔

دفتر برائے عوامی تحفظ

1960ء کے آغاز سے 1970ء کے وسط تک امریکی دفتر برائے عوامی تحفظ (امداد کا ایک حصہ) پہلے پانامہ اور پھر واشنگٹن میں بین الاقوامی پولیس اکیڈمی کے نام سے تربیتی ادارہ چلاتا رہا۔ اس نے غیر ملکی پولیس افسران کے لیے وہی خدمات سرانجام دیں جو ”سکول آف امریکا“ فوج کے لیے دیتا ہے۔ دفتر برائے عوامی تحفظ نے تیسری دنیا کے مختلف ممالک کے دس لاکھ سے زائد پولیس اہلکاروں کو تربیت دی جن میں سے دس ہزار کو واشنگٹن میں مزید تربیت کے لیے منتخب کیا گیا۔

”سکول آف امریکاز“ کے تربیت یافتہ فوجیوں کی نسبت ”دفتر برائے عوامی تحفظ“ سے فارغ التحصیل پولیس اہلکار انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں میں زیادہ تعداد میں ملوث پائے گئے۔ اس کا سبب ان کا عوام الناس سے زیادہ قریبی تعلق اور رابطہ ہو سکتا ہے۔

پولیس کو ہتھیار گولہ بارود ریڈیو پٹرول کاریں آنسو گیس گیس ماسک ڈنڈے اور ہجوم کو قابو میں رکھنے کے مختلف آلات کی فراہمی بھی دفتر برائے عوامی تحفظ کی جانب سے کی جاتی۔ خفیہ قتل کے حوالے سے خصوصی تربیتی کورس میں اس سلسلہ میں استعمال ہونے والے ہتھیاروں کی ساخت اور ڈیزائن سے لے کر ان کے استعمال تک کی ہدایات شامل ہوتی تھیں۔ لاس فریموس، ٹیکساس کے ”بم سکول“ میں بموں کے بارے میں مکمل معلومات فراہم کی جاتیں۔ بم کورسز کی وضاحت دفتر کے ایک افسر نے ان الفاظ میں کی کہ ”پولیس کے اہلکاروں کو اس تربیت کی اس لیے ضرورت ہے کہ اگر دہشت گرد بم رکھ دے تو اس سے نمٹ سکیں“

مزے کی بات یہ ہے کہ اس کورس میں بم سازی اور بم کے استعمال کی ہدایات تو نظر آتی ہیں مگر یہ کہیں نہیں بتایا گیا کہ بم کو ناکارہ کس طرح بنایا جاتا ہے۔

امریکی خارجہ پالیسی کے منفی ”کارناموں“ پر بڑھتی ہوئی تنقید کو دیکھتے ہوئے کانگریس نے 1975ء میں عوامی تحفظ کا پروگرام ختم کر دیا مگر انتظامیہ برائے اجزاء ادویات نے ایف بی آئی اور محکمہ دفاع کی مدد سے اس پروگرام کو جاری رکھا۔ اور یہ آج بھی جاری ہے۔

برازیل

”دی اسکولا سپریریئر ڈی گیرا“ نامی دار کالج 1949ء میں ریو ڈی جینیرو میں قائم ہوا۔ اس کالج نے امریکہ کو ”سکول آف امریکاز“ کے طلباء کی طرح برازیلی افسروں سے اسی قسم کی سیاسی ذہنیت کے ساتھ تعلقات قائم کرنے کی اجازت دی۔ اس حوالے سے لاطینی امریکہ کے مؤرخ ٹامس ای سکڈمور کا مشاہدہ ملاحظہ کیجئے۔

”1950ء کے آغاز میں امریکہ اور برازیل کے مابین ایک فوجی معاہدہ کے نتیجے میں امریکی فوج کو دار کالج کے انتظام و انصرام کے حوالے سے مکمل اختیارات حاصل ہو گئے

جیسے نیشنل وار کالج واشنگٹن کی طرز پر چلایا جانے لگا۔ یہ حقیقت ہے کہ برازیل کا یہ وار کالج دیکھتے ہی دیکھتے برازیل کی عوامی حکومت کی مخالف اہم فوجی شخصیات کا مرکز بن گیا۔ یہ بھی دیکھنے میں آیا کہ امریکی افسران کے ساتھ مسلسل اور فوری رابطوں کی وجہ سے یہاں اشتراکیت مخالف نظریہ بہت جلد مستحکم ہوا اور اس کے ساتھ ساتھ سیاست مخالف رویوں میں بھی حد بندیاں قائم ہوئیں۔“

مارچ 1964ء میں امریکی سفیر لنکن گورڈن نے امریکی فوجی امداد کے پروگرام کی محکمہ خارجہ کے نام ایک تاریخ میں اس طرح وضاحت کی کہ ”یہ مسلح افواج کی اہم شخصیات کے ساتھ قریبی تعلقات قائم کرنے کے سلسلہ میں اہم ترین ہتھیار ہے اور ایک بے حد اہم حقیقت یہ ہے کہ اس کی وجہ سے برازیلی فوج میں امریکہ کے حامیوں کی تعداد میں مستقل اضافہ ہو رہا ہے۔“

یہ تاریخچے کے صرف چند ہفتوں کے بعد ہی برازیلی فوج نے عوامی حکومت کا تختہ الٹ دیا۔ برازیل کی یہ عوامی حکومت کافی عرصہ سے امریکہ کی ہٹ لسٹ پر تھی۔

ہمارے اور انکے جنگی مجرم

۷

امریکی محکمہ انصاف نے 3 دسمبر 1996ء کو سولہ جاپانیوں کے ناموں کی فہرست جاری کی جس کے مطابق دوسری جنگ عظیم میں ان کے سنگین جرائم کے سبب امریکہ میں ان کے داخلے پر پابندی عائد کر دی گئی۔ ان میں سے کچھ کے بارے میں محکمہ انصاف کا کہنا تھا کہ یہ اس بدنام زمانہ ”یونٹ 731“ کے ارکان ہیں جس نے ہزاروں جنگی قیدیوں اور شہریوں پر جان لیوا تجربات کیے۔ جن میں بے شمار زندہ انسانوں کی چیر پھاڑ جیسا غیر انسانی فعل سرفہرست تھا۔ جنگ کے خاتمے کے بعد یونٹ 731 پروگرام کے انچارج جنرل شیراوشی کو جس نے امریکی سپاہیوں پر بے شمار تجربات کئے تھے اپنے ساتھیوں کے ہمراہ اس شرط پر رہائی ملی کہ وہ امریکہ کو اپنے تمام تجربات کی مکمل تفصیلات فراہم کرے گا اور اس کے ساتھ ساتھ امریکی جرائم کو تاحیات دنیا سے پوشیدہ رکھے گا۔ امریکی سائنسدانوں اور فوجی افسران کی جانب سے اپنی اس پالیسی کی صفائی میں ہمیشہ کی طرح یہ کہا گیا کہ ”وسیع تر قومی مفاد اور قومی سلامتی“ کی خاطر یہ قدم اٹھایا گیا ہے۔

”یونٹ 731“ کے ارکان کی اس فہرست کے حوالے سے محکمہ انصاف کی منافقانہ پالیسی کو مد نظر رکھتے ہوئے ذرا ایک لمحہ کے لیے سوچئے کہ اگر دنیا کے مختلف ممالک ”جنگی“ اور ”انسانیت سوز جرائم“ میں ملوث امریکیوں کی فہرست جاری کرتے ہوئے اپنے یہاں داخلہ پر پابندی عائد کریں تو اس میں کن کن امریکیوں کے نام شامل ہوں گے۔ آئیے ذرا ایک نظر اس فہرست پر بھی ڈال لیں۔

ولیم کلنٹن

امریکی صدر جن جرائم کے مرتکب ہیں ان میں یوگوسلاویہ پر 78 دن اور رات تک وحشیانہ بمباری جس سے سینکڑوں جانیں ضائع ہوئیں اور جو تاریخ کی عظیم ہلاکتوں میں سے ایک تھی، عراق پر بے رحمانہ اور غیر انسانی پابندیاں اور شہریوں پر راکٹوں کے شدید حملے صومالیہ، بوسنیا، سوڈان اور افغانستان پر قطعی غیر جواز غیر قانونی اور وحشیانہ بمباری جیسی سنگین کارروائیاں نمایاں ہیں۔

جنرل ویسلے کلارک

یورپ میں اتحادی فوجوں کے کمانڈر جنرل ویسلے کلارک کی ہدایات کے مطابق نیٹو نے یوگوسلاویہ کو جس طرح وحشیانہ بمباری کا نشانہ بنایا اسے دیکھتے ہوئے ایسا لگتا ہے کہ وہ اپنی جگہ سے اٹھتا ہو گا اور میز پر مکا مارتے ہوئے کہتا ہو گا مجھے اس مہم میں زیادہ سے زیادہ تشدد چاہیے۔ ختم کر دو سب کچھ ابھی اور اسی وقت.....

جارج بش

40 دن اور رات کی وحشیانہ بمباری کے نتیجہ میں لاکھوں بے گناہ اور معصوم عراقی شہریوں کا قتل عام جن میں ہزاروں کی تعداد میں بچے شامل ہیں عراق پر خوفناک پابندیاں پانامہ پر بلا جواز اور غیر قانونی مسلسل بمباری جس کے نتیجہ میں بے شمار ہلاکتیں ہوئیں تباہی و بربادی محل میں آئی جیسے جرائم میں امریکی صدر بش ملوث ہیں۔

جنرل کولن پاول

چیئر مین جوائنٹ چیف آف سٹاف کے جرائم کی فہرست بے حد طویل ہے پانامہ اور عراق پر حملوں کے سلسلہ میں نمایاں کردار عراق میں ایٹمی ری ایکٹر اور حیاتیاتی اور کیمیائی پلانٹ کی تباہ کاری تاریخ میں پہلی بار ایک زندہ ایٹمی ری ایکٹر کو بمباری کا نشانہ بنا کر نہایت خطرناک مثال قائم کی گئی اقوام متحدہ کی آئینہ باز سے عراق پر جاری امریکی بمباری کو ایک ماہ گزر جانے کے بعد اقوام متحدہ نے ایک قرارداد منظور کی جس کے ذریعہ مشرق وسطیٰ پر جاری فوجی حملوں میں ایٹمی تنصیبات کو نشانہ بنانے پر پابندی عائد کر دی گئی۔ عراق میں تباہی و بربادی

کے دوران پاؤں کی خوشی دیدنی تھی۔ ایٹمی ری ایکٹرز کی تباہی پر اس نے خوشی سے دیوانہ ہوتے ہوئے اعلان کیا تھا کہ ”دونوں کارآمد زندہ ری ایکٹرز ختم کر دیئے گئے ہیں جس کا مطلب ہے کہ وہ شکست کھا گئے ہیں۔ وہ ختم ہو گئے ہیں۔ اب کچھ نہیں رہا۔“ اسے عراقیوں سے ان کی زندگیاں چھین لینے والا وحشی کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ دوران جنگ بے شمار عراقیوں کی ہلاکتوں کے بارے میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے اس ”مہذب“ جرنیل نے کہا کہ ”یہ کوئی اتنی بڑی تعداد نہیں ہے کہ میں اس حوالے سے پریشانی کا اظہار کروں یا اس میں خواخواہ دلچسپی لوں۔“

ویتنام میں جنگی جرائم کے حوالے سے اس کے کردار کو دیکھا جائے تو یہ اسی بریگیڈ کے دستے کا ”کارنامہ“ تھا جس نے مائی لائی میں قتل عام کیا تھا۔

جنرل نارمن شیوارزکوف

امریکی سینٹرل کمانڈ کے کمانڈر انچیف نے جو جرائم کیے ان میں سے اہم یہ ہیں عراق میں خوزیری کے سلسلہ میں بے رحمانہ فوجی رہنمائی کی اور جنگ بندی کے باوجود مزید دو روز تک اس لیے خوزیری جاری رکھی کہ عراقیوں سے ہتھیار ڈال لے جائیں۔

رونا لڈریگن

سابق امریکی صدر کے جرائم جن کی وجہ سے ان کا نام اس فہرست میں شامل ہوگا۔ ایل سیلوڈور گونسٹے مالا نکاراگوا اور گریناڈا کی عوام کے مستقبل کو تباہ و برباد کر کے 8 سال تک انہیں موت، دہشت اور تشدد کا شکار بنانا، لیبیا، لبنان اور ایران پر وحشیانہ بمباری ہو سکتا ہے کہ وہ یہ سب اپنی ”بیماری“ کے باعث ”بھول“ گئے ہوں مگر دنیا کو سب کچھ بہت اچھی طرح سے یاد ہے۔

ایلیٹ ابراہمز

ریگن کے دور حکومت میں نائب سیکرٹری خارجہ ایلیٹ ابراہمز کے جرائم بھی کم نہیں ہیں۔ اس نے جھوٹ کی بنیاد پر ایک نئی تاریخ رقم کرنے کا کام کیا۔

نکاراگوا میں جاری زیادتیوں وسطی امریکہ میں امریکی حلیفوں کی جانب سے ہونے والے ظلم و ستم پر پردے ڈالتے ہوئے ان کی امداد جاری رکھنا اور جھوٹ کے ذریعہ سے

ان کی کارروائیوں کو جواز فراہم کرتے ہوئے ان کے لیے حمایت حاصل کرنا اسی کا ”کارنامہ“ تھا۔ اس نے حقائق کو اس طرح توڑ مروڑ کر رکھ دیا کہ خود اس کے الفاظ میں ”جب تاریخ لکھی جائے گی تو ظلم و ستم اور زیادتیوں میں ملوث ہمارے حلیف ہیرو کی صورت میں سامنے آئیں گے۔“

کیسپر وین برگر

ریگن حکومت میں سات سال تک سیکرٹری دفاع کے منصب پر فائز رہنے والے کیسپر وین برگر کے جرائم پر بھی ایک نظر ڈالیے۔

دسٹی امریکہ میں امریکہ کی جانب سے روا رکھے جانے انسانیت سوز مظالم کی ذمہ داری کیسپر وین برگر پر عائد ہوتی ہے۔ 1986ء میں لیبیا میں بمباری کرائی۔ جارج بش بے شک ایران کو ٹراکیس میں اسے معاف کر دیں لیکن اس کے جنگی جرائم کی معافی ممکن نہیں ہے۔

لیفٹیننٹ کرنل آلیور ناتھ

ریگن انتظامیہ کی قومی سلامتی کونسل سے منسلک لیفٹیننٹ کرنل آلیور ناتھ کا نکار اگوا میں ہونے والی زیادتیوں کے سلسلے میں اہم کردار تھا۔ گریٹا ڈا پر حملہ کی منصوبہ بندی میں وہ ایک اہم فریق کی حیثیت سے شریک تھا جس کے نتیجے میں سینکڑوں بے گناہ شہری جان سے مارے گئے۔

ہنری کسنجر

کسنجن انتظامیہ کے قومی سلامتی کے مشیر اور کسن اور فورڈ انتظامیہ میں سیکرٹری خارجہ ہنری کسنجر کے پاس تین اعزاز ہیں دانشور امن کا نوبل انعام یافتہ اور جنگی مجرم۔ اس کے جرائم کی فہرست ملاحظہ فرمائیے۔ انگولا، چلی، مشرقی تیمور، عراق، ویتنام اور کیمبوڈیا میں امریکی مداخلتوں کے سلسلے میں اس نے عیارانہ اور اخلاق سے گرا ہوا کردار ادا کرتے ہوئے ان ممالک کی عوام کو ناقابل بیان خوف، دہشت اور مصائب میں مبتلا کر دیا۔

جیرالڈ فورڈ

امریکی صدر جس نے مشرقی تیمور کی عوام کو کچلنے کے لیے انڈونیشیائی حکومت کو ہتھیار فراہم کر کے چوتھائی صدی پر مشتمل انسانیت سوز کارروائیوں کا آغاز کیا۔

رابرٹ میک نمارا

کینیڈی اور جانسن انتظامیہ میں سیکرٹری دفاع رابرٹ میک نمارا انڈوچائنا خون خرابے کی ابتداء سے لے کر زیادتیوں کی انتہا تک اس کا خالق اور ذمہ دار تھا۔ اس کے علاوہ پیرو میں عوامی تحریکوں کو جس پر تشدد انداز میں کچلنے کا کام کیا یقیناً وہ قابل معافی نہیں۔

جنرل ولیم ویسٹ مور لینڈ

چیف آف آرمی سٹاف جنرل ولیم ویسٹ مور لینڈ کی سربراہی میں ویتنام میں بے شمار جنگی جرائم ہوئے۔ 1971ء میں امریکی چیف پرائیکوٹر ”ٹیلیفورڈ ٹیلر“ نے جنگ عظیم دوم اس کے علاوہ پیرو میں عوامی تحریکوں کو جس پر تشدد انداز میں کچلنے کا کام کیا یقیناً وہ قابل معافی نہیں۔

جنرل ولیم ویسٹ مور لینڈ

چیف آف آرمی سٹاف جنرل ولیم ویسٹ مور لینڈ کی سربراہی میں ویتنام میں بے شمار جنگی جرائم ہوئے۔ 1971ء میں امریکی چیف پرائیکوٹر ”ٹیلیفورڈ ٹیلر“ نے جنگ عظیم دوم کے بعد بننے والے ”نیوریرگ ٹریبونل“ کے سامنے ”یماہیٹا کس“ کا حوالہ دیتے ہوئے جنرل ویسٹ مور لینڈ پر الزام عائد کرتے ہوئے اسے ذمہ دار قرار دیا۔ ”یماہیٹا کس“ میں دوسری جنگ عظیم کے بعد امریکی آرمی کمیشن نے جاپانی جرنیل ”ٹومایو کی یماہیٹا“ کو اس الزام کے تحت پھانسی دی تھی کہ اس کے فوجی دستوں سے فلپائن میں ظلم اور زیادتیوں کا بازار گرم رکھا۔ کمیشن نے اپنے فیصلہ میں کہا کہ سینئر کمانڈر کی حیثیت سے ”یماہیٹا“ کی ذمہ داری تھی کہ وہ ان زیادتیوں کو روکے مگر اس نے ایسا نہیں کیا اس لیے یہ ہی اصل مجرم ہے۔ اگر کسی کو مجرم ٹھہرانے کے لیے یہ الزام ہی کافی ہے تو ہم سمجھتے ہیں کہ بالکل یہی فیصلہ جنرل پاؤل اور جنرل شوارز کوف کے خلاف بھی ہونا چاہیے ان پر بھی یہی قانون لاگو ہونا چاہیے۔ اس الزام کے

خلاف اپنی صفائی میں برہمچاری نے یہ ثبوت اور شہادتیں بھی کمیشن کے روبرو پیش کر دی تھیں کہ اپنے فوجی دستوں کو قابو میں رکھنے کے لیے اس کے پاس موثر رابطہ اور پیغام رسانی کے ذرائع کی کمی تھی لیکن اس کے باوجود اسے پھانسی دے دی گئی۔ اس واقعہ اور فیصلہ کی روشنی میں ٹیلر کا موقف یہ تھا کہ ہیلی کاپٹرز اور رابطہ پیغام رسانی کے جدید ترین ذرائع کی موجودگی میں ویسٹ مورلینڈ اور اس کے کمانڈرز کو اس مسئلہ کا بھی سامنا نہیں تھا۔

سے

بمباری کا جرم

جیسا کہ بمباری کے باب میں ذکر کیا گیا ہے کہ شہریوں پر ہونے والی فضائی بمباری پر نہ تو کوئی الزامات عائد کیے گئے نہ ہی اس سلسلے میں کوئی سزائیں دی گئیں۔ اسے دوسری جنگ عظیم کی میراث کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ نورمبرگ اور ٹوکیو کے عدالتی فیصلے بھی اس سلسلے میں خاموش ہیں کیونکہ شہری ہلاکتوں اور تباہی کا کھیل دونوں جانب سے برابر کی سطح پر کھیلا گیا اور ان سے زیادہ ان کے حلیفوں نے اس خوفناک کھیل میں کامیابیاں حاصل کیں۔ جرموں یا جاپانیوں کے خلاف ایسے الزامات عائد کرنے کے لیے کوئی بنیاد نہیں تھی اور سچ تو یہ ہے کہ ایسے الزامات عائد کیے بھی نہیں گئے۔

یہاں ”ٹیلیگراف ٹیلر“ کا یہ سوال نہایت اہمیت کا حامل ہے جو ہوائی جہازوں کے ذریعہ شہریوں پر ہونے والی بمباری کے حوالے سے اس نے کیا تھا کہ

”کیا اس بات سے کوئی فرق پڑتا ہے کہ گود کا بچہ فضا میں اڑنے والے جہاز کی بمباری سے ہلاک ہوا ہے یا زمینی فوج کی اندھی فائرنگ سے؟ جرم تو دونوں کا ایک ہے مگر اس بارے میں یہ وضاحت کی جاتی ہے کہ ہوا باز کا اس سلسلہ میں کردار زمینی سپاہی کے مقابلہ میں قطعی غیر شخصی ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس وضاحت کو نفسیاتی طور پر درست مان لیا جائے لیکن اخلاقی طور پر اسے ہرگز درست تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔

کسی کے لیے یہ سوچنا بھی ممکن نہیں کہ وہ تصور وار ہو سکتے ہیں..... وہ تو صرف اور صرف محبت وطن ہیں۔

صحافی تھیر نے 1997ء میں موت و حیات کی کشمکش میں بتلا پول پوٹ سے ایک انٹرویو کیا جس کے اختتامی حصہ سے ایک چھوٹا سا اقتباس قارئین کی دلچسپی کے لیے پیش ہے۔

نیٹ تھیر: ”کیا آپ اپنی زیادتوں کی معافی مانگنا چاہیں گے؟“
 پال پوٹ: ”میں سمجھ نہیں سکا کیا یہ سوال دوبارہ دہرائیں گے“ پال پوٹ نے اچنبھے میں مبتلا ہوتے ہوئے مترجم کی جانب دیکھا جس نے سوال دوبارہ دہرا دیا۔
 پال پوٹ: ”ہرگز نہیں..... میں آپ پر یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں نے جو کچھ بھی کیا صرف اور صرف اپنے ملک کی خاطر کیا۔“
 انہونی سے کیسے ٹمٹیں؟

دوسری جنگ عظیم کے اختتام پر مشرق بعید کے لیے بین الاقوامی فوجی ٹریبونل قائم کیا گیا۔ ٹوکیو میں سابق جاپانی وزیراعظم ”ہدیکی تو جو“ کے مقدمے کی سماعت کے دوران اس کے وکلاء نے سوال اٹھایا کہ کیا ”تو جو“ کے جرائم ہیروشیما اور ناگاساکی پر گرائے جانے والے ایٹم بموں سے زیادہ سنگین تھے؟ اس پر استغاثہ نے فوری طور پر جاپانی ترجمہ میں مداخلت کرتے ہوئے حکم دیا کہ مقدمہ کی کارروائی کے سرکاری ریکارڈ اور اخبارات کے لیے یہ الفاظ حذف کر دیئے جائیں۔

ایک اور انہونی

1948ء میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں فنائے عام کے جرم کی روک تھام اور اس سلسلے میں سزائوں کے حوالے سے اجلاس منعقد کیا گیا جو عرف عام میں ”فنائے عام کا اجلاس“ کہلاتا ہے۔ اجلاس کے شرکاء نے مکمل اتفاق سے اس بات کو تسلیم کیا کہ ”فنائے عام خواہ زمانہ امن میں ہو یا جنگ میں بین الاقوامی قانون کے مطابق سنگین جرم ہے جس کی روک تھام کے ساتھ اس کے ذمہ داروں کو سزائیں دینے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔“ اس اجلاس میں ”فنائے عام“ کے جرم کی ایک متفقہ تعریف بھی عالمی سطح پر پیش کی گئی جس کے مطابق ”کوئی بھی ایسا جرم جو کسی بھی قومی، لسانی، نسل یا مذہبی گروہ کو مکمل یا جزوی طور پر تباہ کرنے کے ارادہ سے کیا جائے فنائے عام کہلائے گا۔“ فنائے عام کی تعریف کی اس فہرست میں ایک نہایت اہم نکتہ فراموش کر دیا گیا ہے جو موجود دور میں سب سے نمایاں حیثیت کا حامل ہے اور وہ ہے مخالف سیاسی نظریات رکھنے والوں کا قتل عام۔

یہودیوں اور خانہ بدوشوں کے قتل عام کی وجہ سے نازی بہت بدنام ہوئے مگر یہ

حقیقت ہے کہ اٹلی، سپین، یونان، چلی، انڈونیشیا یا ایسے ہی کسی ملک کا ذکر ہو جرمن فسطائیت نہایت واضح طور اشتراکیت کے خلاف تھی۔ (ہٹلر نے ہر موقع پر یہودیوں اور اشتراکیوں سے مساوی سلوک کیا)

جیسا کہ ”مداخلتوں“ کے باب میں اور دیگر ابواب میں ذکر کیا گیا ہے کہ 40ء کی دہائی کے دوران چین سے لے کر فلپائن تک اور 90ء کی دہائی میں کولمبو سے میکسیکو تک امریکہ مستقل طور پر سیاسی قتل عام میں مصروف عمل ہے مگر یہاں اس سلسلے میں یہ کہنا چاہوں گا کہ دنیا کی واحد عظیم طاقت کے ”چیف ایگزیکٹو افسران“ کو قطعی طور پر پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے ان کے اس عمل کے خلاف کہیں کوئی بین الاقوامی اجلاس منعقد نہیں کیا جائے گا نہ ہی امریکی اہلکاروں کو اس سلسلے میں دنیا کی کسی عدالت میں جوابدہ ہونا پڑے گا۔

یوگوسلاویہ میں امریکی جنگی جرائم کا ایک اور مقدمہ جس کا کبھی فیصلہ نہیں ہو گا۔ مارچ 1999ء میں نیٹو نے یوگوسلاویہ پر بمباری کا آغاز کیا تو اس کے ٹھیک دو ہفتوں بعد کینیڈا برطانیہ، یونان اور امریکی تنظیم برائے قانون و انصاف کے بین الاقوامی قانون کے ماہرین نے سابقہ یوگوسلاویہ کے لیے بیگ نیدرلینڈ میں قائم بین الاقوامی فوجداری ٹریبونل کو نیٹو کے خلاف دعوے اور عرضداشتیں پیش کرنا شروع کر دیں جن میں نیٹو ممالک رہنماؤں اور اہلکاروں پر اپنی جرائم کے الزامات عائد کئے گئے تھے جن کے لیے ٹریبونل نے کچھ عرصہ پیشتر سر بیائی رہنماؤں پر فرد جرم عائد کی تھی۔ قانونی ماہرین کی جانب سے لگائے گئے الزامات میں انسانی حقوق کے بین الاقوامی قانون کی سنگین خلاف ورزیاں، قصداً قتل و غارت گری، دیدہ و دانستہ تشدد اور زیادتیاں، انسانیت کو تباہ و برباد کر دینے والے مہک ہتھیاروں کا استعمال، شہری آبادیوں پر غیر قانونی حملے، فوجی مقاصد کے حصول کے لیے بلا جواز غارت گری، عوامی و مقامات، پناہ گاہوں اور رہائشی عمارتوں پر حملے، مذہبی، تعلیمی اور دفائی اداروں کی دانستہ تباہی جیسے جرائم شامل تھے۔

کینیڈا کے دعویٰ میں جن 68 رہنماؤں کو ملزم نامزد کیا گیا ان میں ولیم کلنٹن، میڈلین البرائٹ، ولیم کوہن، ٹونی بلیئر، وزیراعظم کینیڈا جین کرٹین اور نیٹو کے اہلکار جیوزو سولانا، ویسلے کلارک اور جیمی شیپ جیسے نام شامل تھے۔ دعویٰ میں یہ الزام بھی عائد کیا گیا تھا کہ اقوام متحدہ کے چارٹر نیٹو معاہدہ، جینوا کنونشن اور بین الاقوامی فوجداری ٹریبونل، نورمبرگ کے بین الاقوامی قوانین کے اصولوں کی کھلے عام خلاف ورزیاں کی گئی ہیں۔

یہ دعویٰ ان تمام الزامات کو درست ثابت کرنے والی شہادتوں کے ہمراہ دائر کیا گیا جو خاصی معقول تعداد میں تھیں۔ ان شہادتوں کا بنیادی نکتہ نیڈ کی بمباری مہم تھی جس کی وجہ سے یوگوسلاویہ میں بے شمار ہلاکتیں ہوئیں، سربیا کی طرف سے جاری ظلم و تشدد اور زیادتیوں میں اضافہ ہوا، ماحولیاتی تباہی عمل میں آئی اور یورینیم اور کلستر بموں کے استعمال سے ایک خطرناک روایت قائم کرنے کے علاوہ نہ پھٹنے والے بموں اور یورینیم کے خطرات وہاں ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیئے گئے۔

ہیک میں عدالت کی چیف پراسیکیوٹر کینیڈا کی ”لوسی آربر“ کو جون میں مزید کچھ عرضداشتیں اور دعوے موصول ہوئے جو اس نے بظاہر نہایت خندہ پیشانی سے وصول کئے۔ ان دعوؤں کے ساتھ تین موٹی جلدوں پر مشتمل دستاویزی ثبوت بھی تھے۔ دعویٰ دائر کرنے والوں کی جانب سے مسلسل یاد دہانیوں اور درخواستوں کے باوجود کسی قسم کی کوئی کارروائی تو کیا عمل میں آتی انہیں جواب تک دینا ضروری نہیں سمجھا گیا۔ نومبر میں ”لوسی آربر“ کی جانشین سونڈر لینڈ کی ”خارلا ذیل پونے“ کو بھی مزید دعوے مزید شہادتوں کے ہمراہ موصول ہوئے۔ نومبر کے ان دعوؤں میں جس اہم نکتہ کی جانب اشارہ کیا گیا تھا وہ یہ تھا کہ جن لوگوں پر الزام عائد کیا گیا ہے ان کے خلاف مقدمہ بازی قانونی ضرورت ہی نہیں انصاف کا تقاضا بھی ہے کہ مظلوم کی داد رسی کی جائے اور طاقتور ممالک، خاص طور پر وہ ملک جو نیو میں شامل ہیں کو روکنے کی کوشش کی جائے جن پر کسی قسم کا فطری دباؤ نہ ہونے کی وجہ سے انہوں نے اپنی فوجی طاقت اور میڈیا پر مکمل کنٹرول کے ذریعہ کم طاقتور ملکوں کو بری طرح سے ڈرا دھکا کر اپنی مرضی کے تابع کر رکھا ہے۔

ان دعوؤں میں نہ صرف جنگ کے فاتحین پر الزامات عائد کیے گئے بلکہ شکست کھانے والوں کو بھی طرمان کے کٹہرے میں کھڑا کر دیا گیا اس حوالے سے ان کے دلائل کے مطابق شکست کا مقصد صرف اور صرف بین الاقوامی قانون نو جداری کی چھتری تلے آنا تھا۔

”آربر“ کے نام خطوط میں ایک کینیڈا کے دعوے کے روح رواں اور ٹورنٹو میں قانون کے پروفیسر مائیکل مینڈل کی طرف سے بھی تھا۔ اس خط کا اقتباس قارئین کے لیے نہ صرف معلومات افزا بلکہ دلچسپی کا باعث بھی ہوگا۔

پروفیسر مائیکل مینڈل کے مطابق ”جیسا کہ آپ کے علم میں ہے کہ بد قسمتی سے آپ کا ٹریبونل اپنی غیر جانبداری کے حوالے سے بوجہ مستقل شکوک و شبہات کی زد میں ہے۔ تنازعہ کے آغاز کے دنوں میں جب بلغراد یونیورسٹی کے شعبہ قانون کی فیکلٹی کے اراکین کی جانب سے نیٹو سربراہان کے خلاف قانونی تقاضوں کے عین مطابق اور ہماری رائے میں پوری دہشیت کے ساتھ ایک نہایت مدلل دعویٰ ٹریبونل میں دائر کیا گیا تو آپ برطانوی سیکرٹری خارجہ رابن کلک کے ہمراہ پریس کانفرنس میں تشریف لائیں، وہ رابن کلک جو اس دعوے کے مطابق ملزمان میں سے ایک تھا۔ اس روز اس نے دنیا کو دکھانے کے لیے سر بیانی جنگی جرائم کی دستاویز آپ کے حوالے کرنے کا مظاہرہ کیا تھا۔ مئی کے آغاز میں آپ نے امریکی سیکرٹری خارجہ میڈلین البرائٹ کے ہمراہ ایک اور پریس کانفرنس میں شرکت کی۔ اس وقت تک میڈلین البرائٹ کے خلاف یوگوسلاویہ میں شہریوں کو نشانہ بنانے اور دیگر جنگی جرائم کے الزام کے تحت دو باقاعدہ دعوے دائر ہو چکے تھے۔ اس پریس کانفرنس کے موقع پر البرائٹ نے کھلے عام اعلان کیا کہ امریکہ ٹریبونل کو سب سے زیادہ فنڈز مہیا کرنے والا ملک ہے اور اس نے اسے مزید فنڈز دینے کا وعدہ کر رکھا ہے۔“

آربر خود نیٹو کی بہت بڑی حامی تھی اور وہ اپنے متعصب رویے کو چھپانے کی شعوری کوشش کرتی رہی۔ وہ نیٹو پر اس طرح اعتماد کرتی تھی کہ جیسے وہ اس کی پولیس، ”جج“، جیوری اور محافظ سب کچھ ہو۔

جنرل نیوشے کی گرفتاری نے بین الاقوامی قانون و انصاف کو ایک دم بہت اونچے مقام پر پہنچا دیا تھا اسی سال آربر کی سربراہی میں بین الاقوامی فوجداری ٹریبونل نے سابقہ یوگوسلاویہ حوالے سے ایک قانون منظور کیا جس کے مطابق عظیم طاقتوں کے لیے یہ معمول کے کاروبار کا حصہ ہی ہو گا خالص طور پر عظیم عالمی طاقت کے لیے جس نے کوئی مقدمہ بھی نہیں کیا اور اتفاق سے وہ ہی اس پر سب سے زیادہ رقم خرچ کر رہی ہے۔ اس بارے میں آربر کے اپنے الفاظ ملاحظہ فرمائیے۔

”میں انسانیت کے بین الاقوامی قانون کی خلاف ورزیوں کے

الزامات پر جو نیٹو ممالک پر عائد کئے گئے ہیں کسی قسم کا کوئی تبصرہ نہیں

کر رہی۔ میں نیٹو سربراہان کی ان یقین دہانیوں کو قبول کرتی ہوں کہ وہ

یوگوسلاویہ میں انسانیت کے بین الاقوامی قانون کے مطابق کارروائیاں کریں گے۔ اس کے ساتھ ساتھ میں نے انہیں یاد دہانی کرا دی ہے کہ جب بھی کوئی ایسا موقع آیا کہ وہ دیکھیں کہ پالیسی کی خلاف ورزی ہو رہی ہے تو ان کا فرض ہے کہ اس کے بارے میں غیر جانبدارانہ غیر متعصب اور ایماندارانہ تحقیقات کریں جبکہ کمانڈرز کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ ضرورت پڑنے پر مجرم کو سزا دیں۔“

نیٹو کی پریس بریفنگ (16 مئی 1999ء)

سوال: کیا نیٹو نے اپنی سرگرمیوں کے حوالے سے جج آربر کے عدالتی اختیارات کو تسلیم کر لیا ہے؟

جیسی شیپ: ”میرا خیال ہے کہ ہمیں نظریہ اور عمل میں تمیز کرنے کی ضرورت ہے۔ جسٹس آربر ہماری اجازت سے ہی تحقیقات کا آغاز کرتی ہے۔ سریوں کے حوالے سے وہ تحقیقات کرے گی کیونکہ ہم اسے اس کی اجازت دیں گے نیٹو ممالک نے ہی ٹریبیونل قائم کرنے کے لیے پیسہ فراہم کیا ہے اور ہم سب سے زیادہ فائدہ مند ممالک کرنے والوں میں سے ہیں۔“ برٹینل ٹریبیونل کے قیام کا تذکرہ بھی یہاں مناسب ہوگا۔

ٹریبیونل کا قیام 1993ء میں عمل میں آیا۔ اس کا باپ امریکہ ماں سلامتی کونسل اور دایہ میڈلین البرائنٹ تھی۔ یہ نیٹو ممالک کے فوجی وسائل پر ہی انحصار کرتا ہے تاکہ ان کی مدد سے جنگی جرائم کے سلسلہ میں مشتبہ افراد کی گرفتاریاں عمل میں لائی جائیں۔

ہم دوبارہ بین الاقوامی فوجداری ٹریبیونل کے قصہ کی طرف لوٹتے ہیں۔ آربر اور ڈیل پونٹے کے سوائے نیٹو کے خلاف ان دعوؤں کے کسی قسم کے غیر معمولی واقعات کا سامنا نہیں کرنا پڑا البتہ دسمبر کے اواخر میں ڈیل پونٹے نے لندن کے ”دی آبزورر کو ایک انٹرویو دیا جس نے نیٹو ممالک کو غم و غصہ میں مبتلا کر دیا کہ اسے فوراً ہی اپنی ”غیر ذمہ داری“ پر معذرت کرنا پڑی۔ انٹرویو کے دوران جب ڈیل پونٹے سے سوال کیا گیا کہ ”کیا وہ نیٹو کے اہلکاروں کے خلاف الزامات عائد کرنے کے لیے تیار ہے؟ تو اس نے جواب میں کہا کہ اگر میں ایسا نہیں کرنا چاہتی تو اس کا مطلب ہے کہ میں اپنا فرض صحیح طور پر ادا نہیں کر رہی اور مجھے فوراً سے

بیشتر اپنا مشن چھوڑ دینا چاہیے۔“

اس کے بعد ٹریبیونل نے اعلان کیا کہ ذیل پونے کی سربراہی میں ٹریبیونل نے نیو کے ممکنہ جرائم کے حوالے سے تحقیقات مکمل کر لی ہے اور یہ تحقیقات نیو کی چالوں کے بارے میں عوامی تشویش کو دیکھتے ہوئے مناسب جوابی کارروائی کے طور پر کی گئی ہیں۔ اس بات کا اعلان بھی کیا گیا کہ ”ٹریبیونل کے لیے بے حد ضروری ہے کہ وہ سابقہ یوگوسلاویہ میں مسلح تنازعات میں ملوث طاقتوں کے خلاف اپنے اختیار استعمال کرے۔“

(نا قابل یقین۔ حیرت انگیز)

کیا یہ اس بات کی نشانی تھی کہ نئی صدی میں ہر ایک کو مساوی انصاف ملے گا؟ کیا واقعی ایسا ممکن ہے؟

..... افسوس یہ خواب چند دن بھی قائم نہ رہ سکا..... نہیں یہ کبھی بھی نہیں ہو سکتا تھا تبھی تو امریکہ اور کینیڈا کے سرکاری غیر سرکاری فوجی اور شہری حلقے غصے سے ششدر رہ گئے تاراضگی اور نفرت سے بے ساختہ چلا اٹھے کہ ”یہ نا انصافی ہے“..... ”یہ نا انصافی ہے“.....

ذیل پونے کو پیغام مل گیا تھا اور ”آبزور“ کے انٹرویو کے منظر عام پر آنے کے ٹھیک چار روز بعد اس کے آفس سے ایک بیان جاری ہوا جس کے مطابق ”سابقہ یوگوسلاویہ کے حوالے سے بین الاقوامی فوجداری ٹریبیونل کے پرائیکوٹر آفس کی جانب سے نیو کے خلاف کسی قسم کی کوئی تحقیقات نہیں کی جا رہی ہیں اور نہ ہی کو سوا تنازعہ کے حوالے سے نیو کی کارروائیوں پر کسی قسم کی تفتیش کی گئی ہے۔“ ”اور نہ ہی کبھی ہوگی“ ظاہر ہے کہ اس بیان میں یہ جملہ شامل کرنا غیر ضروری تھا کیونکہ عقلمند کے لیے اشارہ کافی ہے۔

جہاں تک نیو کے خلاف دعوؤں کا سوال ہے تو امریکی ذرائع ابلاغ اسے مسلسل نظر انداز کر رہے تھے لیکن آخر تک؟..... بالآخر یہ معاملہ بھی مکمل ہی گیا۔ اچانک ہی اس کی اتنی زیادہ تشہیر ہوئی اور اتنی پذیرائی ملی کہ بمباری کے حامی ممالک دفاعی انداز اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے۔ جنگی جرائم کے الزامات کے حوالے سے نیو کے دفاعی موقف کے مطابق ”شہری علاقوں کی تباہی و بربادی اور شہری ہلاکتیں“ حادثاتی“ تھیں اور جنگ میں تو ایسا ہوتا ہی ہے۔“ مندرجہ ذیل چند اہم رپورٹس کی روشنی میں اس دعویٰ پر بہت سے اعتراضات کئے جاسکتے ہیں

اور کئے جانے چاہئیں۔ آئیے ذرائع کی فضائی جنگ کے کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل مائیکل شارٹ کے بیان پر مشتمل اس رپورٹ کے ایک نکتہ کو اس بحث میں مثال کی حیثیت سے دیکھتے ہیں۔ لیفٹیننٹ جنرل مائیکل شارٹ کے مطابق ”اگر ایک صبح آپ اٹھ کر دیکھتے ہیں کہ آپ کے گھر میں نہ تو بجلی ہے اور نہ ہی گیس۔ باہر نظر دوڑاتے ہیں تو وہ پل جس پر سے گذر کر آپ کام پر جاتے ہیں زمین بوس ہو چکا ہو اور آئندہ بیس برس تک اس کی تعمیر و مرمت کی کوئی امید بھی نہ ہو تو آپ بے ساختہ چلا نہیں کہ ”اے سلویو! یہ سب کیا ہے؟ آخر ہم کب تک یہ سب برداشت کریں گے؟“

”نیویارک ٹائمز“ کے ساتھ ایک انٹرویو میں جنرل شارٹ نے کہا ”قوی امید ہے کہ یوگوسلاویہ کی عوام کا دکھ بلغراد کے کام کی حمایت ختم کر دے گا۔“

ایک اور جگہ نیوٹر جمان جمبی شیئے نے کہا کہ اگر صدر میلاسویچ واقعی اپنے ملک کی تمام آبادی کو پانی اور بجلی فراہم کرنا چاہتے ہیں تو انہیں صرف اور صرف یہ کرنا ہو گا کہ نیو کی پانچ شرائط کو تسلیم کر لیں۔ ہم اسی وقت اپنی مہم ختم کر دیں گے۔“

اپریل میں نیو کی بمباری سے بلغراد کی ایک دفتری عمارت تباہ و برباد ہو گئی جس میں سیاسی جماعتوں کے دفاتر، ٹی وی اور ریڈیو سٹیشن سو کے قریب پرائیویٹ کمپنیاں اور ایسے ہی کئی تجارتی ادارے قائم تھے۔ اس واقعہ پر واشنگٹن پوسٹ کی رپورٹ ملاحظہ کیجئے۔

”پچھلے کچھ دنوں سے امریکی افسران بار بار اس نکتہ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے امید ظاہر کر رہے تھے کہ سر بیا کی معاشی قوتوں کو جب ایک بار اس بات کا احساس ہو جائے گا کہ نیو مطالبات کے خلاف مزاحمت جاری رکھنے کی صورت میں انہیں کتنے عظیم نقصانات کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے تو وہ نہایت کم عرصہ کے دوران میلاسویچ کے مخالف ہونا شروع ہو جائیں گے۔“

اس عمارت پر میزائل داغنے سے پہلے نیو کے منصوبہ سازوں نے نقصان کا اندازہ بھی لگا لیا تھا جس کے مطابق ”پچاس سے سو کے درمیان سرکاری یا جماعت کے ملازمین کی ہلاکتیں اور 250 کے قریب غیر ارادی شہری اموات۔ منصوبہ سازوں کے مطابق قریبی عمارتوں میں رہائش پذیر تقریباً 250 افراد بھی اس دھماکے کا شکار بنیں گے۔ مگر یہ ہلاکتیں چونکہ

غیر ارادی ہوں گی اس لیے کسی کا کوئی قصور نہیں کیونکہ جنگ میں تو سب کچھ جائز ہوتا ہے۔ ذرا اپنے حالات پر ایک نظر ڈالیے۔ ہم ایک دوسرے کو باور کراتے ہیں کہ ہم جوان آدمی ہیں۔ ہم ایک کام ”اے“ کرتے ہیں اور پھر کوشش یہ کرتے ہیں کہ اس کا نتیجہ ”بی“ نکل آئے اور جب واقعی اس کا نتیجہ ”بی“ کی صورت میں آ جاتا ہے ہم اس بات پر اصرار کرتا شروع کر دیتے ہیں کہ یہ تو بالکل غیر ارادی ہے اس میں ہمارا کوئی کردار نہیں اس میں ہمارا کوئی قصور نہیں۔

جنگ عظیم دوم کے بعد فوری طور پر ایک بین الاقوامی فوجداری عدالت کے قیام کی ضرورت تھی جہاں جنگی جرائم انسانیت کے خلاف جرائم اور فتنائے عام میں ملوث ملزمان کے خلاف مقدمے کئے جاتے اور وہ تحقیقات کر کے جرم ثابت ہونے پر انہیں سزا دے کر انصاف کے تقاضے پورے کرتی مگر اس کی بجائے ہم پر سرد جنگ مسلط کر دی گئی۔ وقت گذرتا چلا گیا بالآخر 1998ء میں یہ خواب اس وقت شرمندہ تعبیر ہوتا نظر آیا۔ جب 1998ء میں اقوام عالم نے روم میں بین الاقوامی فوجداری عدالت کا چارٹر تیار کیا مگر یہاں بھی امریکہ نے ایک نیا تنازعہ کھڑا کر دیا۔ امریکہ کی جانب سے اس بات پر اصرار کیا گیا کہ چارٹر میں ایسی شقیں شامل کی جائیں جن کی رو سے امریکہ کو تمام مقدمات کے فیصلہ کے سلسلہ میں اپنی سلامتی کونسل کی ”ویٹو پاور“ کے استعمال کا اختیار حاصل ہو جائے۔ امریکہ کا یہ مطالبہ مسترد کر دیا گیا اور اس اس بناء پر امریکہ نے اس چارٹر کی حامی 120 اقوام کے ساتھ شمولیت سے انکار کر دیا۔ بین الاقوامی فوجداری عدالت وہ ادارہ ہے جو باوجود مسلسل کوشش کے امریکہ کے قابو میں نہیں آ رہا۔ امریکہ اسے اپنی فوج اور سرکاری اہلکاروں پر مقدمے چلانے سے نہیں روک سکتا۔ سینئر امریکی حکام اس بات کا واضح طور پر اعلان کرتے ہیں کہ اس مستقل خطرہ کی وجہ سے ہی وہ اس نامزد عدالت کو شدید نفرت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ مگر یوگوسلاویہ کے کیس کے حوالہ سے بین الاقوامی فوجداری ٹریبیونل کے ساتھ ناپسندیدگی کا ایسا کوئی معاملہ نہیں بلکہ یہ امریکہ کی پسندیدہ ترین بین الاقوامی عدالت ہے جو کہ نیوٹرلڈ آرڈر کے عین مطابق عمل کرتی ہے۔

واشنگٹن کے ایک صحافی ”سام سمٹھ“ کا 1999ء میں ایک تجزیہ شائع ہوا۔ آئیے ذرا اس پر ایک نظر ڈالیں ”ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بین الاقوامی فوجداری ٹریبیونل اپنی کارروائیوں

کے سلسلہ میں نیوجرسی کی سٹیٹ پولیس سے ہدایات وصول کر رہا ہے۔ اس ہفتے جن جنگی مجرمان کے خلاف کارروائی عمل میں آئی ان کے غیر ملکی نام پڑھنا ہی بے حد مشکل ہے۔ انگریزی کے آسان ناموں والا جیسے کہ کلنٹن یا بلنیر..... کوئی ایک بھی ملزم نہیں تھا۔

یوگوسلاویہ میں تباہ کن فوجی آپریشن کے دوران امریکہ کو اس بات کی قطعی کوئی پرواہ نہیں تھی کہ کوئی بیک میں نیٹو کے خلاف الزامات عائد کرنے کا سوچ بھی سکتا ہے۔ اس کی فکر و پریشانی کا مرکز تو کوئی اور ہی بات تھی جو ہمارے علم میں اب آئی ہے کہ ”یوگوسلاویہ سے جنگ کے درمیانی عرصہ میں امریکی محکمہ دفاع کے سب سے بڑے لیگل آفس کی جانب سے تنبیہی ہدایات جاری کی گئیں کہ سائبر حملوں کے بے جا استعمال کے باعث امریکی حکام پر جنگی جرائم کے الزامات عائد کئے جاسکتے ہیں۔“ یہ بات اس حقیقت کی جانب اشارہ کرتی ہے کہ سینٹا گون کے حکام سرہیا کے کمپیوٹر نیٹ ورک کو ناکارہ کرنے میں مصروف عمل تھے تاکہ اس کے ذریعہ اس کی فوجی کارروائیاں اور شہری خدمات کو ناکام بنا دیا جائے۔

دہشت گردوں کی جنت..... امریکہ!

امریکی محکمہ خارجہ کی جانب سے 1998ء میں جاری ہونے والی انسانی حقوق کی سالانہ رپورٹ میں کیوبا کا شمار ان ممالک میں کیا گیا تھا جن پر دہشت گردوں کی سرپرستی کا الزام عائد کیا جاتا ہے۔ اپنی تجسس فطرت سے مجبور ہو کر اس بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے میں نے محکمہ خارجہ کو فون کیا انہوں نے میرا رابطہ ”دہشت گردی سیکشن“ میں کرا دیا جہاں ”جو ریپ“ نامی ایک مہذب شخص نے میرے استفسار پر بتایا کہ کیوبا کو اس فہرست میں اس لیے شامل کیا گیا ہے کہ یہ دہشت گردوں کو پناہ دیتا ہے۔

”یہ تو امریکہ بھی کرتا ہے۔ میامی میں پناہ گزین کیوبا کے بھگوڑے امریکہ میں اور اس سے باہر دہشت گردی کی سینکڑوں کارروائیوں میں ملوث ہیں۔“ میں نے بہت سکون سے جواب دیا۔

”سرا یہ نہایت احمقانہ رائے ہے اور میں اس قسم کی بیہودہ باتیں نہیں سنتا۔“ مسٹر ریپ کا مہذب انداز اور خوش خلقی ایک دم غائب ہو گئی اور جاہلوں کی طرح چلاتے ہوئے اس نے ریسور کریڈل پر شیخ دیا۔

مجھے مشکلات پیدا کرنے میں لطف آتا ہے اور میں نام بھی نہیں ہوتا یہی وجہ ہے کہ اگلے سال 4 مئی 1999ء کو میں اس روز جب انسانی حقوق کی سالانہ رپورٹ جاری کی گئی میں نے ایک بار پھر اپنے فون سے 8682-697-202 ملا یا۔ ایک بار پھر میرا رابطہ ”جو ریپ“ سے کرا دیا گیا۔ مجھے شک تھا کہ کسی بھی لمحہ وہ پہچان لے گا کہ میں وہی ہوں جس نے پچھلے سال بھی رابطہ کیا تھا اور کسی بھی لمحہ گزشتہ سال والا حادثہ وقوع پذیر ہو جائے گا۔ رسی وعا سلام تک اس نے نہیں پہچانا لیکن جیسے ہی میں نے میامی میں پناہ گزین کیوبا کے دہشت

گردوں کے بارے میں اپنا سوال دہرایا وہ غضبناک ہو گیا۔ اس نے غصے سے چلاتے ہوئے کہا۔
”وہ دہشت گرد نہیں ہیں۔“

”لیکن ایف بی آئی ان میں بعض کو دہشت گرد قرار دے چکی ہے۔“ میں نے اس کے غصہ سے لطف اٹھاتے ہوئے کہا۔

”تو آپ ایف بی آئی سے رابطہ کریں۔“ اس کی آواز پھٹ رہی تھی۔
”لیکن ہم تو حکمہ خارجہ کی رپورٹ پر بات کر رہے ہیں نا۔“ میں نے بڑے اطمینان کے ساتھ اس کی توجہ دلائی۔

”مگر میں ایسے لوگوں سے بات کرنا پسند نہیں کرتا جو امریکی حکومت کو دہشت گردوں کا سرپرست قرار دیں۔“ اس نے غصے کی آخری حدود کو چھوتے ہوئے فون بیچ دیا۔
گذشتہ ایک سال کے دوران اس کے رویے میں کسی قسم کی کوئی نرمی یا پلک پیدا نہیں ہوئی تھی۔
میرے لیے یہ ہمیشہ سے ایک نہایت دلچسپ مشاہدہ رہا ہے اور آپ کا بھی اس سے روزمرہ زندگی میں اکثر اوقات واسطہ پڑتا رہتا ہو گا کہ اندھا دھند تقلید کرنے والا اس وقت ہمیشہ شدید رد عمل کا مظاہرہ کرتا ہے جب اس کے نظریے پر تنقید کرتے ہوئے ایسا غیر متوقع سوال کر دیا جائے جس کا جواب اس سے نہ بن پڑے اور اس اعتراض کی صداقت بھی عیاں ہو۔ ایسے میں کھسیا ہٹ میں جھٹلا ہو کر وہ محض شرمندگی چھپانے کے لیے اونچی آواز میں چیخا اور چلاتا ہے کہ نقاد اس کے شور کے ہنگامے سے گھبرا جائے۔ ایسے ”سچے پیرد کاروں“ کو ہر لمحہ اپنے نظریات پر ہونے والے غیر متوقع اور اچانک تنقیدی حملوں کا خوف لاحق رہتا ہے۔

کیوبا کے جلاوطن دنیا کے سب سے کثیر تعداد میں اور سب سے زیادہ مستقل مزاج دہشت گرد گروہوں میں سے ایک ہیں اور یہ ”اعزاز“ انہوں نے مستقل طور پر برقرار رکھا ہوا ہے۔ 1997ء میں انہوں نے میامی کی ہدایات کے مطابق ہوانا کے ہوٹلوں پر بمباری کی۔
ہوائی جہازوں کے اغواء کو بین الاقوامی طور پر سنگین ترین جرائم میں سے ایک قرار دیا جاتا ہے مگر کیوبا سے امریکہ کے راستے میں بے شمار ہوائی جہاز اغواء کئے گئے۔ کوئی بندوق کی نال پر تو کوئی چاقو کی نوک پر اغواء اور کبھی جسمانی طاقت کے استعمال کے ذریعہ ہائی جیکنگ عمل میں آئی اور اس عمل میں کم از کم ایک قتل بھی ضرور ہوا مگر بہت تلاش کرنے پر بھی سوائے ایک کیس کے کوئی مثال نہیں ہے کہ جس میں امریکہ کی طرف سے ہائی جیکرز کے خلاف فردو جرم عائد کی

گئی ہو۔ اس اکلوتے کیس کا احوال بھی سن لیجئے۔ اگست 1996ء میں تین کیوبائی ہائی جیکرز نے فلوریڈا جانے والی پرواز کو چاقو کی نوک پر اغواء کر لیا۔ بد قسمتی کہ پکڑے گئے اور ان کے خلاف فرد جرم عائد کر کے فلوریڈا کی عدالت میں مقدمہ چلا جو ہائی جیکنگ کے مقدمہ سے زیادہ نوٹیا کی عدالت میں زیر سماعت جوئے کا مقدمہ محسوس ہو رہا تھا۔ حالانکہ اغواء ہونے والے جہاز کے پائلٹ کو گواہی کے لیے کیوبا سے بلوایا گیا تھا لیکن جیوری کے سامنے وکیل کے صرف یہ کہنے پر کہ یہ گواہ جھوٹ بول رہا ہے کوئی سوال کیے بغیر جیوری نے ایک گھنٹے کے اندر اندر طے مان کو باعزت بری کر دیا۔

صرف کیوبا کے جلاوطنی غیر ملکی دہشت گرد اور انسانی حقوق کو پامال کرنے والے نہیں ہیں جو امریکہ کی پتاہ میں محفوظ زندگی گزار رہے ہیں بلکہ اشتراکیت کے سخت مخالفین یا امریکی خارجہ پالیسی سے اتفاق رکھنے والوں کی ایک بہت بڑی تعداد بھی امریکی مہربانیوں سے لطف اٹھا رہی ہے۔ ان کے بارے میں تفصیلات مندرجہ ذیل ہیں جو یقیناً قارئین کے لیے معلومات افزا ہوں گی۔

گوئے مالا کا سابق وزیر دفاع ”ہیکلر گرامیچو موریلو“ جس کے بارے میں 1995ء میں امریکی عدالت نے حکم دیا تھا کہ وہ امریکہ اور گوئے مالا کے آٹھ شہریوں پر وحشیانہ تشدد اور گوئے مالا میں کئی خاندانوں کے قتل عام (جن میں ہزاروں افریقین بھی شامل تھے) کے ان کی ہلاکتوں کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا تھا کے ہر جانے کے طور پر 47.5 ملین ڈالر اوارا کرے۔ 1991ء کے ایک عدالتی حکمنامہ پر ”گرامیچو“ نے اپنی صفائی میں کہا تھا کہ وہ ہارورڈ کے کینڈی سکول آف گورنمنٹ کا فارغ التحصیل ہے جہاں اس نے امریکی حکومت کے مفید سے تعلیم حاصل کی تھی۔ جج کی طرف سے اس کیس کا فیصلہ یہ سنا گیا کہ ”شہادتوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ گرامیچو کی ہدایت پر شہریوں کے خلاف ایذا رسانی کی نفرت انگیز مہم چلائی گئی۔“ اس عدالتی فیصلہ کے سامنے آنے پر محکمہ دفاع نے گرامیچو سے فوجی سیمار میں شرکت اور تقریر کرنے کا دعوت نامہ واپس لے لیا۔ اس واقعہ کے بعد گرامیچو عدالتی حکم کے باوجود ہر جانہ کی رقم ادا کیے بغیر گوئے مالا واپس چلا گیا۔ مگر اس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی گئی۔ اپنی سابقہ رہائش گاہ پر باتیں کرتے ہوئے اس نے یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ اس نے جو کچھ کیا وہ انسان دوستی کی ایک مثال ہے اس کا کہنا تھا کہ ”ہم نے 1982ء میں شہری ادارے قائم

کئے جنہوں نے 70 فیصد آبادی کی ترقی کے لیے نہایت کامیاب اقدامات کئے جبکہ 30 فیصد آبادی کو ہم نے ہلاک کر دیا۔ حالانکہ اس سے قبل حکمت عملی یہ تھی کہ 100 فیصد آبادی کو ہلاک کر دیا۔

O انسانی حقوق کی خلاف ورزیاں کرنے والوں کے نزدیک فلوریڈا بہترین جائے پناہ ہے۔ جہاں وہ ”ریٹائرمنٹ“ کے دن سکون سے گزار سکتے ہیں۔ کوئی انہیں ان کے جرائم یاد دلانے والا نہیں ہوتا۔ 80ء کی دہائی میں ایل سیلوڈور کی مسلح افواج کے سربراہ سابق جنرل ”جوزف گلیمر موگارشیا“ پر جس سنگین جرم کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے وہ یہ تھا کہ اس کی ہدایت پر فوج کے ”ڈسچہ سکواڈ“ نے ہزاروں بے گناہ افراد کو فتنہ انگیزوں کے شیر میں ہلاک کر دیا تھا۔ اب یہی گارشیا 1990ء سے فلوریڈا میں نہایت پرسکون زندگی بسر کر رہا ہے۔

O گارشیا کا جانشین جنرل ”کارلوس یوجینیو واندز کسانووا“ جس نے ظالم ترین قوی گیارڈ کے سربراہ کی حیثیت سے بھی خدمات سر انجام دیں آج کل سن شامیٹ میں رہائش پذیر ہے۔ ایل سیلوڈور کے لیے اقوام متحدہ کے سچائی کمیشن کے مطابق ”کارلوس واندز نے 1980ء میں تین امریکی راہبائوں کو بے رحمی کے بعد ہلاک کرنے اور ایک امریکن کو قتل کرنے والے مجرموں کو نہ صرف بچایا بلکہ انہیں مکمل تحفظ بھی فراہم کیا۔ ایسے ہی کم از کم دو مواقع پر تو اس کی ذاتی طور موجودگی کی شہادتیں ہیں۔ ایک تو جب ڈاکٹر جوجین معا گوزا آرک پر تشدد کیا جا رہا تھا۔ آخر میں تو زخموں کی صورتحال اتنی خطرناک ہو گئی تھی کہ ان کی سرجری بھی نہیں کی جاسکتی تھی اور جب واندز 1999ء میں ایک انٹرویو کے دوران یہ کہتا ہے کہ ”میں بار بار اپنے آپ سے سوال کرتا ہوں کہ کیا میں نے کوئی غلط کام کیا ہے تو جواب ہمیشہ نفی میں ملتا ہے“ اس پر کیا تبصرہ کیا جاسکتا ہے۔

اسی زمانہ میں جب گارشیا اور واندز امریکہ میں رہائش پذیر تھے امریکی ایگریکیشن والوں نے ایل سیلوڈور کے بہت سے پناہ گزینوں کو مزید پناہ دینے سے انکار کر دیا حالانکہ وہ اس خوف کا اظہار کرتے ہوئے دعویٰ کر رہے تھے کہ اگر انہیں واپس بھیجا گیا تو ان پر وحشیانہ تشدد کیا جائے گا یا مار دیا جائے گا۔

یہی انسانی حقوق کی خلاف ورزیاں کرنے والے بے شمار افراد بہت اطمینان کے ساتھ پچھلے چند سالوں سے امریکہ میں مقیم ہیں۔ انہیں حکام کی طرف سے کسی قسم کی تکلیف اور

پریشانی کا سامنا نہیں ہے حالانکہ ان کے ہاتھ ڈویلپرز شاہی خاندان کے خون میں رنگے ہوئے ہیں وہ جمہوری طریقے سے منتخب ہونے والے فادر جین برٹنڈ آر سٹائیڈ کا 1991ء میں تختہ الٹنے کے مجرم ہیں اور فوجی انقلاب کے بعد ایک بار پھر ملک کو تشدد کے حوالے کرنے کے گناہ گار ہیں۔ امریکہ میں رہائش پذیر ان افراد کا مختصر ”تعارف“ قارئین کی نذر ہے۔

O لکٹر کیمرن جوفری ٹوکس ”پاپا ڈوک“ ڈویلپرز کے دور حکومت میں وزیر داخلہ اور وزیر دفاع اور اس کے بیٹے اور جانشین جین کلاڈ ”بے بی ڈوک“ ڈویلپرز کے دور میں مشیر کے عہدوں پر فائز تھا۔

O لیفٹیننٹ کرنل پاؤل سمیوئل جری: 1986ء میں جب ”بے بی ڈوک“ سے تخت و تاج چھین لیا گیا تو لیفٹیننٹ کرنل جری کو ڈویلپرز مخالفین پر سنگین تشدد کے الزام کے تحت 15 سال قید کی سزا ہو گئی جہاں سے وہ 1988ء میں فرار ہو گیا۔

O جنرل پراسپر آڈول: بیٹی کا ایک اور آمر جو حزب مخالف کے ارکان پر وحشیانہ تشدد کا ذمہ دار تھا۔ اس نے تشدد کا شکار ان خون آلود زنجیروں کوئی دی کے ذریعہ سب کو دکھایا۔ 1990ء میں غم و غصہ میں جلا عوام نے انقلاب کے ذریعہ اسے حکومت چھوڑنے پر مجبور کر دیا پھر امریکی حکومت نے اسے فلوریڈا میں پناہ دے دی جہاں اسے امید تھی کہ وہ ہمیشہ خوش و خرم زندگی بسر کرے گا۔ مگر ہوا یہ کہ اس کے ہاتھوں تشدد کا شکار ہونے والے بعض افراد نے اس کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا۔ مقدمے کی کارروائی کے دوران ایک موقع پر عدالت میں حاضری نہ ہونے کے باعث وہ مقدمے کی پیروی سے محروم ہو گیا۔ پناہ کی تلاش میں وہ مختلف ممالک میں پھرتا رہا اس دوران 1994ء میں ایک امریکی فیڈرل جج نے امریکہ میں مقیم بیٹی کے چھ باشندوں کو 41 ملین ڈالر زد و لوادینے۔

ارلیئر سٹائیڈ کی جلا وطنی کے زمانہ میں 1991ء سے 1994ء کے دوران کرنل کارل ڈور ملین سات ہزار افراد پر مشتمل اس نفری کی نگرانی پر مامور تھا جو ایڈرسانی کی کارروائیوں کے لیے تشکیل دی گئی تھی۔ اس نفری کے ”فرانسز“ میں اغواء تشدد زنا اور قتل جیسے عوامل شامل تھے۔ اس کے کھاتے میں بیٹی کے پانچ ہزار شہریوں کی ہلاکتیں شامل ہیں۔ کرنل ڈور ملین نے بھی فلوریڈا میں گھر لے لیا اور اپنے تمام ”فرانسز“ سے فارغ ہو کر یہاں سکون کی زندگی گزارنے لگا۔ بیٹی کے ”ڈی-تھ سکواڈ“ کا سربراہ ”عمانویل کونٹینٹ“ بھی امریکہ میں ہی رہائش

پذیر ہے۔ یہ ٹھکوں کے پاریرانی گروپ (FRAPH) کا بھی سابق سربراہ تھا۔ جس نے قتل و غارت گری، تشدد، سرعام مار پٹائی اور لاچار ہمسایوں پر حملوں کے ذریعے مٹی کے عوام کو مستقل خوف اور دہشت میں مبتلا کر رکھا تھا۔ یہ صورتحال اس وقت اور زیادہ سنگین ہو گئی جب ایسٹر ادا کے خلاف انقلاب کی کامیابی کے بعد مخالفین کی قتل و غارت گری کا بازار گرم ہوا زندہ انسانوں کے اعضاء کاٹ کاٹ کر پھینکنے کے مظاہرے سرعام ہوئے۔ ہٹی میں ”کونٹیٹ“ سی آئی اے کا تنخواہ دار ملازم تھا اور اب نیویارک میں رہائش پذیر ہے۔ امریکی محکمہ خارجہ نے ”کونٹیٹ“ کے حوالے سے ہٹی کی تحویل مجرمین کی درخواست رد کرتے ہوئے اس کی اپنے ملک واپسی روک دی ہے۔

O آرمینڈو فرینڈز لیریوس چلی ملٹری سکواڈ کارکن تھا جو 1973ء کے انقلاب کے بعد کم از کم 72 سیاسی قیدیوں پر تشدد اور ان کی ہلاکت کا ذمہ دار ہے؟ فرینڈز بھی آج کل امریکہ میں مقیم ہے۔ بلا ہر وہ ملٹری سکواڈ کارکن تھا کہ شوشے کے دور حکومت میں چلی کی بدنام زمانہ خفیہ پولیس Dina کے ایجنٹ کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔ امریکہ میں اس کی مستقل رہائش کالیں منظر یہ ہے کہ اس نے امریکی سرکاری وکلاء کے ساتھ سودے بازی کر کے وعدہ معافی گواہ کی حیثیت سے ایک تحریری بیان دیا جس کے مطابق چلی کے سابق اہلکار آدر لینڈو لٹلمیر کا 1976ء میں داسٹن ڈی سی بی بم دھماکے میں قتل دراصل Dina کی سازش تھی۔ چلی کی حکومت نے امریکہ سے درخواست کی فرینڈز کو اس کے حوالے کر دیا جائے مگر اس کے وکلاء نے یہ موقف اختیار کیا کہ ان کے موکل اور محکمہ انصاف کے درمیان ہونے والے 1987ء کے عدالتی معاہدہ کی رو سے فرینڈز کو کبھی بھی چلی واپس نہیں بھیجا جائے گا۔ محکمہ انصاف کے حکام نے فرینڈز کے تحفظ کے اس معاہدہ کی شرائط پر کسی بھی قسم کا تبصرہ کرنے سے انکار کر دیا جو محکمہ کی تحویل میں سر بھر ہے۔

O چلی کے مائیکل ٹاؤنٹے کا خفیہ قتل کی وارداتوں میں نہایت نمایاں کردار تھا۔ اس نے کچھ عرصہ امریکی جیل میں خدمات سرانجام دیں اور آج کل فیڈرل وٹنس پروٹیکشن پروگرام کے ساتھ منسلک ہے اس لیے اگر کبھی آپ اس سے ملیں گے تو جان نہیں سکیں گے کہ یہ کون ہے اور اس کا ”ماضی“ کیا ہے؟

O ارجنٹائن کا ایڈمرل ”جورجے ایزکو“ جو کہ ”نایاک جنگ“ کے زمانہ

(83-1976) کے بدنام زمانہ تشدد کے مرکز ”ایسکیو لاملکنیکا“ کے ساتھ نہایت سرگرم رکن کی

حیثیت سے وابستہ تھا آج کل ”ہوائی“ میں مقیم ہے اور پرسکون زندگی بسر کر رہا ہے۔

O ہونڈراس آرمی کی ”بنالین 316“ (تشدد والا باب ملاحظہ فرمائیے) جو کہ سی

آئی اے کی تربیت یافتہ خفیہ تنظیم تھی اور جس نے 80ء کی دہائی میں بائیس بازو کے سینکڑوں

ارکان کو قتل کیا تھا اس کے کم از کم دوسرے ارکان آج کل جنوبی فلوریڈا میں مقیم ہیں اور زندگی

سے لطف اٹھا رہے ہیں۔

O ”ایتھوپیا کا“ ”کیسا سائیگاوا“ اعلاناً کے تشدد کے مقدمہ میں مدعا علیہ تھا۔ جب

وہ مقدمہ ہار گیا اور ہر جانہ ادا کرنے کا موقع آیا تو وہ غائب ہو گیا۔

کہاں؟..... یہ بتانے کی ضرورت نہیں سب ہی جانتے ہیں.....

O انڈونیشیا کا ایک جرنل ”سنتاک جینین“ بھی امریکہ میں رہائش پذیر ہے۔ پ

مشرقی تیمور 1991ء کے سانحہ کروڈ قتل عام کا ذمہ دار ہے جس میں سینکڑوں لوگ مارے گئے تھے۔

O ”تھیون پراسیٹھ“ امریکہ کے اصرار پر پال پوٹ کی خمیر روج کے لیے 1979ء

سے 1993ء تک کمبوڈیا کا ایلیٹی برائے اقوام متحدہ رہا حالانکہ خمیر روج 1979ء میں اقتدار

سے باہر ہو گئی تھی۔ پراسیٹھ پال پوٹ کے انسانیت سوز جرائم کا نمایاں عذر خواہ تھا اور اس نے

ان جرائم کو دنیا سے پوشیدہ رکھنے میں نہایت اہم کردار ادا کیا (پال پوٹ کے باب میں مزید

تفصیلات ملاحظہ فرمائیے)۔ آج کل وہ ماؤنٹ ورنن نیویارک میں آرام اور سکون زندگی بسر کر

رہا ہے۔

O جنرل منصور مہراری جو کہ شاہ ایران کے دور میں جیل خانہ جات کا انچارج تھا

اور اپنے وقت کا نہایت بدنام اذیت رساں اور تشدد تھا۔ جہاں ایذا رسانی اور تشدد کا ذکر ہوتا

ہے وہاں اس کا نام ضرور آتا ہے۔ گذشتہ کئی سالوں سے یہ بھی امریکہ میں مقیم ہے باوجود اس

کے کہ ایرانی ملاؤں نے اس کے سر کی قیمت لگا رکھی ہے۔

O ویتنام جنگ کے دوران اذیت رسانی، تشدد اور انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں

جیسے جرائم قبول کرنے والے جنوبی ویتنام کے 20 افسر بھی کیلیفورنیا میں قانونی طور پر رہائش

پذیر ہیں۔

O کیلیفورنیا میں مقیم بے شمار ویتنامیوں نے 80ء اور 90ء کی دونوں دہائیوں میں

اپنے ان ہومونوں کے خلاف دہشت گردی اور تشدد کی کارروائیاں جاری رکھیں جن کے بارے میں انہیں شبہ تھا کہ یہ مکمل طور پر اشتراکیت مخالف نہیں ہیں۔ بعض صرف اس وجہ سے حملوں کا نشانہ بنے کہ انہوں نے دہشت گرد سرگرمیوں کی خدمت کی تھی۔ ”اشتراکیت مخالف ویٹنامی تنظیم“ اور ”اشتراکیت منشاؤ قوم بچاؤ“ نامی تنظیم نے سینکڑوں مواقع پر قتل و غارت گری کی کارروباری مراکز تباہ کئے گاڑیاں نذر آتش کیں ویتنامی اخبارات کی اشاعتیں روک دیں اور اہم شخصیات کو قتل کی دھمکیاں دینے کے علاوہ منظم جرائم کی ہر ممکنہ شکل کے ذریعہ کاروبار حیات کو مکمل طور پر مفلوج کر دیا۔ ان جرائم کے خلاف گواہیاں بھی تھیں اور دعوے بھی دائر کیے گئے مگر ہوا یہ کہ قتل کے چند مقدمات میں بظاہر کچھ گرفتاریاں عمل میں آئیں مگر بہت ہی جلد ان ملزمان کو تیار کر دیا گیا یا پھر بری کر دیا گیا۔ قانون نافذ کرنے والے اداروں کی فرائض کی ادائیگی کے حوالے سے تغافل اور عدم توجہی کا یہ رویہ صاف ظاہر کرتا ہے کہ اس سلسلے میں امریکی حکام کے ساتھ ان کا کوئی نہ کوئی معاہدہ ہو چکا تھا۔

O سابقہ یوگوسلاویہ کے وہ باشندے بھی جن پر ان ہی کے ہومونوں نے جنگی جرائم کے الزامات عائد کیے امریکہ میں مقیم ہیں۔

مندرجہ بالا آسمروں اور دہشت گردوں میں سے بعض امریکہ کی مہربانی سے کسی تیسرے ہی ملک میں قیام پذیر ہیں جہاں وہ پورے تحفظ اور سکون کے ساتھ شاندار زندگی بسر کر رہے ہیں۔ (انہیں اس قابل کر دیا گیا ہے کہ ان کے بینک اکاؤنٹس ایک بار پھر انہیں مل گئے ہیں)۔ ان میں سے بڑی سے تعلق رکھنے والے چند امریکی ”مہمانوں“ کے نام مندرجہ ذیل ہیں جو ابھی بھی زندہ ہیں اور امریکہ کی فراہم کردہ خوشیوں سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ جنرل راؤلی کیڈراس صدر چین کلاڈ ”بے بی ڈوک“ ڈومیلیر اور نیفرکس پولیس چیف جوزف مائیکل فرینیکوئس وغیرہ وغیرہ۔

اس تمام پس منظر کو ذہن میں رکھتے ہوئے صرف ان دو حملوں پر ایک نظر ڈال لے جو 1998ء میں صدر کلنٹن نے دہشت گردی کے حوالے سے اقوام متحدہ کے اجلاس سے خطاب کے دوران کہے۔ صدر کلنٹن فرماتے ہیں۔

”دہشت گردی کے حوالے سے ہماری عالمی ذمہ داریاں کیا ہیں؟ ایک تو یہ کہ دہشت گردوں کی سرپرستی نہ کی جائے اور دوسرے انہیں پناہ نہ

دی جائے۔“

تحويل مجرمین یا مقدمہ بازی

بین الاقوامی فوجداری مقدمہ بازی کے نظام کے تحت تمام حکومتوں کا یہ فرض ہے کہ وہ قتل و غارت گری، دہشت گردی، جنگی جرائم اور تشدد کی کارروائیوں کے مرتکب افراد کے خلاف فوجداری مقدمہ بازی کریں۔ اس بنیادی اصول کے مکمل نفاذ کے لیے ان تمام ممالک پر جہاں جرائم کے مرتکب افراد موجود ہیں یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ انہیں متاثر حکومت کے حوالے کر دیں (قانون کے مطابق متاثرہ ملک کی وضاحت اس طرح سے کی گئی ہے کہ وہ ملک جہاں جرم کیا گیا ہو یا وہ ملک جس کے شہری متاثر ہوئے ہوں یا پھر وہ ملک جس کی شہریت مجرم کے پاس ہو) یا پھر خود ان کے خلاف مقدمہ بازی کریں۔ ”نیوشے کیس“ کی مثال یہاں صادق آتی ہے جس کا آغاز 1998ء میں برطانیہ میں ہوا۔

امریکی حکومت نظریاتی طور پر ”تحويل مجرمین کی مقدمہ بازی“ کے اس اصول کی بہت بڑی حامی ہے اور درحقیقت چند سال پیشتر وہ بین الاقوامی عدالت انصاف کے روبرو ایک ایسی ہی درخواست لے کر گئی تھی جس میں لیبیا کی حکومت سے ان دو افراد کو امریکہ کے حوالے کرنے کا مطالبہ کیا گیا تھا جن پر الزام تھا کہ وہ بین ایم کی پرواز 103 میں بم دھماکے کے ذمہ دار ہیں۔ امریکی حکومت ان ملزمان کے خلاف بھی اس اصول کو بروئے کار لانے کی مکمل حمایت کرتی ہے جنہیں سابقہ یوگوسلاویہ اور روانڈا کے لیے قائم کئے جانے والے جنگی جرائم کے بین الاقوامی ٹریبیونل نے جنگی جرائم کے مرتکب قرار دیا ہے۔ ایسے ہی ملزمان میں سے ایک کی جیسے روانڈا ٹریبیونل نے جنگی مجرم قرار دیا تھا ٹیکساس میں موجودگی کا انکشاف ہوا۔ اسے فوری طور پر حراست میں لے لیا گیا اور ریاست کے فیڈرل کورٹ میں تحويل مجرمین کی فوجداری کارروائی کے لیے پیش کر دیا گیا۔

امریکہ میں پناہ گزین جنگی مجرمان کی بہت بڑی تعداد کے بارے میں جن کا اوپر کے صفحات میں ذکر کیا جا چکا ہے امریکہ کا فیصلہ یہ ہے کہ نہ تو انہیں ان کی حکومتوں کے حوالے کیا جائے گا نہ ان کے خلاف فوجداری مقدمہ بازی کی جائے گی۔ یقیناً یہ رویہ سرد جنگ کی باقیات کو ظاہر کرتا ہے۔

سے

دوسرے ممالک کی پناہ گاہیں ناقابل برداشت ہیں.....

1995ء میں صدر کلنٹن کے دستخط شدہ صدارتی حکم کا متن یہ تھا۔

”اگر کوئی ایسی ریاست ہمارے ساتھ تعاون نہیں کرتی جس نے ہمارے مطلوبہ دہشت گرد کو پناہ دے رکھی ہے تو ہم تعاون پر آمادہ کرنے کے لیے اس ریاست کے خلاف کسی بھی سخت ترین کارروائی کے مجاز ہوں گے۔ میزبان حکومت کے تعاون کے بغیر مشتبہ افراد کی واپسی کا سب سے مؤثر طریقہ طاقت کا استعمال ہے۔“

آپ نے دیکھا کہ کلنٹن انتظامیہ نے ان ممالک کو سزا دینے کا کتنا مصمم ارادہ کر لیا تھا جو دہشت گردوں کو پناہ دینے کے معاملہ میں اس کی برابری کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ پس فروری 1999ء میں ان کی جانب سے فیصلہ سنایا گیا کہ ہم ان ممالک کے دہشت گردوں کی سہولیات کے مراکز کو بم سے اڑا دینے کا حق رکھتے ہیں۔

دہشت گردی کی لڑائی میں کلنٹن کے کوارڈینیٹر رچرڈ کلارک نے مزید وضاحت کرتے ہوئے اعلان کیا کہ ”ہم صرف دہشت گردی کی سہولیات کو ہی تباہ و برباد نہیں کریں گے بلکہ اگر میزبان ملک ”مصرف معاون پناہ گاہ“ ہے تو اس کو دی جانے والی تمام سہولیات ختم کر کے اس کے خلاف سخت ترین انتقامی کارروائی بھی کر سکتے ہیں۔“

میں نے بہت کوشش کی کہ مسٹر کلارک سے ان کے وائٹ ہاؤس کے دفتر میں ملاقات کی کوئی سبیل نکل آئے۔ دراصل میں ان سے پوچھتا چاہتا تھا کہ امریکہ کو ”معروف معاون پناہ گاہ“ کے خطاب سے نوازنے کی اس تجویز کے بارے میں ان کی کیا رائے ہے جو کیوبا کی جانب سے پیش کی جاسکتی ہے۔ اور جو ”حق“ آپ جتاتے ہیں بالکل اسی طرح کیوبا بھی سی آئی اے ہیڈ کوارٹر کو بم سے اڑا دینے اور دیگر اہم جگہوں میامی میں قائم کیوبا کے جلاوطنی کے دفتر کو تباہ کرنے کا ”حق“ رکھتا ہے۔ بہر حال مجھے بتایا گیا کہ ”مسٹر کلارک کے پاس عام لوگوں سے بات کرنے کے لیے وقت نہیں ہے“..... افسوس..... پس میں نے ایک موہوم سی امید کے ساتھ اپنے ان سوالات پر مشتمل ایک خط ان کے نام روانہ کر دیا کہ شاید مجھے اس کا جواب مل جائے۔

پالپوٹ کی حمایت

• ہر جانب موت کا رقص، خوف اور دہشت کی فضا ہو کا عالم، شہر ویران، گلیاں
ششان..... یہ اسی ”مہذب“ دنیا میں واقع ایک ملک کا چند سال پہلے کا نقشہ ہے۔
سرحدیں بند کر کے بندوق کی نالی پر شہر خالی کرانے کے بعد لاچار انسانوں کو بھیڑ بکریوں کی
طرح ہانک کر ان کی بے بسی سے لطف اندوز ہونے والوں کو اس ایذا رسانی اور قتل و غارت
گری کے لیے کسی خاص وجہ کی ضرورت نہیں تھی۔ کوئی بھی بات وجہ بنائی جاسکتی تھی..... کوئی
بھی چیز موت..... کبھی کام کی زیادتی کے ذریعہ مارا جاتا، کبھی تشدد کے ذریعہ، کبھی بھوک کے
ذریعہ موت کے منہ میں دھکیلا جاتا تو کبھی بیماری کو سبب بنا دیا جاتا۔ ہر طرف موت تھی.....
صرف اور بھروسہ موت.....

پالپوٹ کی زیر سرپرستی کبھڑیا کی اشتراکی جماعت ”خمیر روج“ نے کبھڑیا کے
لاکھوں بے گناہ انسانوں کے خون سے ہولی کھیلی۔ اس حد تک خوف اور دہشت میں مبتلا ہو کر
دنیا نے اس کا مقابلہ نازی خونریزی سے کرنا شروع کر دیا اور بالآخر پالپوٹ کو متفقہ طور پر ہٹلر
سے بدتر قرار دے دیا گیا۔

پالپوٹ حکومت نے چار سال تک ظلم و ستم کا بازار گرم کیے رکھا۔ بالآخر 1979ء
میں جب کبھڑیا میں مقیم ویتنامیوں پر ”خمیر روج“ کے برسوں سے جاری نسلی حملے ویت نام
کے لیے ناقابل برداشت ہو گئے اور خود ویتنام میں ”خمیر روج“ کی سرحد پار مدخلتیں حد سے
زیادہ بڑھ گئیں تو بہت زیادہ تنگ آ کر جوابی کارروائی کرتے ہوئے ویتنام نے کبھڑیا پر حملہ کر
دیا جس کے نتیجے میں پالپوٹ کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا اور اس کی جگہ ویتنام کی مرضی کی حکومت
قائم کر دی گئی۔ خمیر روج کی فوجیں پیچھے ہٹتے ہٹتے تھائی لینڈ کی سرحد کے ساتھ کبھڑیا کے

انتہائی مغرب میں چلی گئیں۔ بعد ازاں انہوں نے تھائی لینڈ میں کمپ قائم کر لیے۔ کبوڈیا کے ڈراؤنے خواب کے خاتمہ پر امریکہ کا روٹل خاصا شدید تھا۔ اس نے اس بات پر باقاعدہ دکھ اور افسوس کا اظہار کیا کہ اقتدار قابل نفرت ویتنامیوں کے پاس چلا گیا ہے۔ اس کی یہ ناپسندیدگی محض زبانی کلامی ہی نہیں تھی بلکہ اسی سال ویتنام کے اس اقدام کو ”غیر قانونی“ قرار دیتے ہوئے اس کی باقاعدہ طور پر مذمت کی۔ امریکہ کی جانب سے ویتنام کے لیے نفرت ناپسندیدگی اور تلخی کا یہ مستقل رویہ اس بات کی دلیل ہے کہ امریکہ اب تک اپنے ان زخموں کو بھول نہیں پایا جو اپنی بھرپور طاقت استعمال کرنے کے باوجود ایک چھوٹی سی قوم کو شکست زدہ دے سکنے کی صورت میں اسے ملے تھے۔ اس وقت تو توہین کا بہت ہی زیادہ احساس ہوتا ہے ذلت بہت گہرے گھاؤ لگاتی ہے جب آپ..... دنیا کی عظیم ترین طاقت ہوں۔

پس امریکہ نے اپنی اس توہین کا بدلہ لینے کے لیے اس موقع سے فائدہ اٹھانے کا سوچتے ہوئے ”خمیر روج“ کو ایک بار پھر طاقتور بنانے کا فیصلہ کر لیا۔ ”خمیر روج“ سے اقتدار چھیننے کے فوراً بعد ہی امریکہ نے اسے خوراک کی فراہمی سے لے کر معاشی اور فوجی امداد دینا بھی شروع کر دی تھی۔ مقصد یہ تھا کہ چین اور امریکہ کے بہت پرانے خوشامدی تھائی لینڈ کے تعاون سے پالپوٹ کے فوجی دستوں کو اس حد تک طاقتور بنا دیا جائے کہ وہ ویتنامی فوج کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیں اور پھر کبوڈیا کی حکومت کا خاتمہ ہو جائے۔

صدر کارٹر کے قومی سلامتی کے مشیر برزینسکی کے 1979ء کے ایک بیان کے مطابق ”میں نے چین کو پالپوٹ کی حمایت کے لیے آمادہ کرنے کی کوشش کی“ میں نے تھائی لینڈ کو اس بات کے لیے راضی کیا کہ وہ ”خمیر روج“ کی مدد کرے۔

سوال یہ تھا کہ کبوڈیا کے لوگوں کی کیسے مدد ملی جائے۔ پالپوٹ ایک قابل نفرت انسان تھا۔ ہم اس کی حمایت نہیں کر سکتے تھے مگر چین ایسا کر سکتا تھا۔“

نومبر 1980ء میں سی آئی اے کے سابق ڈپٹی ڈائریکٹر ”رے کلائن“ نے نومنتخب صدر رونالڈ ریگن کے سینئر مشیر برائے خارجہ پالیسی کی حیثیت سے کبوڈیا میں قائم خمیر روج اٹلیو کو دورہ کیا۔ خمیر روج کی جانب سے جاری ہونے والی پریس ریلیز کے مطابق ”ہزاروں دیہاتیوں نے کلائن کا نہایت گرمجوشی سے استقبال کیا۔“ ریگن انتظامیہ اس وقت نمایاں طور پر

دینا نام کی حمایت یافتہ نوم پین حکومت کی مخالفت کی پالیسی پر عمل پیرا تھی۔
 کبوڈیا میں کام کرنے والی بعض امدادی تنظیموں نے انسانیت کی بہبود کے اپنے
 مقصد کو مد نظر رکھتے ہوئے خمیر روج کے گوریلوں کی بھی مدد کرنے کا سوچا کیونکہ یو عیض اور
 ریڈ کراس کی بین الاقوامی کمیٹی نے ایسی گوریلا تنظیموں کی امداد پر پابندی عائد کر رکھی تھی مگر اس
 دوران بہت سے انکشافات ہوئے۔ امریکی امدادی تنظیم کے دو کارکنوں لنڈا مسین اور
 راجر براؤن کی اس تحریر سے بہت سے خفیہ حقائق سامنے آئے۔ انہوں نے لکھا کہ ”تھائی لینڈ“
 جس نے امدادی کاموں کی میزبانی کی اور امریکہ جس نے اس امدادی آپریشن کے لیے بہت
 زیادہ فنڈز فراہم کئے مستقل اس بات پر اصرار کرتے رہے کہ ”خمیر روج“ کی زیادہ سے زیادہ
 مدد کی جائے۔“

81-1979ء کے دوران تجارتی رہنے والا خوراک کا عالمی پروگرام مکمل طور پر امریکہ
 کے دباؤ میں تھا۔ اس پروگرام کے تحت خوراک کی مدد میں تقریباً بارہ ملین ڈالر خمیر روج کے
 سرحدی کیپوں میں تقسیم کرنے کے لیے تھائی فوج کے حوالے کئے گئے۔
 1982ء میں امریکہ نے خمیر روج کی سیاہ کاریوں پر طبع سازی کرتے ہوئے
 مضبوط آؤفر اہم کرنے اور اپنی امداد کو جواز عطا کرنے کی ایک اور کوشش کی۔

اس نے خمیر روج اور کبوڈین حکومت کے مخالف دو غیر اشتراکی گروپوں کے
 اشتراک سے ایک نئی اتحادی جماعت تشکیل دے دی۔ ان میں سے ایک گروپ کا سربراہ
 کبوڈیا کا سابق حکمران شہزادہ سہاگو تھا۔ اس اتحادی جماعت نے امریکہ اور چین سے بے
 تحاشہ امداد حاصل کی۔ امداد کی ترسیل زیادہ تر تھائی لینڈ کے ذریعہ ہوئی۔ 80 کی دہائی کے
 اواخر میں اس امریکی امداد کا سرکاری تخمینہ 5 ملین ڈالر لگایا گیا جبکہ حقیقت یہ تھی کہ سی آئی اے
 کی وساطت سے 20 سے 24 ملین ڈالر تک کی امداد کی جا چکی تھی مگر اسے کانگریس سے مخفی
 رکھا گیا تھا۔ بظاہر یہ امداد انسانیت کے نام پر جاری تھی مگر یہ حقیقت کسی سے پوشیدہ نہیں ہے
 کہ اس قسم کی امداد دوسرے پہلے کو بھی آزاد کر دیتی ہے جو اسلحہ کی عالمی منڈیوں فوجی سازو
 سامان کی خریداری کے سلسلہ میں استعمال ہوتی ہے۔ سرکاری طور پر تو امریکہ خمیر روج کو یہ
 امداد مہیا نہیں کر رہا تھا مگر حقیقت بہر حال عیاں تھی کہ اس سے سب سے زیادہ فائدہ اٹھانے
 والی پاپوٹ کی فوجیں تھیں۔ جیسا کہ ایک امریکی افسر نے کہا کہ ”اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر

اتحاد کو فتح حاصل ہوگئی تو خمیر روج دوسروں کو زندہ کھا جائے گی۔“ سی آئی اے اور چین نے ہر موقع پر براہ راست خمیر روج کو ہتھیاروں کی ترسیل جاری رکھی۔

1985ء سے ایک وفاقی قانون نافذ ہے جس کے مطابق حکومت پر پابندی عائد ہے کہ وہ کبوڈیا کو بالواسطہ یا بلاواسطہ ایسی کسی مد میں پیسہ نہیں دے گی جو خمیر روج کی لڑائی کی استعداد میں اضافہ کے لیے مددگار ثابت ہو۔

1990ء میں جب تسلسل سے یہ رپورٹس آنا شروع ہوئیں کہ اتحادی جماعت کو دی جانے والی امداد خمیر روج کے استعمال میں ہے تو بش انتظامیہ نے سرکاری طور پر اس پروگرام پر پابندی عائد کر دی۔ یہ سمجھ میں نہیں آ سکا کہ آیا یہ واقعی قانون کی پابندی کے لیے ایک سنجیدہ کوشش تھی یا پھر نقصان پر قابو پانے کا ایک جتن۔ یہ بھی واضح نہیں ہو سکا کہ یہ پابندی اگر واقعی عائد ہوئی تھی تو کتنے عرصہ تک جاری رہی۔ اس سال فروری میں انتظامیہ کی جانب سے کانگریس کے علم میں لایا گیا کہ ہو سکتا ہے کہ کسی غیر مخصوص مدت کے دوران امریکی حمایت یافتہ غیر اشتراکی قوتوں اور خمیر روج کے درمیان ”فوجی حکمت عملی کا تعاون“ رہا ہو۔

اس دوران خمیر روج اس امداد کا استعمال کرتے ہوئے کبوڈیا کے دیہاتوں پر مسلسل حملوں میں مصروف رہی جس کے نتیجہ میں کسانوں کی ہلاکتیں اور مونیٹیوں اور فصلوں کی بہت بڑے پیمانے پر تباہی و بربادی عمل میں آئی مگر یہ نوم پن حکومت کے بڑا خطرہ نہیں تھی۔

امریکہ نے اقوام متحدہ میں کبوڈیا کی نشست کے سلسلہ میں خمیر روج کا نہایت کامیابی سے دفاع کیا حالانکہ جنوری 1979ء میں انکا اقتدار ختم ہو چکا تھا لیکن امریکہ کی حمایت کے ساتھ انہوں نے 1993ء تک اس نشست پر قبضہ جمائے رکھا۔ 1982ء کے آغاز میں یہ نمائش نشست اتحاد کی نمائندگی کر رہی تھی اور اقوام متحدہ میں ان کا نمائندہ تھیوں پر استھ پالپوٹ کے گھناؤنے جرائم کا نہایت نمایاں عذر خواہ تھا جس نے انہیں پوشیدہ رکھنے میں اہم کردار ادا کیا۔ ”نیوزویک“ کے نمائندہ نے جب اس سے پالپوٹ کے دور حکومت میں کبوڈیا کے دس لاکھ معصوم اور بے گناہ انسانوں کی خونریزی کے بارے میں استفسار کیا تو اس نے جواب میں کہا کہ ہمارا اندازہ ہے کہ دس سے بیس ہزار افراد ہلاک ہوئے تھے اور ان میں سے بھی 80 فیصد ان دیتامیوں کے ہاتھوں مارے گئے تھے جو ہماری حکومت میں گھسے ہوئے تھے۔

80ء کی دہائی کے اواخر اور 90ء کی دہائی کے آغاز میں اس حوالے سے امریکی دباؤ شدت اختیار کر گیا کہ کبوڈیا کی حکومت ختم کر کے اس کی جگہ خیر روج کی شمولیت سے عبوری حکومت قائم کی جائے اور پھر انتخابات کرائے جائیں۔ حالانکہ امریکہ پاپوٹ اور اس کے بیروکاروں کے خلاف کبوڈیا کے عوام اور عالمی برادری کی مسلسل بڑھتی ہوئی نفرت سے آگاہ تھا۔ اور اس بات سے بھی اچھی طرح واقف تھا کہ ستمبر 1989ء ویتنام اپنی فوجیں کبوڈیا سے واپس بلا چکا ہے۔

آئیے اب ذرا اس سارے پس منظر کو ذہن میں رکھتے ہوئے جناب صدر کلنٹن کا یہ بیان بھی ملاحظہ فرمائیے جو انہوں نے پاپوٹ کی موت پر جاری کیا۔

”خیر روج کے رہنما پاپوٹ کی موت کے ساتھ ہی دنیا کی توجہ ایک بار پھر بیسویں صدی کے المناک ترین باب کی جانب مبذول ہو گئی ہے۔ خیر روج کے کرتا و صرتا جو 1975ء سے 1979ء تک اقتدار میں رہے اور اس دوران وسیع پیمانے پر انسانی حقوق کی سنگین خلاف ورزیاں کرتے رہے آج بھی بہت بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ خیر روج کے رہنماؤں میں سے بدنام ترین رہنما کی موت کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم اس کے دیگر ساتھیوں کو انصاف نے کٹہرے میں کھڑا کرنے کا مشن ادمورا چھوڑ دیں گے۔“

(صدر ولیم کلنٹن 16 اپریل 1998ء)

حصہ دوم

”امریکہ کا انسانیت کے خلاف تباہ کن ہتھیاروں کا استعمال“

بمباریاں

”بین الاقوامی قانون کے مطابق یہ ایک سکیڈل ہے۔ مت بھولے کہ جب رہائشی علاقوں، شہروں اور دیہاتوں کی بلا روک ٹوک تباہ کاری عرصہ دراز سے جنگی جرم ہے تو پھر ہوائی جہازوں کے ذریعہ شہروں پر بمباری کرنے والے کو نہ صرف یہ کہ سزا نہیں دی جاتی بلکہ اسے قصور وار بھی نہیں ٹھہرایا جاتا۔ فضائی بمباری ریاستی دہشت گردی ہے، امیروں کی دہشت گردی۔ جتنے آج تک دہشت گرد پیدا ہوئے ہیں، فضائی بمباری کی وجہ سے گزشتہ چھ دہائیوں میں اس سے کہیں زیادہ معصوم جل کر راکھ ہو چکے ہیں، ان کے جسم چیتھڑوں میں تبدیل ہو چکے ہیں۔ کوئی ایسی چیز ہے جس نے اس حقیقت کے خلاف ہمارے ضمیر بے حس کر دیئے ہیں، ہم ہرگز بھی کسی ایسے شخص کو امریکہ کا صدر نہیں بنانا چاہیں گے جس نے کبھی کسی پر بھوم ریستوران پر بم پھینکا ہو مگر ہم ایسے شخص کو ضرور بخوشی منتخب کر لیتے ہیں جس نے ہوائی جہاز سے بمباری کر کے نہ صرف ریستورانوں کو تباہ کیا بلکہ گرد و نواح کی عمارتوں اور ان میں بسنے والوں کو بھی ملیا میٹ کر دیا۔ غلج کی جنگ کے بعد میں عراق گیا۔ اور وہاں اپنی آنکھوں سے بمباری کی جو کارستانیاں دیکھیں اس کے لیے مناسب ترین لفظ ”بلا روک ٹوک تباہ کاری“ ہی ہے۔

(سی ڈگلس لیوس - ماہر سیاسیات)

مندرجہ بالا تحریر 1994ء یعنی یوگوسلاویہ کے ”بلا روک ٹوک تباہ کاری“ کی زد میں

آنے سے قبل کی ہے۔ جنگ عظیم دوم کے بعد امریکہ کی بمباری کا نشانہ بننے والے ممالک کی طویل فہرست میں ابھی تک یوگوسلاویہ کا شمار تازہ ترین شکار کی حیثیت سے کیا جاتا ہے۔ (اب افغانستان ہے اور اس کے بعد نہ جانے کون سے ممالک ہونگے)

وہ ملک یا وہ افراد جو امریکی فوج یا سیاسی رہنماؤں کی نظر کرم کا شکار ہو جاتے ہیں ان پر فضائی بمباری یا طویل فاصلوں سے میزائل داغنے کے جو مقاصد سمجھ میں آتے ہیں ان میں سے ایک تو یہ کہ زمینی جنگ کی صورت میں امریکیوں کی جانوں کو خطرہ ہو سکتا ہے اور دوسرا شاید یہ کہ شکار ہونے والوں کی لاشوں پر نظر نہ پڑے اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی کچھ گھروں میں ٹی وی کے سامنے بیٹھے ہوئے امریکیوں کے اپنی حکومت کے حوالے سے نیک جذبات بدستور قائم رہیں۔

امریکی الہکار آسمان پر سے پھینکے جانے والے امریکی بموں اور سرکاری طور پر نامزد دشمنوں کی جہاز کے لیے استعمال ہونے والے انسانیت کے لیے تباہ کن ہتھیاروں میں تمیز کرنے کے حوالے سے بہت محتاط ہیں۔ ”انسانیت کے لیے تباہ کن ہتھیاروں“ کی بات کرتے ہوئے امریکی حکومت کا لہجہ نہایت سخت اور بے رحم ہو جاتا ہے۔ وہ انہیں ایٹمی، کیمادبی اور حیاتیاتی بتاتے ہوئے یہ واضح کرنا بھی نہایت ضروری سمجھتی ہے کہ یہ امتیاز نہ برتنے والے ہیں یعنی یہ صرف فوجی مقاصد کے لیے محدود نہیں ہیں۔

یہ صرف کہنے ہی کی بات نہیں وہ اس کا وقتاً فوقتاً عملی طور پر اظہار بھی کرتا رہتا ہے۔ عراق اور یوگوسلاویہ میں امریکہ نے اپنے ”سارٹ“ بموں کے ذریعہ غیر فوجی مقامات کو جن میں بے شمار رہائش گاہیں، سکول اور ہسپتال شامل تھے جان بوجھ کر نشانہ بنایا اور تباہ و برباد کر کے رکھ دیا۔

مزید برآں امریکہ عام استعمال کے ہتھیاروں کو ”انسانیت کے لیے تباہ کن ہتھیاروں“ کی صف میں شامل نہیں کرتا جیسے بارودی سرنگیں، کلستر بم وغیرہ حالانکہ یہ بھی امتیاز نہ برتنے والے ہیں۔

”انسانیت کے لیے تباہ کن ہتھیاروں“ کی مزید تعریف یہ کی جاتی ہے کہ ایسے ہتھیار جن کے اثرات فضا میں شامل ہونے کے بعد انسانوں کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ اس تعریف پر تو بارودی سرنگیں، کلستر بم اور ڈیلیپلڈ پورٹیم ہتھیار بھی اترتے ہیں بلکہ آخر الذکر تو

پھٹنے کے بعد بہت عرصہ خطرناک حد تک گرم تاب رہتا ہے۔
 ”روایتی“ بموں کے حوالے سے ضرور یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ اس تعریف پر بہت کم پورے اترتے ہیں مگر اس حد تک ضرور اس کے مطابق ہیں کہ گرائے جانے والے ان بموں میں بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جو نہیں پھٹتے اور ان کی طرف سے مستقل یہ خطرہ رہتا ہے کہ نجانے کب یہ پھٹ جائیں اور تباہ حال عمارت مکمل طور پر مسمار ہو جائے۔
 جنگ عظیم دوم کے بعد امریکی بمباری کا شکار بننے والے ممالک
 ”دہشت گرد وہ ہوتا ہے جس کے پاس بم تو ہو مگر فضا یہ نہ ہو۔“

1945-46ء	چین
1950-53ء (جنگ کوریا)	کوریہ اور چین
1953ء	گوئے مالا
1958ء	انڈونیشیا
1959-1961ء	کیوبا
1960ء	گوئے مالا
1964ء	کامبوڈیا
1965ء	بھارت
1964-73ء	لاؤس
1961-73ء	ویتنام
1969-70ء	کمبوڈیا
1967-69ء	گوئے مالا
1983ء	گریناڈا
1984, 1983ء (لبنان اور شام نشانہ تھے)	لبنان
1986ء	لیبیا
1980ء کی دہائی	ایل سلواڈور
1980ء کی دہائی	نکاراگوا

1987ء	ایران
1989ء	پانامہ
1991ء	عراق
1991ء	کویت
1993ء	صومالیہ
1994ء، 1995ء	بوسنیا
1998ء	سوڈان
1998ء	افغانستان
1999ء	یوگوسلاویہ
2001ء	افغانستان

مزید؟

O چین

1999ء میں بلغراد میں سفارتخانہ پر جو بمباری کی گئی تھی قانونی طور پر یہ چین کا علاقہ ہے اور اب اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ بمباری کسی حادثہ کا نتیجہ نہیں تھی۔

O بلغاریہ اور مقدونیہ

1999ء میں یوگوسلاویہ پر بمباری کے دوران بھی امریکی میزائلوں کا نشانہ بنے۔

O پاکستان

1998ء میں افغانستان پر بمباری کے دوران ایک میزائل یہاں بھی گرا۔

O فلاڈلفیا، پنسلوانیہ

13 مئی 1985ء کو پولیس ہیلی کاپٹر نے گرائے جانے والے بم نے ایک پورے بلاک کو جلا کر رکھ دیا۔ تقریباً ساٹھ گھربتہ ہو گئے جبکہ گیارہ افراد جن میں کئی بچے بھی شامل تھے ہلاک ہو گئے۔ یہ پولیس، میئر اور ایف بی آئی کی مشترکہ کارروائی تھی جس کا مقصد سیاہ فام تنظیم ”موو“ کو اس گھر سے بے دخل کرنا تھا جہاں وہ قائم تھی۔

وہ لوگ جو ہمیں ششدر کر دیں

ہمیں ایسے جھگڑوں کی توقع رکھنی چاہیے جن میں ہم سے مختلف تہذیب و تمدن کا حامل دشمن تشدد کے ایسے طریقے اختیار کر سکتا ہے جو ہمیں حیران و پریشان کر کے رکھ دیں۔
(محکمہ دفاع۔ 1991ء)

بہی فطرت ہے

جب وسطی امریکہ میں دس ہزار افراد طوفانِ باد و باران کا شکار ہو کر لقمہ اجل بن جاتے ہیں تو ذرائع ابلاغ اسے ”انسانی تاریخ کا المناک حادثہ“ قرار دیتے ہیں۔ اور جب امریکی بمباری سے دس ہزار عراقی ہلاک ہو جاتے ہیں تو بیٹھا گون اسے ”درمیانہ درجے کا ایک واقعہ“ قرار دیتا ہے۔

یہ تخمینہ 1998ء میں کنٹینن انتظامیہ کے اعلیٰ افسران کے باہمی مباحثہ کے دوران لگایا گیا تھا جس میں وہ اقوام متحدہ کی ہتھیاروں کے معائنہ کی مہم میں درپیش عراقی رکاوٹوں سے نمٹنے پر غور کر رہے تھے۔

امریکہ بمقابلہ اسامہ بن لادن

یہ اپنی نوعیت کا ایک نہایت ہی غیر معمولی اور انوکھا واقعہ ہے کہ امریکی حکومت نے ایک فرد اسامہ بن لادن کو کروڑوں میزائلوں کا نشانہ بنایا۔

کیا اس سے پہلے کسی ایسا ہوا ہے کہ دنیا کی کسی حکومت نے کسی فرد واحد کے خلاف اعلان جنگ کیا ہو؟

بچ جانے والوں کا احوال

امریکن میڈیکل ایسوسی ایشن کی ایک تحقیق ”ادکلا ہاما بمباری میں بچ جانے والوں میں دماغی امراض“ کے مطابق

”بمباری میں بچ جانے والوں کی تقریباً نصف تعداد سنگین دماغی امراض میں مبتلا ہو گئی تھی جبکہ ایک تہائی واقعہ کے بعد شدید ذہنی دباؤ کا شکار ہو کر رہ گئے تھے۔“

مارٹن کیلی، عدم تشدد کی ویب سائٹ کا پبلشر

”ہمیں کبھی دھواں اور آگ دکھائیں ہیں دیتی، ہمیں کبھی خون کی بو محسوس نہیں ہوتی، ہمیں کبھی بچوں کی آنکھوں میں چھپی دہشت نظر نہیں آتی جن کے ڈروانے خواب اب انجانے دہشت گردوں کی طرف چنگھاڑے ہوئے میزائلوں پر مبنی ہوں گے، جو امریکیوں کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔“

ڈبلیٹڈ یورینیم

ماحولیات کے حوالے سے بین الاقوامی سطح پر سرگرم شخصیت ڈاکٹر ہیلن کالڈیکوٹ نے کئی سال پہلے لکھا کہ ”امریکہ نے دواہشی جنگیں مسلط کیں پہلی 1945ء میں جاپان کے خلاف اور دوسری 1991ء میں کویت اور عراق میں۔“
ہم اب اس فہرست میں تیسری یعنی 1999ء میں یوگوسلاویہ کے خلاف ہونے والی جنگ کا اضافہ کر سکتے ہیں۔

ڈبلیٹڈ یورینیم ایٹمی ری ایکٹرز اور ہتھیاروں کے لیے زرخیز ایندھن کی پیداوار کی ضمنی پیداوار ہے۔ یہ فوجی ساز و سامان مثلاً ٹینک، بم، راکٹ اور میزائل سازی میں استعمال ہوتا ہے۔

ڈبلیٹڈ یورینیم چونکہ لوہے سے زیادہ ٹھوس ہوتا ہے اس لیے ایسے کارٹوس جن میں یہ شامل ہوتا ہے ٹینک سے بھی زیادہ مضبوط اسلحہ میں یا آسانی سو راخ کر سکتے ہیں مگر ڈبلیٹڈ یورینیم میں ایک قباحہ ہے کہ یہ گرم تاب ہے اور دیگر تمام بھاری دھاتوں کی طرح یورینیم بھی کیمیائی لحاظ سے زہر آلود ہے۔ نشانہ پر لگنے کے بعد ڈبلیٹڈ یورینیم باریک ذرات میں تبدیل ہو کر ہوا میں تحلیل ہو جاتا ہے جو کہ سانس کے ساتھ جسم میں داخل ہو کر پھیپھڑوں گردوں یا جسم کے کسی اور حصے میں جمع ہو جاتے ہیں اور بعد میں پھیپھڑوں کے کینسر، ہڈیوں کے کینسر، گردوں کی بیماری، جنسیاتی نقائص یا دیگر مہلک بیماریوں کا باعث بنتے ہیں۔

فلج کی جنگ میں بے شمار عراقی اور امریکی سپاہی، امریکی جنگی جہازوں اور ٹینکوں کی کولہ باری کے نتیجے میں ہزاروں ٹن ڈبلیٹڈ یورینیم سے متاثرہ فضا میں سانس لیتے رہے۔ آپریشن ڈیزرٹ شیلڈ یا ڈیزرٹ سٹارم سے ایسوسی ایشن نے اپنی ایک تحقیق میں انکشاف کیا

کہ پراسرار بیماریوں میں مبتلا ہونے والے علاج کی جنگ کے تجربہ کار 10,051 سپاہیوں میں سے 82 فیصد ایسے تھے جو دشمن کی پکڑی ہوئی گاڑیوں میں گھس گئے تھے جو کہ ڈبلیوڈیوٹیم ہتھیاروں کا اہم ترین نشانہ تھیں۔ وہ نہ صرف یہ کہ اس خطرہ سے لاعلم تھے بلکہ انہیں تو ڈبلیوڈیوٹیم کے وجود کا ہی پتہ نہیں تھا۔

برطانیہ کی اٹاک انرجی اتھارٹی نے 1991ء میں اپنی ایک رپورٹ میں خبردار کیا کہ ”کویت اور جنوبی عراق میں گرم تاب ڈبلیوڈیوٹیم اور زہریلا طبعہ بمباری کی باقیات کی صورت میں اتنی زیادہ تعداد میں ہے کہ اس کی وجہ سے کینسر کی شرح میں خوفناک حد تک اضافہ ہونے سے پانچ لاکھ افراد لقمہ اجل بن جائیں گے۔“

یہ تخمینہ حقیقت پسندانہ نہیں ہے۔ جو بات اس رپورٹ میں کہی گئی ہے اس کے مطابق تو یہ صورت بنتی ہے کہ ڈبلیوڈیوٹیم کے تمام گولہ بارود کا سفوف بنا کر پانچ لاکھ افراد کو صحرا میں ایک قطار میں کھڑا کر دیں اور پھر یکساں مقدار میں یہ سفوف سانس کے ذریعہ ان کے جسموں میں داخل کر دیا جائے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ڈبلیوڈیوٹیم کا طبعہ جو وہاں ہر طرف ہر جگہ مختلف صورتوں میں موجود ہے ہر لمحہ خطرہ کا باعث ہے اور فضا میں گرم تاب صورت میں یہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خطرہ ہے۔ مزرے اگر یہ خوراک یا پانی میں شامل ہو جاتا ہے تو صحت عامہ کے مسائل میں خطرناک حد تک اضافہ کا باعث بنے گا۔

اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ اس وقت یہ مٹی میں بھی ہو سکتا ہے پانی میں بھی ہوا میں بھی اور یوگوسلاویہ کی عوام کے پچھپھردوں میں بھی۔

1995ء میں عراقی محکمہ صحت کے افسران نے خبردار کیا تھا کہ نہ معلوم اور کیا ب قسم کی بیماریوں کی شرح میں پریشان کن حد تک اضافہ ہو رہا ہے اور یہ بیماریاں ابتدائی طور پر بچوں میں پائی جا رہی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے اس سے متعلق ایک رپورٹ اقوام متحدہ کو بھی بھجوا دی تھی۔ جن بیماریوں کی شرح خوفناک اضافہ عمل میں آیا ان میں لیوکیمیا، کیرسینوما، نظام ہضم اور پچھپھردوں کا کینسر، آخری وقت میں اسقاط حمل، قدرتی بد صورتی جیسے دماغ کا نہ ہونا یا ٹیڑھی میڑھی اور جلی ہوئی انگلیاں اور نچے اور طبی بیماریاں شامل تھیں۔ یہ تمام بیماریاں وہی تھیں جو علاج کی جنگ کے تجربہ کار سپاہیوں کے پیدا ہونے والے بچوں میں بھی پائی گئی تھیں۔

بین الاقوامی نیلو کراس کے آسٹریں صدر ڈاکٹر ”سجورت کٹمر“ کے مطابق
 ”عراق پر بمباری میں ڈپلینڈ یورینیم کا استعمال اتحادیوں کی ایک مشترکہ نمایاں
 خصوصیت تھی۔“

سکاٹ لینڈ میں وزارت دفاع کی فائرنگ رینج کے ارد گرد سولے فرتحہ کے نزدیک
 ڈنڈرینس میں لیوکیما کے مرض تشویشناک اضافہ کی وجہ ڈپلینڈ یورینیم کو قرار دیا گیا۔ اس کی وجہ
 یہ ہے کہ 1983ء میں اس رینج کے ارد گرد کی آبادیوں میں آزمائشی طور پر سات ہزار گولے
 پھینکے گئے تھے۔

ایک رپورٹ کے مطابق یو کے میں بچپن سے لیوکیما کا شکار ہونے والوں کی شرح
 سب سے زیادہ اسی علاقہ میں ہے۔ امریکہ نے صرف بیرونی دنیا کو ہی نشانہ نہیں بنایا بلکہ اپنے
 شہریوں کو بھی ان جانے والا شعلوں اور مہلک زہر کا شکار بنایا۔ کیلیفورنیا ساحل کے ساتھ
 کھٹ جزیرے پر گرائے جانے والے ڈپلینڈ یورینیم کے خوفناک اثرات کا اندازہ چند ہی روز
 میں ہو جائے گا جب یہ سمندر کے پانی اور ہوا کے ذریعہ پورے علاقے میں پھیل جائے گا۔

یہ جزیرہ تقریباً غیر آباد ہے پورٹوریکو کے جزیرہ وائیگیٹس کی طرح نہیں جہاں
 نو ہزار سے زائد امریکی شہری آباد ہیں اور وہ تقریباً ساٹھ برس سے مسلسل جنگی مشقوں اور فضائی
 حملوں کے تجربات کی زد میں ہیں۔ پہلے نیام بم (ہیروئیم جلی سے بننے والا آتش گیر بم) کا
 نشانہ بنے رہے اور حالیہ برسوں میں ڈپلینڈ یورینیم کے گولوں کا شکار ہیں۔ پورٹوریکو کی ایک
 سرگرم شخصیت کا دعویٰ ہے کہ ”وائیگیٹس کی فضا میں ڈپلینڈ یورینیم اس حد تک شامل ہو گیا ہے کہ
 اس کی وجہ سے یہاں کینسر کا شکار ہونے والوں کی شرح قومی اوسط سے دو گنا ہو چکی ہے۔“ اس
 سلسلہ میں ہونے والی تحقیقات سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ حقیقتاً پورٹوریکو کی 78 میونسپلٹیوں میں
 کینسر کی سب سے زیادہ شرح وائیگیٹس میں ہے۔ مزید برآں جزیرہ کی حالت زار پر ایک
 رپورٹ کے مطابق ”جزیرہ میں پینے کا پانی‘ ساہا سال سے ہونے والی فضائی گولہ باری کے
 زہریلے ذرات سے تشکیل پانے والے کیمیائی مادوں سے مکمل طور پر آلودہ ہو چکا ہے۔ اپریل
 1999ء میں اپنے نشانہ سے تین میل دور گرنے والے بم سے ایک شہری محافظ ہلاک جبکہ دیگر
 تین زخمی ہو گئے۔ جزیرہ کی صورتحال یہ ہے کہ یہاں ہر جانب بموں اور گولوں کے خول نظر
 آتے ہیں اور ان میں ایسے بم بھی شامل ہیں جو امریکی بحریہ کے مطابق ابھی تک زندہ

ہیں۔ 1997ء میں ایک شہری علاقہ میں ایک کنٹینر ملا جس میں تین بغیر چلے ٹینک شکن راکٹ موجود تھے جو کہ ڈیلیٹڈ یورینیم سے بنے ہوئے تھے ایسے ہی سانچوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ چار سال قبل شہری رہائنگاہوں سے محض ڈیڑھ میل کے فاصلے پر پانچ سو پونڈ وزنی پانچ بم گرائے گئے جو قیامت خیز دھماکوں کے ساتھ پھٹے۔“

ان ظالمانہ کارروائیوں کے خلاف بڑھتے ہوئے احتجاج کے باعث امریکی فوجی حکام نے پورٹوریکو سٹیٹ کے ارکان کو بتایا کہ وہ امریکہ کے مشرقی ساحل پر جنگی مشینیں نہیں کر سکتے کیونکہ آبادی کے مراکز یہاں سے بے حد قریب ہیں۔ کئی وجوہات کی بناء پر اس بات نے ملک بھر میں لوگوں کے غصے اور نفرت میں حریدہ اضافہ کیا۔ اس موقع پر صدر کلنٹن نے ہوشمندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اعلان کیا کہ امریکہ کی بحریہ پانچ سال کے اندر اندر داینگٹن کی حدود میں بمبازی سے دستبردار ہو جائے گی۔ بعد ازیں حکومت نے جزیرہ کے لیے چالیس ملین ڈالر کی امداد کی پیشکش کی اور پھر حریدہ پچاس ملین ڈالر کی امداد کی اس شرط پر پیشکش کی کہ اگر لوگ طے شدہ ریفریغزم میں اپنی رائے دیں کہ ”قومی سلامتی کچھلی دہائیوں کے دوران جب ہم خاموشی سے بے خبری کی زد کی گذار رہے تھے فوجی صنعتی کمپلیکس بھی بہت خاموشی سے خصوصاً مغربی ریاستوں میں عوامی زمینوں کے حصول کے لیے کانگریس کے اراکین ریاستی قانون سازوں اور ایسے لوگوں کو جو بلاچون و چرا اس کی بات مان لیں نہیں فراہم کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ رکاوٹ بننے والے ماحولیاتی اور دیگر قوانین سے بچنے کے لیے اجازت ناموں کا حصول بھی اس کا مطمح نظر تھا۔ بعد میں کیلیفورنیا، نیواڈا، ڈاکوٹا، نیو میکسیکو اور دیگر ریاستوں میں واقع یہ لاکھوں ایکڑ ڈیلیٹڈ یورینیم ہتھیاروں کے لیے تجربہ گاہوں میں تبدیل کر دیے گئے۔ ان میدانوں میں ڈیلیٹڈ یورینیم ہتھیاروں کی آزمائشیں مشقین ہونے لگیں۔

نیو میکسیکو میں 1950ء سے ڈیلیٹڈ یورینیم کی کئی فضا میں مشقین دھنوں دھنوں سے جاری ہیں۔ لاس الاموس نیشنل لیبارٹری، ڈائٹ سیٹز میزائل ریج، سوکورو میں نیو میکسیکو انسٹیٹیوٹ آف میننگ اینڈ ٹیکنالوجی اور ایلتورن میں سیٹیا نیشنل لیبارٹری نامی یہ ادارے پھاڑوں اور زمین میں ڈیلیٹڈ یورینیم کے دھماکے کرنے اور میدانوں، ہوا اور پانی کو آلودہ کرنے کے حوالے سے مشہور ہیں اس کے ساتھ ساتھ وہ ریاست کے شہریوں کو یہ یقین دلانے کے لیے ان پر باقاعدہ طور پر دباؤ ڈالتے ہیں کہ اگرچہ ہم بھی آلودگی کو تسلیم کرتے ہیں مگر تابکاری

اثرات اتنے زیادہ نہیں ہیں جتنا کہ مشہور کیا جا رہا ہے۔ یہ ای پی اے کی حفاظتی سطح کی حدود سے تجاوز نہیں کرتیں۔ اس پر وہ قدیم مثال صادق آتی ہے کہ ”نہ تو ہوا میں سانس لو نہ پانی پو اور نہ ہی اپنے بچوں کی قریب میں کہیں پرورش کرو۔“

سوکورو کے رہائشی 1986ء تک اس بات سے قطعی بے خبر تھے کہ ان کے علاقے سے دو میل سے بھی کم فاصلے پر 1872ء سے ڈیپلنڈ یورینیم کے تجربات جاری ہیں۔ گزشتہ سالوں میں یہاں ہونے والی اکاؤنٹ تحقیقات میں یہ بات سامنے آئی کہ یہاں پیداؤشی طور پر سر میں پانی بھر جانے کا مرض عام ہے۔ 1999ء میں سوکورو کے شہریوں کی جانب سے یہ مطالبہ شدت اختیار کر گیا کہ علاقہ میں آلودگی اور بڑھتے ہوئے امراض کے حوالے سے تحقیقات کی جائیں۔

اپریل 1995ء میں فرانسیسی جرنل اور فوجی معصف ہیری میری گیلکس کے مطابق ”اگر ہم نیوکلو ڈیپلنڈ یورینیم سے لیس کر دیں تو اس کا مطلب ہے کہ اخلاقی طور پر کیمیائی دہشت گردی کی اجازت ہے۔“ اور جہاں تک قانونی طور پر اجازت کا سوال ہے تو اس سلسلے میں امریکہ اپنے جبر و کار پیدا کر رہا ہے۔ یہاں طاقت کے قانون کی حکمرانی ہے قانون کی طاقت کی نہیں اسی لیے امریکہ کا ڈیپلنڈ یورینیم کا کاروبار روز افزوں ترقی کر رہا ہے۔ جیسا کہ 1996ء کے اواخر تک امریکہ قبائلی لینڈ تائیوان، بحرین اسرائیل، سعودی عرب، یونان، کوریا، ترکی، کویت اور دیگر ممالک کو ڈیپلنڈ یورینیم فروخت کر چکا ہے۔

کلسٹر بم

بیٹھا گون کی جانب سے کلسٹر بم کا شمار ”مجموعی اثر والے گولہ بارود“ میں کیا جاتا ہے جبکہ کلسٹر بم کے خالق اسے ”فضا سے گرائے جانے والے کثیر المقاصد کلسٹر ہتھیاروں کا نظام“ قرار دیتے ہیں۔ انسانی حقوق کی تنظیموں اور باہر دی سرگنوں کے خلاف ہم چلانے والوں کا موقف یہ ہے کہ کلسٹر بم ”انسانیت کے لیے تباہ کن ہتھیاروں“ میں شامل ہیں اور انہیں بغیر کسی دلیل یا وضاحت کے جینوا کنونشن کی ممنوعہ ہتھیاروں کی فہرست میں شامل کر دینا چاہیے۔

کلسٹر بم کو کارگیری کا بہت بڑا نمونہ کہا جاسکتا ہے۔ ہوائی جہاز سے گرائے جانے کے بعد یہ ہماری ہتھیار فضا اور زمین کے عین درمیان میں جا کر کھلتا ہے اور اس میں سے سوڈے کی بوتل کے حجم کے دو سو یا اس سے زیادہ چھوٹے چھوٹے بم برآمد ہو کر فضا میں پھیل جاتے ہیں۔ زمین کی جانب آتے ہوئے یہ چھوٹے چھوٹے بم بھی کھل جاتے ہیں اور ان میں سے سینکڑوں کی تعداد میں تیز رفتار اور تیز دھار لوہے کی گولیاں نکلتی ہیں جو وسیع علاقے کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہیں۔

کلسٹر بم کی یہ تعریف بھی کی جاتی ہے کہ ”لوہے کی آتش گیر گولیاں آندھی کی طرح پھیل کر ہر طرف آگ لگا دیتی ہیں، اپنی دھاتوں کو پگھلا دینے والی خصوصیت کے باعث یہ ٹینکوں اور بکتر بند گاڑیوں میں سوراخ کر دیتی ہیں یہ اتنی تیز دھار اور نوکیلی ہوتی ہیں کہ لوہے کی 1/4 انچ کی پلیٹ یا انسانی گوشت اور ہڈیوں کو قاش کی طرح کاٹ کر رکھ دیتی ہیں۔ ان چھوٹے چھوٹے زردان کی مدگار کی حیثیت سے ننھے ننھے پیراشوٹ بھی ان سے منسلک ہوتے ہیں۔ جو ان کی رفتار کو گھٹاتے ہیں تاکہ زیادہ سے زیادہ انسانوں کا شکار کیا جاسکے۔ بم کے تخلیق کاروں نے انسانی شکار کو ”نرم نشانہ“ کا نام دیا ہے جن میں فوجی اور شہری سبھی شامل

ہیں۔

محکمہ دفاع کے مطابق 1999ء میں یوگوسلاویہ پر بمباری کے دوران امریکی جنگی جہازوں نے 1100 کلستر بم گرائے جن میں سے ہر ایک 202 چھوٹے بموں پر مشتمل تھا۔ گویا 2,22,200 ہتھیار زمین کی جانب دھکیلے گئے۔ محکمہ کے بیان کے مطابق ان کی ناکامی کی شرح 5 فیصد تھی جبکہ دیگر رپورٹس کے مطابق یہ شرح 10 سے 30 فیصد تک تھی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ 11,100 کلستر بم نہیں پھٹے اور یہ علاقے میں بارودی سرنگوں کی طرح کسی بھی لمحہ پھٹنے کے لیے تیار پڑے ہیں۔ امریکی فوج کے بعض ارکان اس بین الاقوامی معاہدہ پر دستخط کرنے کے مخالف تھے۔ جس کے مطابق بارودی سرنگوں کے استعمال تیاری ذخیرہ کرنے اور منتقلی پر پابندی عائد کی گئی ہے۔ مخالفت کی وجہ یہ تھی کہ معاہدہ میں بارودی سرنگوں کی جو تعریف یا وضاحت کی گئی تھی وہ اتنی وسیع تھی کہ اس میں کلستر بم بھی شامل ہو گئے تھے۔ معاہدہ کی تعریف کے مطابق ”بارودی سرنگ اس طرح تیار کی گئی ہے کہ یہ کسی کی موجودگی سے پھٹتی ہے۔ مثال کے طور پر اس جگہ کسی کا پاؤں پڑ جائے یا کسی بھی طرح اس کے وجود اسے چھو جائے جہاں بارودی سرنگ ہے تو یہ فوراً پھٹ جاتی ہے اور پھر وہ فرد یا ارد گرد موجود افراد زخمی ہو جاتے ہیں یا مر جاتے ہیں۔“ انسانی حقوق کے نمائندے اس حوالے سے دلیل دیتے ہیں کہ ”جب کلستر بموں کے تخلیق کار ان میں سے نہ پھٹنے والے بموں کی شرح بھی شمار کرتے ہیں تو انہیں ہا آسانی تعریف کے مطابق بارودی سرنگوں کی صف میں شامل کیا جاسکتا ہے۔“ یہ معاہدہ امریکہ کی شمولیت کے بغیر یکم مارچ 1999ء کو نافذ العمل ہو گیا۔

یہ نہ پھٹنے والے چھوٹے بم بارودی سرنگوں سے زیادہ خطرناک ہیں کیونکہ رنگ برنگی چیزیں اور ننھے ننھے پیراشوٹ عام طور پر بچوں کی توجہ اپنی جانب کھینچتے ہیں اور وہ کھلونا سمجھ کر انہیں پکڑنے کی کوشش کرتے ہیں اور پھر.....؟ 24 اپریل 1999ء کا واقعہ ہے۔ یوگوسلاویہ پر بمباری ختم ہونے سے قبل جنوبی کسود میں ڈوگانووک کے قریب پانچ بھائی بغیر پھٹے کلستر بم کے ساتھ کھینے کی کوشش میں ہلاک جبکہ ان کے دو کزنز شدید زخمی ہو گئے۔ بارودی سرنگیں عام طور پر متوقع جگہوں پر چھبی ہوتی ہیں جبکہ بغیر پھٹے کلستر بم کہیں بھی گر سکتے ہیں خواہ وہ گھر کا صحن ہو سکول یا کھیل کا میدان۔ مزید برآں بارودی سرنگیں کسی حساب کتاب یا نقشوں کے مطابق بچائی جاتی ہیں۔ بغیر پھٹے چھوٹے کلستر بموں کی طرح نہیں۔ ان میں سے

کچھ خود کار ہیں جو مقررہ وقت کے بعد خود بخود پھٹ جاتے ہیں مگر اس بارے میں کوئی رپورٹ سامنے نہیں آئی کہ یوگوسلاویہ میں جو بم گرائے گئے وہ اس قسم کے ہیں۔
بارودی سرنگوں کا معاہدہ کسی بھی موقع پر ”سمارٹ“ اور ”ڈمب“ بارودی سرنگوں میں تفریق کرتا نظر نہیں آتا۔

جون 1999ء میں یوگوسلاویہ پر بمباری ختم ہوئی تو دیہاتوں کے بہت سے علاقے غیر آباد ہو چکے تھے اس وقت وہاں بم ماہرین کی خدمات حاصل کرنے کی اشد ضرورت تھی جو نہ پھٹنے والے بموں کو ناکارہ کرنے کا کام کرتے تاکہ آبادی کے سروں پر سے موت کا یہ مستقل خوف مکمل ختم نہیں تو کم تو ضرور ہوتا اس کے علاوہ یہ بم مستقبل میں زرعی اور معاشی تعمیر نو میں بھی رکاوٹ بنے رہیں گے۔ بمباری ختم ہونے کے بعد اپنے گھروں کو واپس آنے والوں کے ساتھ نہایت المناک واقعات پیش آئے۔ جن میں سے زیادہ تر واقعات کا تعلق ان نہ پھٹنے والے بموں سے ہی تھا ایک واقعہ میں دو برطانوی امن فوجی اور تین البانوی کسود کے ایک گاؤں میں کلستر بم کا شکار ہو کر ہلاک ہو گئے۔

یوگوسلاویہ کے ہڈیوں کے امراض کے ایک ماہر کے مطابق ”میں نے یا میرے ساتھی ڈاکٹروں نے آج تک ایسے خوفناک زخم نہیں دیکھے جو کلستر بموں کا شکار ہونے والوں کو آئے ہیں۔ یہ اس قسم کے زخم ہیں جو معذوری کی انتہا تک لے جاتے ہیں۔ ہڈیوں کا ایسا چورا ہو جاتا ہے کہ متعلقہ عضو علیحدہ کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا۔ نہایت دردناک..... نہایت ہی دردناک۔“

لاؤس میں 73-1965ء تک ہونے والی امریکہ کی کارپٹ بمباری کو ایک نسل گزرنے کی عمر آج بھی نہ پھٹنے والے بموں کی وجہ سے جن میں زیادہ تر کلستر بم شامل ہیں لوگ ہلاک اور زخمی ہو رہے ہیں۔ ایک اندازہ کے مطابق امریکہ کے گرائے گئے دو ملین ٹن بموں میں سے 30 فیصد نہیں پھٹ سکے تھے جس کے نتیجہ میں اب تک گیارہ ہزار حادثات ہو چکے ہیں۔ ”بمیں کا شکار ہونے والے آدمے سے زیادہ لوگ جائے حادثہ پر ہی مر جاتے ہیں۔ اور جو بچ جاتے ہیں ان کی اکثریت شدید زخمی ہوتی ہے خاص طور پر ان کے جسم کے بالائی حصے شدت سے متاثر ہوتے ہیں۔“

”وینٹام اور کمبوڈیا کی بندرگاہیں بھی اسی قسم کے خطرات کی مستقل شکار ہیں جس

سے خلیج فارس کو سامنا ہے۔ 1999ء میں انسانی حقوق کی ایک رپورٹ کے مطابق ”خلیج کی جنگ کے دوران ایک اندازہ کے مطابق 24 سے 30 ملین کلسٹر بم گرائے گئے جن میں سے 1.2 اور 1.5 ملین کی تعداد کے درمیان ایسے تھے جو پھٹ نہیں سکے اور اب تک 1220 کویتی اور 400 عراقی شہریوں کی ہلاکت کا باعث بن چکے ہیں۔

یوگوسلاویہ پر گرنے والے بموں میں سے نہ پھٹنے والے کو لے بارود کے اثرات ملکی حدود سے باہر پہنچ چکے ہیں۔ جنگ کے خاتمے کے دو ماہ بعد نیٹو کے بارودی سرنگوں کا خاتمہ کرنے والے کارکنوں کو بجراڈ ریٹک سے ایک سو اکتھ دھماکہ خیز ہتھیار ملے ہیں جن میں سے 97 کلسٹر بم ہیں۔ اس گولہ بارود کی وجہ سے اٹلی کے کئی ماہی گیر ہلاک یا زخمی ہو گئے جبکہ دوسروں کو نہ صرف یہ کہ سالانہ منافع سے ہاتھ دھونا پڑا بلکہ شدید مالی نقصان بھی برداشت کرنا پڑا کیونکہ بجراڈ ریٹک میں اس وقت تک ماہی گیری پر پابندی عائد کر دی گئی جب تک بارودی سرنگیں صاف کرنے والے باقی دھماکہ خیز ہتھیار بھی تلاش نہ کر لیں۔ اس کے ساتھ ساتھ موسم گرما میں ایڈریٹک کے ساحلوں پر بم پھٹ جانے کے خوف سے سیاحوں کی آمد پر بھی پابندی لگا دی گئی۔

اس دوران پیٹاگون اپنے کام میں مصروف ہے۔ وہ جدید اور بہتر کلسٹر بموں کی تیاری میں تمدی سے جتا ہوا ہے۔ جو پہلے سے زیادہ بہترین ٹیکنالوجی سے آراستہ تپش جذب کرنے والا بہترین چھڑکاؤ کرنے والا تیز دھار ٹوکھلا اور گرم آگ زیادہ سے زیادہ ہلاکتوں کا باعث بننے والا..... کلسٹر بم نئے ملینیم کے لیے نہایت موزوں ہیں۔ امریکہ اس سے کم کا حقدار نہیں۔

امریکہ کا کیمیاوی و حیاتیاتی ہتھیاروں کا بیرون ملک استعمال

زہریلی گیس اور ہر اشی ہتھیار تھذیب کو الٹ کر کے رکھ دیتے ہیں۔
 بیمار یوں سے لڑنے کی بجائے ان کی احتیاط سے پرورش کی جاتی ہے۔
 ڈاکٹر انسانی جسم کے نظام کے بارے میں اپنا علم اس نظام کو ناکارہ
 بنانے کے لیے مؤثر تدابیر اختیار کرنے میں استعمال کرتے ہیں۔ زرعی
 ماہرین جان بوجھ کر ایسے اقدامات کرتے ہیں جن سے فصلوں کی زیادہ
 سے زیادہ تباہی ممکن ہو..... جدید اعصابی گیس (Nerve
 Gases) بنیادی طور پر انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے بنائی گئی تھیں
 مگر فوج کے ہاتھوں میں آ جانے کے بعد یہ انسانوں پر استعمال ہونے
 والی کیڑے مار ادویات بن گئی ہیں۔ کسی مصنف کا اس بارے میں کہنا
 ہے کہ ”کیمیاوی و حیاتیاتی جنگ صحت عامہ کی ضد ہے۔“

جزائر بہاما

40ء کی دہائی کے اواخر سے 50ء کی دہائی کے دوران امریکہ، کینیڈا اور برطانیہ کی
 مشترکہ ٹیم نے یہاں بیکٹیریا کا چھڑکاؤ کیا جو کہ بحر الکاہل کے اس علاقے کے لیے خطرناک
 ترین سمجھا جاتا تھا۔ ان تجربات کے نتیجے میں ہزاروں جانور ہلاک ہو گئے۔ البتہ انسانی ہلاکتوں
 کے حوالے سے معلومات سامنے نہیں آئیں۔ ان تجربات کی تفصیلات ابھی تک مخفی ہیں۔

کنینڈا

امریکہ نے 1954ء میں وینیک شہر میں ہوا پھٹنے والے ٹرکوں کے ذریعہ خطرناک زہک کیڈیم سلفائیڈ کا چھڑکاؤ کیا۔ یہ اس کے کیمیادی و حیاتیاتی ہتھیاروں کے تجربات کا حصہ تھا۔

چین اور کوریا

1952ء کے آغاز میں جبکہ کوریا کی جنگ جاری تھی چین نے احتجاج کیا کہ امریکہ کوریا اور شمال مشرقی چین میں بہت بڑی تعداد میں مختلف الاقسام ہیکٹر یا 'کیڑے مکوڑے' پر جانوروں اور مچھلیوں کے گلے سڑے حصے اور نہایت ہی عجیب و غریب قسم کی چیزیں پھینک رہا ہے جو کہ بیماریوں کا باعث بن رہے ہیں۔ چینی حکومت نے اعلان کیا کہ طاعون، ہنٹرکس اور ہینفلٹس سے نہایت تیزی سے فوری اموات واقع ہوئی ہیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے پکڑے جانے والے 36 امریکی ہوا بازوں سے شہادتیں حاصل کیں جو مہلک سامان والے جہاز اڑاتے تھے۔ ان میں سے 25 کس شائع کیے گئے۔ ان میں سے زیادہ تر نے نہایت تفصیل کے ساتھ اپنی کارروائیوں کے بارے میں معلومات فراہم کیں مثال کے طور پر بموں اور گرائی جانے والی دوسری مہلک چیزوں کی اقسام، کیڑوں کی اقسام اور وہ بیماریاں جو ان کے ذریعہ پھیلائی گئی تھیں وغیرہ وغیرہ۔ جراثیمی بموں اور کیڑوں کی تصاویر بھی شائع کی گئیں۔ پھر اگست میں ایک بین الاقوامی سائنٹفک کمیٹی مقرر کی گئی جس میں سویڈن، فرانس، برطانیہ، اٹلی، برازیل اور سوویت یونین کے سائنسدان شامل تھے۔ دو ماہ سے زیادہ عرصہ تک چین میں اپنی تحقیقات مکمل کرنے کے بعد اس کمیٹی نے چھ سو صفحات پر مشتمل رپورٹ تیار کی جس میں بہت سی تصاویر بھی شامل تھیں۔ بہر حال رپورٹ کا خلاصہ یہ تھا کہ "بلاشبہ چین اور کوریا کے لوگ ہیکٹر یا کیڑوں میں رہے ہیں جو کہ امریکہ کے مسلح فوجوں دستوں کے استعمال میں تھے اور انہوں نے اس مقصد کے حصول کے لیے ان کی بہت سی اقسام کو مختلف طریقوں سے استعمال کیا۔"

تاہم بعض امریکی ہوا بازوں کے بیانات کلینکی حیاتیاتی معلومات سے بھرپور اور اشتراکی فن خطابت لیے ہوئے تھے جیسا کہ "شہنشاہیت کے حامی اور سرمایہ دار جنگوں کے سوداگر ہیں۔" بعد میں معلوم ہوا کہ زیادہ تر ہوا بازوں نے ذہنی اور جسمانی تشدد کے بعد الزامات قبول کئے تھے۔ اور ان میں سے بعض تو یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ وہ جو گرا رہے ہیں وہ

دھا کہ خیر بارود ہے یا معمولی بم۔ جنگ کے بعد جب پائلٹ اپنے ملک واپس آئے تو انہوں نے اپنے اقبالی بیان واپس لے لیے مگر یہ کورٹ مارشل کے خوف کی وجہ تھا۔ امریکی اتارنی جنرل کے مطابق انہیں غداری کے الزامات اور دیگر سزاؤں کا خوف بھی تھا۔ مختصر یہ کہ وہ بری طرح سے ڈہنی دباؤ میں تھے۔

یہ یاد رکھیے کہ 1979ء میں یہ بات منظر عام پر آئی کہ امریکی فوج نے حیاتیاتی جنگ کی تیاریوں کے سلسلہ میں امریکہ میں بلخ کے پروں کے ذریعہ بعض تجربات کیے۔ مزید براہ دسمبر 1951ء میں امریکی سیکرٹری دفاع نے حکم جاری کیا کہ حیاتیاتی ہتھیاروں سے حملہ کی تیاری جتنی جلد ممکن ہو سکے قابل عمل مدت میں مکمل کر لی جائے۔ ”چند ہفتوں کے اندر اندر نقصانے کے سربراہ نے بتایا کہ کام نہایت تیزی سے تکمیل کی جانب گامزن ہے۔

امریکہ نے کوریا پر حملہ بھی بہت بڑی مقدار میں کر لیا۔ ایک اندازہ کے مطابق 1952ء میں روزانہ تقریباً ستر ہزار گیلن گرایا جاتا تھا۔ اور 1980ء میں یہ بات منظر عام پر آئی کہ 1967ء سے 1969ء کی مدت کے دوران امریکہ نے شمالی اور جنوبی کوریا کے درمیان غیر فوجی زون کی جنوبی سرحد کے 123,607 یکٹر رقبہ پر پر نباتات تباہ کرنے اور شمالی کوریا کی مداخلت کی حوصلہ شکنی کرنے کے لیے ایجنٹ اور بج کا چھڑکاؤ کیا۔

ویٹنام

1960ء کے آغاز سے تقریباً اس پوری دہائی تک امریکہ نے جنوبی ویٹنام کے تیس لاکھ ایکڑ رقبہ (اس میں لاؤس اور کمبوڈیا کے بھی کچھ حصے شامل تھے) پر لاکھوں ٹن ہیریسیائیڈز کا چھڑکاؤ کیا جس کا مقصد فصلوں کی تباہی اور ان گھنے پھوں کا صفایا تھا جو دشمن سے بچاؤ میں مددگار ثابت ہوتے تھے۔ ہیریسیائیڈز خاص طور پر ایجنٹ اور بج کے وسیع پیمانے پر استعمال نے ویٹنام کو آلودہ کر کے رکھ دیا۔ اس کے ساتھ ساتھ پانچ سو پاؤنڈ ڈائوکسن (Dioxin) کے استعمال نے تباہ کن آلودگی پھیلائی۔ ڈائوکسن کو دنیا کا سب سے زہریلا مادہ سمجھا جاتا ہے کم از کم اتنا زہریلا جتنی اعصابی گیس (Nerve Gases) ہوتی ہے اور نہایت ہی مہلک جس کا کسی سے مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔ ڈائوکسن کے اثرات سے جو امراض پھیلتے ہیں ان میں اندرونی معذوریات، متعدی امراض، پیدائشی نقائص اور ذہنی و نفسیاتی معذوریات وغیرہ شامل

ہیں۔ ایک اندازہ کے مطابق نیویارک کی آبادی کا صفایا پھیرنے کے لیے شہر میں سپلائی ہونے والے پانی میں صرف تین اونس ڈائیکسن کافی ہے۔

ویتنام میں ان زہریلے حملوں سے 20 لاکھ افراد متاثر ہوئے (کئی ہزار امریکی سپاہی ان کے علاوہ تھے)۔ جن علاقوں میں ایجنٹ اورنج کا چھڑکاؤ کیا گیا تھا اس کے مہلک اثرات کی وجہ سے وہاں وسیع پیمانے پر پیدائشی نقائص کی اطلاعات سامنے آئیں اور ویتنامی حکومت کے اندازہ کے مطابق مختلف کیمیکلز کی وجہ سے پانچ لاکھ بچوں میں پیدائشی نقائص پائے گئے تاہم اس کا کوئی ریکارڈ نہیں نہ ہی امریکی حکومت نے ویتنامیوں یا ان کی حکومت کو صحت عامہ کے اس نقصان کا کوئی ہرجانہ ادا کیا۔

مزید برآں امریکی فوج سی ایس ڈی ایم اور سی این گیسوں کے حملے کر رہی ہے مگر امریکی اہلکاروں کا اصرار ہے کہ یہ ”گیسوں کی جنگ“ نہیں ہے۔ وہ انہیں ”ہنگاموں پر قابو پانے والے ہتھیار“ قرار دیتے ہیں۔ امریکی فوج نے ویتنامی سرنگوں اور غاروں میں سی ایس ڈی ایم گیس کا حملہ کیا یہ گیس شدید دست آور ہے جو قابو سے باہر الٹیوں کا سبب بنتی ہے۔ اس حملہ میں بے شمار افراد محدود جگہوں میں اپنی ہی الٹیوں اور غلاظتوں کے درمیان ہلاک ہو گئے۔ بین الاقوامی ریڈ کراس کی شمالی ویتنامی شاخ اور دیگر بین الاقوامی ذرائع کی رپورٹس کے مطابق ان گیسوں سے جہاں بے شمار عورتیں اور بچے بھی ہلاک ہوئے وہیں لاتعداد زخمی بھی ہوئے ان چوٹوں میں آنکھوں کے ڈیلوں کا بہہ جانا چہرے پر آبلے پڑنا، پھوڑے پھنسیاں پھوٹ پڑنا اور جلد کا جھلس جانا وغیرہ عام تھیں۔ امریکی نائب وزیر دفاع سائرس ونس نے تسلیم کیا کہ ان حملوں میں سکھیا اور نیلا تھو تھا بھی استعمال کیا گیا۔ دیگر نقصان دہ کیمیکلز جو امریکہ نے ویتنام میں استعمال کئے انہیں میپلم اور نفطین پھینکنے والے شعلے بھی شامل تھے۔

لاؤس

ستمبر 1970ء میں امریکی فوجوں نے لاؤس میں ”آپریشن ٹیلوڈ“ کے تحت کارروائی کی۔ اس آپریشن کے دوران انہوں نے لوٹیاں گاؤں میں میں کمپ پر حملے کی تیاری کے سلسلے میں ”ایروڈولائزڈ سلرین نرو گیس“ (یہ سی بی یو۔ 15 یا جی بی بھی کہلاتی ہے) استعمال کی۔ اس حملے کا مقصد امریکی فوج کے کئی مخرفین کو ہلاک کرنا تھا جن کے بارے میں خبر ملی تھی

کہ وہ وہاں ہیں۔ آپریشن کامیاب رہا اور اس میں سو سے زائد عام شہری اور فوجی جن میں دو امریکی بھی شامل تھے ہلاک ہو گئے۔ یہ معلومات سامنے نہیں آئیں کہ کتنے حملے سے پہلے گیس سے ہلاک ہوئے اور کتنے مسلح حملے کے دوران۔

سارین 1930ء کی دہائی میں جرمنی میں تیار کی گئی۔ یہ سانس کے ساتھ جسم میں داخل ہوتے ہی چند منٹوں میں ہلاک کر دیتی ہے۔ جلد پر اس کے ننھے سے قطرے سے بھی یہی صورتحال ہوتی ہے۔ یہاں تک یہ کپڑوں پر سے بھی اثر کر جاتی ہے۔ یہ پٹھوں کی حرکت کو قابو میں رکھنے والی قوت پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اس قوت کے بغیر پٹھوں کی حرکات کو روکنے کا جسم کے پاس کوئی اور ذریعہ نہیں۔ اس کی وجہ سے کسی بھی قسم کا جسمانی خطرہ ممکن ہے۔

جب امریکی حملہ آور حملے کے لیے موزوں راستہ تلاش کر رہے تھے تو انہیں سب سے زیادہ شمالی ویتنامیوں اور اشتراکی پاتھ لاء سپاہیوں کی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ امریکیوں نے فضائیہ سے مدد طلب کی۔ جلد ہی امریکی جہازوں نے دشمن پر سارین کے کنسٹر پھینکا شروع کر دیئے۔ کنسٹر کے پھٹنے ہی ایک گیلی سی دھند دشمن کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی اور وہ فوری زمین پر گر کر الٹیاں کرنے لگتے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کے جسم اٹھنے لگتے۔ گیس نے ان امریکیوں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا جو حفاظتی حصار میں نہیں تھے۔ انہوں نے بھی بری طرح سے الٹیاں کرنا شروع کر دیں۔ ان میں سے ایک آج بھی مکمل طور پر مفلوج ہے۔ اس کے معالج اس بیماری کی وجہ اعصابی گیس کو قرار دیتے ہیں۔

اوپر بیان کی گئی کہانی 7 جون 1998ء کو ٹی وی پروگرام ”نیوز سینڈ: سی این این اینڈ ٹائم“ میں پیش کی گئی۔ جس کے بعد تصدیق کے لیے ایڈمرل ٹامس موروکو پیش کیا گیا جو 1970ء میں جیمز مین جوائنٹ چیفس آف سٹاف کے عہدہ پر فائز تھا۔ اس نے تذکرہ واقعہ کی تصدیق کر دی بس پھر کیا تھا۔ دوزخ کا منہ کھل گیا۔ یہ ایک نہایت ہی متنازعہ اور دردناک کہانی تھی جس نے طوفان کھڑا کر دیا۔ ہر ایک اس طرف متوجہ ہو گیا۔ یہ کسی بھی متوقع تباہی پر قابو پانے کا وقت تھا اسی لیے ہنگامی طور پر اہم شخصیات کو اکٹھا کیا گیا جن میں ہنری کسنجر، کولن پاؤل، گرین بیرٹ، ماہر سیاستدان، دانشور اور خود پینٹاگون کے اہلکار شامل تھے۔ ان سب نے مشترکہ طور پر فیصلہ دے دیا کہ یہ کہانی سوائے جھوٹ اور تہمت کے کچھ نہیں تھی۔ انہوں نے شدید ناراضی اور غصے کا اظہار کرتے ہوئے اسے بدنام کرنے کی سازش قرار دیا۔ سی این این نے

فوری طور پر اپنی رپورٹ واپس لے لی۔ ٹامس مورونے بھی اپنے الفاظ واپس لے لیے۔ پروگرام پروڈیوسرز کو نوکری سے فارغ کر دیا گیا اور ان سب کے خلاف مقدمے دائر کر دیئے گئے۔
ان غیر مقلدین کی طرح جو شالن کے دور میں ”بے وجود“ ہو گئے تھے آپریشن ٹیلوڈ بھی اب سرکاری طور پر ”غیر وقوع پذیر“ ہو گیا ہے۔

اس سبب کے باوجود پروگرام کے پروڈیوسروں اپریل اولیور اور جیک سمٹھ نے اپنی کہانی کی حمایت میں 70 صفحات پر مشتمل ایک دستاویز پیش کی جس میں فوجی افسران کی شہادتیں بھی شامل تھیں جن میں انہوں نے اعصابی گیس (Nerve Gas) کے استعمال کی تصدیق کی تھی۔

پانامہ

40ء سے 90ء کی دہائی تک امریکہ نے ہر قسم کے کیمیائی ہتھیاروں، جن میں مسٹرڈ گیس، دی ایکس، سارین، ہائیڈروجن، سائنائیڈ اور دیگر اعصابی مواد شامل تھا کے تجربات کے لیے پانامہ کے کئی علاقوں کو بطور تجربہ گاہ استعمال کیا۔ یہ کیمیائی ہتھیار راکٹ، کارتوس، بارودی سرنگوں اور ہزاروں ٹن کے کیمیائی ساز و سامان کی صورت میں تھے۔
1999ء کے اواخر میں جب امریکی فوجیں پانامہ سے واپس جا رہی تھیں تو انہوں نے اپنے پیچھے ایسی بہت سی جگہیں چھوڑ دی تھیں جہاں کیمیائی و روایتی ہتھیار مستقل خطرے کی صورت میں بدستور پڑے تھے ان میں وہ کیمیائی ہتھیار بھی شامل تھے (جہاز سے گرائے جانے والے) جو پھٹ نہیں سکے تھے۔ 1979ء سے اب تک 21 پانامی نہ پھٹنے والے روایتی ہتھیاروں کی نذر ہو چکے ہیں۔

60ء اور 70ء کی دہائیوں کے دوران امریکی فوج پانامہ میں ایجنٹ اورنج اور دیگر زہریلے ہر بیسائیڈز کے خفیہ تجربات بھی کر چکی ہے۔ بہت سے شہریوں اور فوجی اہلکاروں کو اس مہلک کیمیائی مواد کا شکار بننا پڑا۔ ایجنٹ اورنج پر مشتمل ڈائیکسن کے سینکڑوں ٹرک بحری جہاز کے ذریعہ پانامہ بھیجے گئے ان کا جنگلات اور گرد و نواح کے مصروف بیرونی مقامات پر چھڑکاؤ کیا گیا جس کا مقصد یہ تھا کہ انہیں شمال مشرقی ایشیا کے پرتش جنگ کے میدانوں جیسا بنادیں۔
پانامہ پر جارحیت کے دوران دسمبر 1989ء میں یہ سننے میں آیا کہ پانامہ

میں امریکہ جنوبی کماٹز نے پانامہ شہر کے نزدیک پہاڑیوں میں گھرے ہوئے گاؤں پکورا پر پہلی کاپڑ اور ہوائی جہازوں کے ذریعہ کیمیائی مواد کی بمباری کی ہے۔ وہاں کے رہائشیوں نے انسانی حقوق کی تنظیموں اور اخبارات کو بتایا کہ اس کیمیائی مواد نے نہ صرف ان کی جلد کو جلا ڈالا بلکہ اس کی وجہ سے نہایت اذیتناک جھپٹنے والا درد ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہیضہ پھوٹ پڑا۔ اس بمباری کا مقصد یہ نظر آتا ہے کہ گاؤں والوں کو قریبی پہاڑیوں میں مورچہ بند پانامی سپاہیوں کی مدد سے روکا جائے۔ اس کیمیائی بمباری سے مطلوبہ نتائج حاصل ہوئے یا نہیں اس حوالے سے معلومات سامنے نہیں آئیں۔

کیوبا

1۔ اگست 1962ء میں ایک برطانوی مال دار بحری جہاز جو سوویت یونین نے کرایہ پر لے رکھا تھا ریگٹا ہوا پورٹوریکو میں سان جان کی بندرگاہ پر پہنچا کیونکہ ایک چٹانی سلسلہ سے ٹکرانے کی وجہ سے اس کا دھکیلنے والا پرڈہ ٹوٹ گیا تھا اور یہاں اس کی مرمت ہو سکتی تھی۔ اس نے ایک سوویت پورٹ پر کیوبا کے اسی ہزار چینی کے تھیلے پہنچانے تھے۔ جہاز کو ڈرائی ڈاک پر لگادیا گیا اور مرمت کرانے کی وجہ سے چینی کے 14135 تھیلے جہاز سے اتار کر ویز ہاؤس پہنچا دیئے گئے۔ ویز ہاؤس میں سی آئی اے کے ایجنٹوں نے چینی میں ایسا مواد ملا دیا جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اگر وہ نقصان دہ نہیں تو پسندیدہ بھی نہیں تھا۔ جب صدر کیوبیڈی کو اس کارروائی کا علم ہوا تو وہ طیش میں آ گئے کیونکہ یہ سب امریکی حدود میں ہوا تھا اور راز کھلنے پر سوویت یونین سخت پراپیگنڈہ کر سکتا تھا اس کے ساتھ ساتھ سرد جنگ میں کیمیائی ہتھیاروں کے استعمال کی خوفناک مثال سامنے آ سکتی تھی۔ انہوں نے حکم دیا کہ یہ چینی سوویت یونین نہیں بھیجی جائے گی۔ تاہم اس حوالے سے انہیں جو وضاحت پیش کی گئی وہ منظر عام پر نہیں آئی۔

حقیقت یہ ہے کہ اس طرح اور بھی بے شمار کارروائیاں ہوئیں جو منسوخ نہیں کی گئیں۔ سی آئی اے کے ایک اہلکار نے جو کہ کیوبا کو دنیا بھر میں بدنام کرنے کی اس سازش میں براہ راست شریک تھا بتایا کہ ”کیوبا سے بہت بڑی مقدار میں چینی دنیا بھر میں بھیجی جا رہی تھی اور ہم اس میں آلودگیاں شامل کر رہے تھے۔“

2۔ اسی سال ”امریکہ کی ایک خفیہ تنظیم کے ایجنٹ“ نے ایک کینیڈین زرعی ماہر کو جو کیوبا کی حکومت کے مشیر کی حیثیت سے کام کر رہا تھا پانچ ہزار ڈالر اس کام کے لیے دیئے کہ وہ کیوبا کی مرغیوں میں عجیب و غریب بیماری کے جراثیم داخل کر دے اس کے فوراً بعد آٹھ ہزار سے زائد مرغیاں ہلاک ہو گئیں۔ بعد میں اس زرعی ماہر نے دعویٰ کیا کہ اس نے پیسے ضرور لیے تھے اور وہ اس وقت فارم پر ہی تھا جب مرغیاں ہلاک ہوئیں مگر اس نے ابھی تک ان میں جراثیم داخل نہیں کئے تھے۔ اس کے خیال میں مرغیاں لاپرواہی یا کسی اور وجہ سے ہلاک ہوئی ہوں گی جس میں جراثیم کا کوئی عمل دخل نہیں۔ ہو سکتا ہے یہ بیان محض خود کو تسلی دینے کے لیے ہو۔ اس حوالے سے واشنگٹن پوسٹ کی ایک رپورٹ میں کہا گیا کہ ”امریکی خفیہ ادارے کی رپورٹ کے مطابق کیوبن اور امریکیوں کو یقین ہے کہ یہ مرغیاں کسی تجربی کے نتیجہ میں ہلاک ہوئی ہیں۔“

3۔ مندرجہ ذیل پراجیکٹ میں کام کرنے والے ایک شریک کار کے مطابق:

”1969ء اور 1970ء کے دوران سی آئی اے نے کیوبا کی چینی کی فصل تباہ کرنے اور معیشت برباد کرنے کے لیے موسموں میں مصنوعی تبدیلی کی جدید ٹیکنالوجی کو استعمال کیا۔ کیلیفورنیا میں قائم چائنائیک بحری ہتھیاروں کے مرکز سے جہاں یہ جدید ٹیکنالوجی تیار کی جاتی ہے جہاز اڑتے اور مطلوبہ مقام پر بادل بناتے ہوئے چلے جاتے یہ مصنوعی بادل طوفانی بارش کا باعث بنے جس نے گنے کے کھیتوں کو چلہ کر کے سارے علاقے کو بنجر اور غیر درمی بنادیا۔ (کچھ علاقوں میں اس طوفانی بارش نے ہلاکت خیز سیلاب کی صورت اختیار کر لی) سی آئی اے کے اس قسم کی کارروائیوں میں ملوث ہونے پر کسی قسم کی کوئی حیرت نہیں ہونی چاہیے۔ کیونکہ سوائے قسمت کے کسی بہت بڑے پھیر کے کہ طوفانی بارشیں اسی وقت ہوتیں جب امریکہ چاہتا تھا یہ تدبیر کارگر نہیں ہو سکتی تھی۔

4۔ 1971ء کی ایک کارروائی کے شرکاء کے مطابق سی آئی اے نے کیوبا کی حدود سے باہر ایسے جراثیم چھوڑے جو افریقی خنزیروں کا بخار نامی بیماری کا باعث بنے ہیں۔ اس جراثیمی حملے کے چھ مہینے بعد کیوبا میں یہ وباء پھوٹ پڑی اور حکومت کو اس خوف سے پانچ لاکھ سے زائد سوزہ ہلاک کرنے پڑے کہ کہیں قومی سطح پر جانوروں میں یہ مرض نہ پھیل جائے۔ مغربی نصف کرہ ارض میں وقوع پذیر ہونے والا اپنی نوعیت کا یہ پہلا واقعہ تھا۔ اقوام متحدہ کی

خوراک و زراعت کی تنظیم نے اسے سال کا خطرناک ترین واقعہ قرار دیا۔

5۔ اس کے دس سال بعد انسان نشانہ بنے اور ڈی ایچ ایف یعنی جریبان خون اور لال بخار (جوڑوں میں شدید درد اور بخار) کی بیماری جزیرہ میں پھوٹ پڑی جو خون چوسنے والے کیڑوں عام طور پر مچھروں کے ذریعہ پھیلتی ہے۔ شدید نزلہ و زکام اور ہڈیوں میں ناقابل برداشت درد اس بیماری کی علامات ہیں۔ 1987ء میں مئی سے اکتوبر تک کیوبا میں 30,000 افراد اس بیماری میں مبتلا ہو چکے تھے جبکہ اس کے ہاتھوں مرنے والوں کی تعداد 158 تک پہنچ گئی تھی جن میں سے 101 پندرہ سال کی عمر تک کے بچے تھے۔

اس بیماری پر قابو پانے کے لیے قائم شدہ مرکز نے بعد میں بتایا کہ کیوبا میں لال بخار کا ظہور امریکہ کی تاریخ میں پہلی بار ڈی ایچ ایف نامی بڑے وبائی مرض کا باعث بنا تھا۔ کاسٹرو نے اعلان کیا کہ ہم نے بخار پھیلانے والے مچھروں کا قلع قمع کرنے کے لیے امریکہ سے مدد مانگی مگر انہوں نے ہمیں کسی قسم کی مدد فراہم نہیں کی۔

ہو سکتا ہے کہ اس وبائی مرض کے پیچھے چھپی داستان کبھی منظر عام پر نہ آتی مگر بعض پوشیدہ دستاویزات کے منظر عام پر آنے سے انکشاف ہوا کہ 1956ء اور 1958ء میں امریکی فوج نے جار جیا اور فلوریڈا میں تجربات کے لیے خاص طور پر پالے ہوئے مچھروں کے جھنڈ پہ اندازہ لگانے کے لیے کھول دیئے تھے کہ آیا کیڑے مکوڑوں کے ذریعہ پھیلنے والی بیماریوں کو حیاتیاتی جنگ میں بطور ہتھیار استعمال کیا جاسکتا ہے۔ یہ پالے ہوئے مچھر ایڈس ایجنٹی قسم سے تعلق رکھتے تھے جو دیگر بیماریوں کے ساتھ ساتھ لال بخار کا خاص طور پر باعث بنتے ہیں۔

1967ء میں سائنس میگزین کی ایک رپورٹ کے مطابق ”فورٹ ڈیٹرک“ میری لینڈ میں یو ایس گورنمنٹ سینٹر پر لال بخاران بیماریوں میں شامل تھا۔ جو کہ تحقیق کا مرکز ہوتی ہیں اور جنہیں حیاتیاتی جنگ کی اصل طاقت اور اہم ترین ہتھیار سمجھا جاتا ہے۔“ پھر 1984ء میں کیوبا کے ایک جلاوطن کو نیویارک کی عدالت میں ایک بالکل ہی غیر متعلقہ کیس میں پیش کیا گیا۔ اس نے شہادت دی کہ ”1980ء کے اواخر میں ایک بحری جہاز فلوریڈا سے کیوبا روانہ ہوا۔ اس کا مشن کیوبا میں بعض جراثیم متعارف کرانا تھا۔ جو کیمیائی جنگ کی شروعات کے طور پر سوویت یونین والوں کے خلاف اور کیوبا کی معیشت کو تباہ کرنے کے لیے استعمال کیے جانے

تھے مگر بعد ازاں نتائج وہ نہیں نکلے جن کی ہمیں امید تھی۔ ہمارا خیال تھا کہ یہ سوویت فوجوں کے خلاف استعمال ہوں گے مگر یہ ہمارے اپنے ہی لوگوں کے خلاف استعمال ہوئے جس کے لیے ہم تیار نہیں تھے۔“

اس شہادت سے یہ بات واضح نہیں ہو سکی کہ کیا کیوبا کا آدمی یہ سوچ رہا تھا کہ جراثیم کو یہ علم ہونا چاہیے تھا کہ انہیں صرف روسیوں پر حملہ آور ہونا ہے یا پھر اس کا ردوائی کے پس پردہ مصروف عمل لوگوں نے اسے غلط فہمی میں مبتلا کیا۔

21 اکتوبر 1996ء کو مطلع بالکل صاف تھا، صوبہ متتلاز پر اپنا جہاز اڑاتے ہوئے کیوبا کے ایک پائلٹ کی توجہ ایک ایسے جہاز کی جانب مبذول ہوئی جس نے فضا میں سات مرتبہ کسی قسم کے مواد کی گرد چھوڑی تھی۔ اس نے فوری طور پر کنٹرول ٹاور رابطہ کر کے اطلاع دی۔ معلوم یہ ہوا کہ یہ فصلوں پر چھڑکاؤ کرنے والا امریکی جہاز تھا جو امریکی محکمہ خارجہ کے ماتحت تھا اور اسے گریڈنٹن جزیرے کے راستے کولمبیا جانے کے لیے کیوبا پر سے اڑنے کی اجازت تھی۔ کیوبا پائلٹ کی اطلاع پر کنٹرول ٹاور کی جانب سے اس سے فوری طور پر پوچھا گیا کہ کیا اس کے ساتھ کوئی مسئلہ ہے؟ اس کا جواب نفی میں تھا۔

18 دسمبر کو کیوبا میں اچانک ہی طاعون کی بیماری کا انکشاف ”قہریس پاسکی“ نامی پودے کھا جانے والے کیڑوں کے ذریعہ ہوا۔ اس سے قبل کیوبا میں یہ کیڑے کبھی بھی نہیں پائے گئے تھے۔ یہ کیڑے نہ صرف فصلوں کو مکمل طور پر تباہ کر دیتے ہیں بلکہ اپنے خلاف مزاحمانہ کارروائیوں کا بھرپور مقابلہ کرنے کی طاقت بھی رکھتے ہیں۔ گویا انہیں ختم کرنا بے حد مشکل ہوتا ہے۔ کیوبا نے فوری طور پر امریکہ سے 21 اکتوبر والے واقعہ کی وضاحت طلب کی۔ سات ہفتے گزرنے کے بعد امریکہ نے جواب دیا کہ محکمہ خارجہ کے پائلٹ نے کیوبا کے پائلٹ کو اپنی موجودگی سے آگاہ کرنے اور مقام کی نشاندہی کرنے کے لیے صرف دھواں چھوڑا تھا۔ جب تک ان کا یہ ”جواب“ موصول ہوا اس وقت تک ”قہریس پاسکی“ نہایت تیز رفتاری سے ہر طرف پھیل کر مکئی، پھلیاں، لکڑی، کھیرے اور دیگر فصلوں کو بری طرح متاثر کر چکا تھا۔

ایک سوال کے جواب میں وفاقی ہوا بازی کی انتظامیہ نے بتایا کہ مقام کی نشاندہی کے لیے دھواں چھوڑنا وفاقی ہوا بازی کے ادارے کا طریقہ کار نہیں ہے اور نہ ہی وہ ایسے کسی عمل کے حوالے سے کسی قانون یا قاعدہ سے واقف ہیں۔

اپریل 1997ء میں کیوبا نے اقوام متحدہ کے سامنے ایک رپورٹ پیش کی جس میں امریکہ پر ”حیاتیاتی جارحیت“ کا الزام عائد کرنے کے ساتھ 1996ء کے واقعے اور بعد کے تنازعہ کی پوری تفصیل بیان کی گئی تھی۔ اگست میں حیاتیاتی ہتھیاروں کے معاہدہ پر دستخط کرنے والوں نے کیوبا کے الزامات اور ان پر امریکہ کے رد عمل پر غور و خوض کرنے کے لیے جینوا میں ایک اجلاس منعقد کیا۔ دسمبر میں کمیٹی نے رپورٹ پیش کی کہ ”اس معاملہ میں بعض تکنیکی الجھنوں کے باعث کسی حتمی نتیجہ پر پہنچنا ممکن محسوس نہیں ہوتا۔“ اس کے بعد سے آج تک اس معاملہ کے حوالے سے کچھ نہیں کیا گیا۔

کیوبا کے خلاف امریکہ کی کیمیادی و حیاتیاتی جنگ کے بارے میں تو مکمل طور پر کبھی بھی کوئی بھی نہیں جان پائے گا۔ گزشتہ برسوں میں کاسٹر حکومت نے امریکہ پر کئی قسم کے طاعون کے الزامات عائد کئے جنہوں نے بے شمار موشی ہلاک اور فصلیں تباہ کیں۔ حال ہی میں منظر عام پر آنے والی 1977ء کی سی آئی اے کی دستاویزات سے انکشاف ہوا کہ ”ایجنسی نے فصلوں کی تباہی کا غنیہ تحقیقی پروگرام تیار کیا جس کے تحت 1960ء کی دہائی میں دنیا کے بے شمار ممالک کو نشانہ بنایا گیا۔“

دنیا کے مختلف ممالک میں امریکی فوجی تنصیبات۔ ایک جان لیوا زہریلی میراث یہ کیمیادی یا حیاتیاتی ہتھیار نہیں مگر یہ زہریلی ہے جو بیمار بھی کر دیتی ہے اور مار بھی ڈالتی ہے۔ یہ وہ ہے جو دنیا کے ہر کونے پر قائم امریکی فوجی تنصیبات (سو تو صرف جرمنی میں ہیں) اپنے پیچھے چھوڑتی جاتی ہیں۔ یہ ہے ماحولیات کے لیے تباہ کن آلودگی۔ آلودگی اتنی زیادہ پھیلائی جا رہی ہے کہ اس کا صحیح طور پر اندازہ لگانا بھی ممکن نہیں ہے۔ البتہ لاس اینجلس ٹائمز کی ایک مفصل رپورٹ کی یہ چند سطور اس سلسلہ میں مددگار ثابت ہو سکتی ہیں۔ ”امریکی فوج نے اپنی تنصیبات کانٹوں کی مقدار میں زہریلا کیمیائی مادہ فلپائن کی خلیج سیبوک میں ڈال کر گوام کے پیشک جزیرہ کے پینے کے پانی کو آلودہ کر دیا جرمنی میں پانی کے مرکزی چشمہ میں کاری نوجن بہادی مرکزی یورپ کی فضاؤں میں سنوں سلفر زدہ کوئلہ کا دھواں چھوڑ دیا اور لاکھوں گیلن کیمیائی فضلہ سمندروں میں پھینکوا دیا۔“

یہی سب کچھ فوج نے امریکہ میں بھی اپنی بے شمار تنصیبات کے ذریعہ کیا۔

امریکہ کا کیمیاوی و حیاتیاتی ہتھیاروں کا اندرون ملک استعمال

صدر کلنٹن نے جنوری 1999ء میں ایک انٹرویو کے دوران کہا کہ جراثیمی جنگ کے خوف نے انہیں کچھ راتوں تک سوئے نہیں دیا۔

یہاں یہ کہنا بجا ہوگا کہ ایسا کہتے ہوئے ان کے ذہن میں اس خوف کا باعث محکمہ دفاع اور سی آئی اے یقیناً نہیں تھے اسی لیے تو یہ دونوں ادارے پچھلی دو دہائیوں سے امریکہ کی کھلی فضاؤں میں اپنے تجربات جاری رکھے ہوئے ہیں جس کی وجہ سے لاکھوں امریکیوں کو کیمیائی مادوں اور بیکٹریا کے خطرناک ہاتھوں کا مستقل سامنا ہے۔ یہ سب کرتے ہوئے وہ نہ تو براہ راست متاثر ہونے والی آبادی کو پیشگی اطلاع دینے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں نہ ان کے تحفظ کے لیے کسی قسم کا پیشگی انتظام کیا جاتا ہے اور نہ ہی بعد میں ان کے مضراثرات کی جانچ پڑتال کی جاتی ہے۔

حکومتی اہلکار یہ ماننے کے لیے قطعاً تیار نہیں کہ استعمال کی جانے والی حیاتیاتی ضمیمات نقصان دہ ہو سکتی ہیں حالانکہ اس سلسلہ میں بے شمار سائنسی شہادتیں ہیں جن کے مطابق بظاہر بے ضرر محسوس ہونے والے تجربات سنگین بیماریاں پیدا کر سکتے ہیں خاص طور پر جہاں بچے اور مرلیض ہوں۔

بیماریوں سے بچاؤ اور ان پر قابو پانے کے مرکز کے اسسٹنٹ ڈائریکٹر جارج کونسل نے 1977ء میں سینٹ کے سامنے اس بات کی تصدیق کرتے ہوئے کہا کہ ”دنیا میں کوئی



ایسی چیز نہیں ہے جو مشکل پیدا نہ کرے۔ اگر آپ صبح جگہ صبح وقت اور صبح شخص پر صبح توجہ مرکوز کرتے ہیں تو کچھ نہ کچھ تو ہوگا۔“

فوج نے یہ تسلیم کیا کہ 1949ء سے 1969ء کے دوران 239 آباد علاقے مختلف صورتوں میں ساحل سے ساحل تک ہونے والے ان تجربات کی لپیٹ میں آئے۔ کبھی موسم کے اثرات جانچنے کے بہانے یہ تجربات ہوئے تو کبھی ہوا کو ذریعہ بنایا گیا، کبھی خوراک کے بہانے تو کبھی عناصر کو صحیح مقام پر رکھنے کے نام پر تجربات کیے گئے۔ ان کے علاوہ بھی کئی فرضی کہانیاں گھڑی گئیں۔ بظاہر 1969ء کے بعد سے ان علاقوں میں تجربات پر پابندی عائد کر دی گئی ہے مگر اس پر یقین کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے کیونکہ پوٹاہ کے ڈگ وے پر دو جنگ گراؤنڈ کی کھلی فضا میں کیہائی چمڑکاؤ آج بھی جاری ہے۔

ذیل میں 1949-69ء کے دوران ہونے والے تجربات کی چند مثالیں پیش کی جا

رہی ہیں۔

واٹر ٹاؤن، نیویارک کا علاقہ اور ورجن آئی لینڈ

1950ء: فوج نے ہوائی جہازوں اور پالتو کبوتروں کے ذریعہ زنگ زدہ غلہ میں آلودہ مرغی کے پڑ جو کی فصلوں کو آلودہ کرنے کے لیے گرائے۔ اس کا مقصد یہ ثابت کرنا تھا کہ زنگ زدہ غلہ کی دباہ حیاتیاتی جنگ کے ہتھیار کی حیثیت سے پھیلائی جاسکتی ہے۔

سان فرانسسکو کا خلیجی علاقہ

20-27 ستمبر 1950ء: امریکی فوج نے بحری جہازوں کے ذریعہ حیاتیاتی جنگی حملوں کے چھ تجربات کیے۔ اس سلسلہ میں بحری جہاز نے طیج کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے ”بیکلیس گلوبی“ اور ”سریشیا ماسینز“ کے استعمال سے تقریباً دو میل لمبا بادل بنایا۔ اس مشق کا اہم مقصد ساحلی علاقے کے باہر سے بندرگاہ والے شہر پر حیاتیاتی جنگ کے لیے جارحانہ ممکنات کا اندازہ لگانا تھا۔ اس کے ٹھیک دو دن بعد 29 ستمبر کی صبح کا آغاز ہوا تھا جب سان فرانسکو کے شینفورڈ یونیورسٹی ہسپتال میں داخل مریضوں میں ”سریشیا ماسینز“ کی انفیکشن پائی گئی۔ اس قسم کی انفیکشن اس سے پہلے اس ہسپتال میں کبھی سننے میں نہیں آئی تھی۔ گیارہ مریض اس سے متاثر ہوئے جبکہ ایک اس سے ہلاک ہو گیا۔

سٹونی بروک کی سٹیٹ یونیورسٹی آف نیویارک میں مائیکرو بیالوجی کے ایک پروفیسر نے سینٹ کمیٹی کے سامنے ایک رپورٹ پیش کی جس کے مطابق ”سریشیا مارسیسنز کی بڑھتی ہوئی تعداد ایک صحت مندانہ شخص کو بیمار اور ایک بیمار کو شدید بیمار کر سکتی ہے۔“

1954ء سے 1967ء کے دوران خلیج کے علاقے میں مزید تجربات کئے گئے جس میں میرین کاؤنٹی میں فورٹ کروئٹ کے مقام پر ہونے والی کارروائیاں بھی شامل تھیں۔

میدیا پولس

1953ء: شہر کے چار حصوں میں اکٹھ بار زنگ کیڈم سلفائیڈ چھوڑا گیا جس سے گھروں میں موجود لوگ اور سکول کے بچے بری طرح متاثر ہوئے۔ بعد میں اس مواد کی وضاحت کرتے ہوئے ای پی اے نے بتایا کہ کیڈم کی شمولیت کی وجہ سے یہ انتہائی خطرناک ثابت ہوتا ہے۔ فوج کے سابق سائنسدان نے 1972ء میں ”ماحولیاتی آب و ہوا“ نامی پیشہ ورانہ جرنل میں لکھا کہ کیڈم کے اجزاء جن میں زنگ کیڈم سلفائیڈ شامل ہوا انتہائی زہریلے ہوتے ہیں اور کھلی آب و ہوا میں ان کا استعمال انسانوں کے لیے نہایت خطرناک ثابت ہوتا ہے۔ اس سے پھپھڑے خراب، جگر ناکارہ اور گردوں پر شدید درم ہو جاتا ہے۔“

سینٹ لوئیس

1953: زنگ کیڈم سلفائیڈ کے 35 مظاہرے رہائشی تجارتی اور قصبائی علاقوں میں کئے گئے جن میں میڈیکل آرٹس بلڈنگ بھی شامل تھی۔ یہاں داخل مریضوں کی بہت بڑی تعداد زہریلے ذرات سانس کے ساتھ جسم میں جانے سے شدید بیمار ہو گئی۔

واشنگٹن ڈی سی کا علاقہ

1953: دارالحکومت سے تیس میل دور لیبرگ، ورجینیا اور مونوکی ریور واپسی میری لینڈ کے علاقوں میں ہوائی جہاز کے ذریعہ 75 فٹ بلندی سے زنگ کیڈم سلفائیڈ اور لیکو پوڈیم کا چھڑکاؤ کیا گیا۔

1969ء میں امریکی فوج نے میری لینڈ، کیمرج کے نزدیک کھلی فضا میں زنگ کیڈم سلفائیڈ کے 115 تجربات کیے۔

60ء کی دہائی کے آغاز میں امریکی فوج نے واشنگٹن نیشنل ایئر پورٹ پر بڑی تعداد میں ہیکلریا کی خم ریزی کی۔ اس تجربہ کا مقصد یہ اندازہ لگانا تھا کہ ہوائی مسافروں کو جراثیم زدہ کر کے ان کے ذریعہ دشمن ملک میں پھیلنے میں کس حد تک کامیابی حاصل ہو سکتی ہے۔

جارج ٹاؤن یونیورسٹی میڈیکل سینٹر میں بائیو بیالوجی کے ایک پروفیسر کے مطابق ”ہیکلریا میں استعمال ہونے والا ”ہیکیلیوس سٹبلس“ ضعیف العمر افراد کے لیے نہایت خطرناک ہوتا ہے خصوصاً وہ لوگ جن کا بیاریوں کے خلاف مدافعتی نظام کمزور ہو چکا ہو یا وہ جو کینسر دل کی بیماری یا کسی اور قسم کی کمزوری میں مبتلا ہوں۔“

ایسا ہی ایک تجربہ واشنگٹن گرے ہاؤس بس ٹرمینل پر بھی کیا گیا۔

رجنڈنکسن کے دورِ صدارت میں 1969ء میں فوج نے ایک تجربہ کے ذریعہ یہ ثابت کر کے دکھایا کہ وائٹ ہاؤس کے ایئر کنڈیشننگ سسٹم کے ذریعہ جراثیم داخل کر کے صدر کو خفیہ طور پر قتل کیا جاسکتا ہے۔

خوراک و ادویات کی انتظامیہ کے زیرِ استعمال ایک عمارت کے ترسیل آب کے مرکزی نظام میں فوج نے خفیہ طور پر بظاہر بے ضرر ایک رنگین شے رکھ دی۔ یہ بات منظر عام پر نہیں آئی کہ خاص مقدار میں یہ پانی پی کر کوئی متاثر ہوا یا نہیں۔

فلوریڈا

1955ء: فلجی مہا کے علاقہ میں سی آئی اے نے کھلی فضا میں خطرناک کھانسی کے ہیکلریا کا ایک تجربہ کیا جس سے خطرناک کھانسی میں مبتلا مریضوں کی تعداد میں ایک دم تشویشناک اضافہ ہو گیا۔ 1954ء میں جو ان مریضوں کی تعداد 339 جبکہ پورے سال میں اس بیماری سے صرف ایک ہلاکت ہوئی تھی اس تجربہ کے وجہ سے 1955ء کے اعداد و شمار کے مطابق مریضوں کی تعداد 1080 ہو گئی اور 12 افراد اس کے ہاتھوں ہلاک ہوئے۔

سوانا، جارجیا اور ایون پارک، فلوریڈا

58-1956ء: فوج نے تجرباتی طور پر حیاتیاتی جنگ کے ہتھیاروں کی حیثیت سے ہزاروں ایڈیس ایچ پی مچھروں کو وسیع علاقوں میں چھوڑ دیا جو زرد بخار اور لال بخار نامی

خطرناک بیماریوں کا باعث بن سکتے تھے۔ فوج کے بیان کے مطابق یہ مچھر وبائی مرض پھیلانے والے نہیں تھے۔ مگر سائنسدانوں کا کہنا تھا کہ یہ تجربہ خطرہ سے خالی نہیں تھا بلکہ یہ ایک نہایت ہی خوفناک منصوبہ تھا۔ اس تجربہ کا شکار ہونے والی آبادی پر کیا اثرات مرتب ہوئے یہ شاید کوئی کبھی بھی نہ جان سکے۔

نیویارک شہر

15-11 فروری 1956: سی آئی اے اور فوج کی ٹیم نے خاص سوٹ کیسوں اور دوہری پاور کی بے آواز گاڑی کے ذریعہ نیویارک کی گلیوں اور ہالینڈ اور لنکن کے زمین دوز راستوں پر چھڑکاؤ کیا۔

10-6 جون 1966: اس تجربے کے حوالے سے فوج کی رپورٹ کو نیویارک شہر کے زمین دوز راستوں کے غیر محفوظ مسافروں پر ہونے والے ممکنہ حیاتیاتی حملوں سے بچاؤ کے ایک مطالعہ کا نام دیا گیا۔ اس تجربہ کے دوران کھربوں ”بیکیلیوس سبٹلس ویریٹس ناہیجر“ مصروف اوقات میں ان زمین دوز راستوں میں چھوڑے گئے۔ ایک طریقہ میں روشنی کے بلبوں کا استعمال کیا گیا۔ ان میں بیکٹیریا بھر کر انہیں زمین دوز راستوں کے اطراف میں ہوادار جالیوں کے قریب توڑ دیا گیا یا نشیمن کے اندر چلنے کے راستوں پر پھینک دیا گیا۔ روشنی کے بلبوں میں سے بیکٹریا چھوڑنے کے بعد محض چند لمحوں کے لیے جراثیم زدہ بادل ظاہر ہوئے۔ ایک رپورٹ کے مطابق ”جب لوگ ان لمحاتی بادلوں کی لپیٹ میں آئے تو ان کا فطری رد عمل یہ تھا کہ گرد سمجھ کر اپنے کپڑوں پر ہاتھ پھیر کر انہیں جھاڑا ہوادار جالیوں کی سمت اور چل پڑے۔“ ریل گاڑیوں کے گزرنے سے اٹھنے والی گردونے بیکٹریا کو تمام راستے کے ساتھ ساتھ پھیلا دیا۔ جس وقت یہ تجربہ کیا گیا یہ دو ریل گاڑیاں گزرنے کا وقت تھا جنہوں نے 15 ویں سے 58 ویں سٹریٹ تک بیکٹریا کو پھیلا دیا۔

یہ کبھی بھی معلوم نہیں ہو سکے گا کہ اس سے کتنے لوگ متاثر ہوئے کیونکہ امریکی فوج نے اس سوال پر کبھی بھی توجہ نہیں دی۔

شکاگو

60 کی دہائی: شکاگو کا ذیلی راستوں کا نظام فوج کے ان تجربات کی زد میں رہا۔

مویشی باڑے

نومبر 1964ء تا جنوری 1965ء: فوج نے ٹیکساس، میزوری، مینیسوتا، جنوبی ڈکوتا، آئیووا اور نبراسکا کے مویشی باڑوں میں حیاتیاتی تجربات کیے۔ یہ آج تک واضح نہیں ہو سکا کہ مویشی باڑوں کا انتخاب کیوں کیا گیا اور ان تجربات سے متاثرہ مویشیوں کے گوشت کے استعمال سے لوگوں پر کیا اثرات مرتب ہوئے۔

نیورمبرگ

49-1946ء کے دوران جرمن شہر نیورمرگ میں قائم انٹرنیشنل ملٹری ٹریبونل نے نازیوں کی طرف سے انسانوں میں کیے جانے والے زبردستی کے طبی تجربات کے حوالے سے تفصیلات کا انکشاف کیا جن کی بنیاد پر ججوں نے کچھ اصول وضع کیے جو ”ضابطہ نیورمبرگ“ کہلائے اور لمبی تجربات کے لیے منتخب شدہ لوگوں کے حقوق کے قانون کی حیثیت سے ان کا نفاذ عمل میں آیا۔ ضابطہ کے پہلے اصول کے مطابق ”کسی بھی تجربے کے لیے منتخب کیے جانے والے انسان کی رضا کارانہ رضامندی لازمی شرط ہے۔“

اس کے کچھ ہی عرصہ بعد امریکی فوج اور سی آئی اے کے تجربات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ یقیناً یہ تجربات نازی تجربات کی طرح ہولناک نہیں تھے نہ ہی براہ راست انسانوں پر یہ تجربات کیے جا رہے تھے مگر جو کچھ کھلی فضا میں چھوڑا جا رہا تھا، جو تجربات کیے جا رہے تھے ان سے انسان ہی متاثر ہو رہے تھے۔ تجربات کرنے والے بھی اس بات سے اچھی طرح واقف تھے ان کے تجربات سے بے شمار انسان براہ راست متاثر ہو رہے ہیں جو قطعی طور پر ان تجربات سے آگاہ نہیں۔ ان تجربات کی رپورٹس میں اس حوالے سے ایک لفظ بھی موجود نہیں ہے کہ متاثر ہونے والے لوگوں کی رضامندی حاصل کی گئی تھی۔

اگر تجربات کرنے والے اس بات سے ”واقف“ نہیں تھے کہ یہ آلودگی پھیلانے والے مادے کتنے تباہ کن ثابت ہو سکتے ہیں تو اس کا صرف اور صرف یہ مطلب ہو سکتا ہے کہ انہوں نے اس حوالے سے تحقیقات ہی نہیں کیں یا پھر دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیں تو زیادہ مناسب ہو گا جیسا کہ ایک مقولہ ہے کہ ”وہ نہیں جانتے تھے کیونکہ وہ جانتا ہی نہیں چاہتے تھے۔“

ماحول میں تابکاری پھیلائے کا ذکر ہی کیا؟

1948-52ء کے عرصہ کے دوران حکومت نے ہوائی جہازوں کے ذریعہ تابکار مواد گرانے کے بے شمار تجربات کیے۔ ہوائی جہازوں کے ذریعہ یہ تابکار مواد آباد علاقوں کے صرف دس میل اوپر سے گرایا گیا۔ ان تجربات کا مقصد ایک تو مواد گرانے کا اندازہ کرنا دوسرے تابکاری زائل ہونے کے دورانیہ کی پڑتال کرنا اور تیسرے تابکاری جنگ کے امکانات کا جائزہ لینا تھا۔

انسانوں پر آزمائشیں کرنے والے تجربات

تاریخ گواہ ہے کہ محض تعداد کی بنیاد پر کوئی برابر نہیں ہو سکتا۔ ایک حکومت اپنے ہی لوگوں پر طبی نقطہ نظر سے خطرناک اور ضابطہ اخلاق کے خلاف لاتعداد تجربات کرتی ہے۔

امریکی حکومت دوسری جنگ عظیم کے بعد سے مسلسل کئی دہائیوں سے لاکھوں انسانوں پر خواہ وہ عام شہری یا فوجی تجربات کر رہی ہے۔ جن کا مقصد یہ پرکھنا ہے کہ ان تجربات سے ان پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ (الف) کیمیائی و حیاتیاتی مواد بشمول اعصابی گیسوں کس حد تک متاثر کرتی ہیں (ب) ایٹمی تابکاری خصوصاً پلوٹونیئم کے ساتھ اس کے استعمال سے کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں (ج) ذہن کو قابو میں کر لینے والی دوائیں۔ ایل سی ڈی اور دیگر برے اثرات مرتب کر لینے والی گیسوں کس طرح اثر انداز ہوتی ہیں۔

انسانوں پر تجربات کرنے کے لیے حکومتی ایجنسیاں ایسے لوگوں کا انتخاب کرتی ہیں جن کا کوئی سیاسی پس منظر نہ ہو جیسے کہ ملازمت پیشہ مرد اور عورتیں کم عقل اور بے شعور لوگ قیدی سیاہ فام مفلس زمانے کے ٹھکرائے ہوئے افراد بوڑھے نوجوان ذہنی مریض وغیرہ وغیرہ۔

”یہ ایک قسم کی شراب ہے اسے پی کر آپ بہت بہتر محسوس کریں گی۔“ ہیلن ٹیچسن کو یہ الفاظ ابھی یاد ہیں جو ونڈر بلٹ یونیورسٹی ہسپتال پر نیا ٹال کلینک میں جولائی 1946ء کو اس کے معالج نے دوا کے طور پر شراب کی قسم کا خاص مرکب پلاتے ہوئے کہے تھے۔ اسے یہ بھی یاد ہے کہ وہ مخلول لینے کے بعد اس نے قطعی طور پر بہتر محسوس نہیں کیا تھا۔

یہ تابکار لوہے کا محلول تھا اور وہ ان 829 خواتین میں شامل تھی جنہیں دو سال کے عرصے سے یہ زہریلے گھونٹ دوا کے نام پر پلائے جا رہے تھے۔ پچیسن اور اس کی پیدا ہونے والی بیٹی دونوں کی ساری زندگی عجیب و غریب بیماریوں میں مبتلا رہیں۔ پچیسن کے سر کے سارے بال جھڑ گئے وہ فاسد ایلیمیا میں مبتلا ہو گئی اور سورج کی روشنی اسے بری طرح سے متاثر کرنے لگی۔ اس کی بیٹی کا جواب جوان ہے مدافعتی نظام بگڑ چکا ہے اور وہ جلد کے کینسر میں مبتلا ہے۔“

1999ء تک امریکی عوام ان تجربات کی حقیقت سے بہت حد تک آگاہ ہو چکے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب یہ بات منظر عام پر آئی کہ نیو میکسیکو میں واقع وفاقی حکومت کی لاس ایلاموس نیشنل لیبارٹری جدید حیاتیاتی جنگ کے آلات کا تجربہ کرنے کے لیے فضا میں بیکٹریا چھوڑنے کا منصوبہ بنا رہی ہے تو عوامی سطح پر اتنا شدید احتجاج ہوا کہ انہیں اپنے تجربات ملتوی کرنا پڑے۔ اس سلسلہ میں ایک عوامی اجلاس کا اہتمام کیا گیا جس کا مقصد ان تجربات کے حوالے سے عوام کے دلوں سے خوف اور شکوک و شبہات ختم کرنا تھا۔ اس موقع پر سائنسی کے ایک رہائشی نے لیبارٹری کے نمائندہ سے سوال کیا کہ ”اگر یہ تجربات اتنے ہی محفوظ ہیں تو آپ واشنگٹن ڈی سی میں کسی کے دفتر میں یہ بیکٹریا کیوں نہیں چھوڑتے؟“

حتمی خیال..... اگر ایسا ہو تو کیا ہو؟

9 جون 1969ء کو محکمہ دفاع میں رہبرج اور انجینئرنگ کے شعبہ کے ڈپٹی ڈائریکٹر

ڈاکٹر ڈونلڈ ایم میک آرٹرنے کانگریس کے سامنے تصدیق کی کہ

”آئندہ پانچ سے دس برسوں کے دوران قوی امکان ہے کہ ایسے نہایت چھوٹے جدید تعدی اجسام تخلیق کر لیے جائیں جو کہ بیماری کی وجہ بننے والے اجسام کے اہم پہلوؤں میں تفاوت کر سکیں گے۔ اس حوالے سے ایک بے حد اہم نکتہ یہ ہے کہ یہ اجسام مدافعتی نظام میں جس کی مدد سے ہم خود کو متعدی امراض سے بچاتے ہیں شدید بگاڑ پیدا کرنے کا باعث بنیں گے۔“

باب 16

اقوام عالم میں کیمیاوی و حیاتیاتی ہتھیاروں کی حوصلہ افزائی

مصر

1969ء میں یہ بات منظر عام پر آئی کہ امریکی فوج گذشتہ کئی برسوں سے غیر ملکی ماہرین کو کیمیاوی و حیاتیاتی جنگ کی تربیت دے رہی ہے۔ 36 ممالک کے جن میں مصر، اسرائیل، عراق، اردن، لبنان، سعودی عرب، یوگوسلاویہ اور جنوبی ویتنام شامل تھے 550 افراد نے فورٹ میکلیں، الابامہ میں فوج کے کیمیکل سکول میں داخلہ لے رکھا تھا۔ بتایا جاتا ہے کہ مصری ماہرین نے امریکہ سے حاصل کردہ اس جدید تربیت کی مدد سے 1967ء میں یمن پر زہریلی گیس کے حملے کیے۔ بین الاقوامی ہلال احمر کی تنظیم نے اس امر کی تصدیق کی کہ مصری پائلٹوں نے جہازوں کے ذریعہ زہریلی گیسوں کے کنستریمن پر گرائے۔ بعد ازاں امریکی محکمہ دفاع کی ایک خفیہ تنظیم نے بھی اس کی تصدیق کر دی۔ اس حملے کی وجہ سے 150 دیہاتی ٹھٹھن، شدید کھانسی اور اور بے تحاشہ خون بہنے سے ہلاک ہو گئے۔

جنوبی افریقہ

1998ء میں سچائی اور مصالحت کمیشن کے سامنے پیش ہونے والی ایک شہادت کے مطابق امریکہ نے جنوبی افریقہ کے بے حس و بے ضمیر حکومتی ٹولے کی بے تحاشہ حوصلہ افزائی کی کہ وہ اپنے ملک کی سیاہ فام آبادی کے خلاف کیمیاوی و حیاتیاتی ہتھیار استعمال کرے۔ جنوبی افریقہ کے جرنیل ڈاکٹر واؤٹریسن جو 1981ء میں پراجیکٹ کے آغاز سے

اس کا سربراہ تھا ان نکات کی تصدیق کی جو اس نے امریکی میجر جنرل ولیم آگرن کے ساتھ ملاقات کے نتیجے میں تیار کئے تھے۔

”جنرل آگرن کا خیال ہے کہ موجودہ حالات میں کیمیائی جنگ سب سے بہترین حکمت عملی ہوگی کیونکہ اس کا بنیادی ڈھانچہ تمام تر سہولیات کے ساتھ محفوظ رہتا ہے اور صرف زندہ لوگ مارے جاتے ہیں۔ افریقہ کی گرم آب و ہوا ان ہتھیاروں کے لیے بہترین ہے کیونکہ یہاں زہر بہت اچھی طرح پھیل سکتا ہے۔ یعنی نشانہ بننے والوں کے پسینہ اور خون کے دباؤ کے ذریعہ زہر با آسانی پورے جسم میں سرایت کر جاتا ہے۔“

جنوبی افریقہ کے کیمیائی و حیاتیاتی ہتھیاروں کے پروگرام کے تحت بے شمار کارروائیاں کی گئیں جنہوں نے امریکی تجربات کی یاد تازہ کر دی۔ ادویات کے تجربات کرنے کے لیے سیاہ فام سپاہیوں کو سڑوں کی جگہ استعمال کیا گیا، ایک ایسا زہر تیار کیا گیا جو دل کے دورہ کا باعث بنتا ہے اور کسی کو قتل کا شائبہ تک نہیں ہوتا موت بالکل طبعی محسوس ہوتی ہے، بیماریوں کے جراثیم کے ذریعہ پینے کے پانی کو آلودہ کیا گیا، جنوبی افریقہ اور ہمسایہ ممالک میں اپنے مخالفین کو مفلوج اور ہلاک کرنے کے لیے بے شمار اقسام کی زہریلی گیسیں استعمال کی گئیں۔ سا

عراق

جنوری 1998ء کے اپنے قومی خطاب میں صدر کلنٹن نے واضح کرنے کی کوشش کی کہ ہمیں کیمیادی و حیاتیاتی ہتھیاروں کے جدید خطرات اور ان کے حصول کے لیے سرگرداں جارح ریاستوں، دہشت گردوں اور منظم مجرموں کا کس طرح سامنا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے ایٹمی، کیمیادی اور حیاتیاتی ہتھیار تیار کرنے پر عراق کو تنبیہ کی اور حیاتیاتی ہتھیاروں کے کنونشن کو مستحکم بنانے پر زور دیا۔ صدر صاحب کا خطاب بننے والوں میں سے کون اس بات سے واقف تھا اور ذرائع ابلاغ میں سے کس نے یہ رپورٹ دی کہ عراق کو وہ تمام حیاتیاتی مواد امریکہ نے ہی فراہم کیا تھا جس کی حیاتیاتی جنگ کے پروگرام پر عملدرآمد کرنے کے لیے صدام حسین کے سائنسدانوں کو ضرورت تھی۔

1994ء میں امریکی سینٹ کمیٹی کی ایک رپورٹ کے مطابق اگر پہلے نہیں تو کم از

کم 1985ء سے 1989ء تک امریکی کامرس ڈیپارٹمنٹ لائسنس یافتہ ایک پرائیویٹ امریکی سپلائر نے اصلی حیاتیاتی مواد عراق کو برآمد کیا۔ یہ مواد جس کے اثرات آہستہ آہستہ ظاہر ہوتے ہیں مندرجہ ذیل اذیتناک اموات کا باعث بنا۔

- ☆ بیکیلوس اینتھریکس، اینتھریکس کا باعث بنتا ہے۔
- ☆ کلوسٹریڈیم بولیوٹیم، بولیوٹیم زہر کا ایک ذریعہ ہے۔
- ☆ ہسٹوپلازمہ کپسولیٹم، یہ پھیپھڑوں، دماغ، ریزہ کی ہڈی اور دل کی بیماری کا باعث بنتا ہے۔
- ☆ بروسیلا میلنس، یہ بیکٹریا جسم کے اہم اعضاء کو نقصان پہنچاتا ہے۔
- ☆ کلوسٹریڈیم پرفنگنز، نہایت زہریلا بیکٹریا جو جسمانی نظام میں بگاڑ پیدا کر دیتا ہے۔
- ☆ کلوسٹریڈیم ٹیٹانی، انتہائی زہریلے اثرات مرتب کرتا ہے۔

80ء کی دہائی کے دوران لشتر چیا کولی (ای کولی)، جنسیاتی مواد انسانی اور بیکٹریائی ڈی این اے اور درجنوں دوسری حیاتیاتی ضمنیات بحری جہاز کے ذریعہ عراق بھیجی گئیں۔ یہ حیاتیاتی مواد نہ تو رقیق ہو سکتا تھا نہ اسے کمزور کیا جاسکتا تھا مگر دوبارہ پیدا ہونے کی صلاحیت رکھتا تھا۔

کمیٹی نے مزید بتایا کہ یہ انکشاف بعد میں ہوا کہ اقوام متحدہ کی تفتیشی ٹیم کو عراقی حیاتیاتی جنگ کے پروگرام کی جانچ پڑتال کے دوران جو قابل اعتراض مواد ملا تھا اور جسے انہوں نے ختم کیا تھا وہ بالکل وہی تھا جو امریکہ نے عراق کو برآمد کیا تھا۔

رپورٹ میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ امریکہ نے عراق کو مزید جو کچھ برآمد کیا ان میں کیمیائی جنگی ہتھیاروں کے علاوہ کیمیائی و حیاتیاتی جنگ کے منصوبے پیداواری سہولیات اور کیمیائی مواد بھرنے کے آلات بھی شامل ہے۔

یہ برآمدات کم از کم 28 نومبر 1989ء تک جاری رہیں یہ حقیقت جاننے کے باوجود کہ عراق ایران کے ساتھ جنگ کے دوران تقریباً 80ء کی دہائی کے آغاز سے ایرانیوں کردوں اور شیعوں کے خلاف کیمیائی اور حیاتیاتی حملوں میں مصروف ہے۔ یقیناً یہ سوچا جاسکتا ہے کہ یہ امریکہ کی خواہش ہی تھی کہ عراق ایران کے خلاف کیمیائی و حیاتیاتی ہتھیار استعمال کرے۔

منافقت کو سلام

خلیج کی جنگ کے بعد 1992ء سے 1998ء کا عرصہ خاصا توجہ طلب ہے جب امریکہ اقوام متحدہ کے ذریعہ عراق پر دباؤ ڈال رہا تھا کہ وہ انسانیت کو تباہ کرنے والے ہتھیاروں کے معائنہ کی مکمل اجازت دے اور کوئی بھی عمارت یا ڈھانچہ اس جانچ پڑتال سے رہ نہ جائے۔ عراقی حکومت کی یہ خواہش کہ کچھ جگہوں کو معائنہ سے الگ رکھا جائے امریکی افسران اور ذرائع ابلاغ کی جانب سے یکسر مسترد کر دی گئی کیونکہ اس معاملہ میں ان کے لیے دلچسپی کا خاصا سامان تھا۔

”صدام کیا چھپاتا چاہتا ہے؟“ اس حوالے سے ان کی جانب سے خاصے معنی خیز رویہ کا اظہار کیا جا رہا تھا۔

مئی 1997ء میں امریکی سینٹ نے ایک بین الاقوامی معاہدہ ”کیمیائی ہتھیاروں کی پیداوار نہیں بڑھانے“ ذخیرہ کرنے اور ان کے استعمال اور اس سے ہونے والی تباہی پر پابندی کنونشن“ (کیمیکیل کنونشن) کے نفاذ کے لیے ایک ایکٹ پاس کیا۔ چار سال قبل قائم ہونے والے اس معاہدہ کی اس عرصہ کے دوران سو سے زائد ممالک توثیق کر چکے تھے مگر سینٹ اسے منظور کرنے سے قبل ایک ترمیم کرنے پر مصر تھی جس کی شمولیت کے بعد اس کے نفاذ کا حکمنامہ جاری ہو گیا۔

سینٹ کی ترمیم سیکشن 307 یہ شرط عائد کرتی ہے کہ ”اگر صدر کسی معائنہ کو امریکی مفادات اور قومی سلامتی کے لیے خطرہ سمجھتا ہے تو وہ امریکہ میں ایسے کسی بھی معائنہ کی اجازت دینے سے انکار کر سکتا ہے۔“

صدر صدام حسین نے عراق کے لیے اس سے زیادہ تو کوئی مطالبہ نہیں کیا تھا۔ ذرا اندازہ کیجئے کہ سینٹ کی اس ترمیم کے ذریعہ دہائیت ہاؤس، پیٹنگا گون وغیرہ کو ایسی تمام پابندیوں سے مستثنیٰ کر دیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ جب ایک امریکی کرنل نے صدام حسین کے صدارتی محلات اور خود اس کی حفاظت پر مامور فوجی یونٹ کے معائنہ کا مطالبہ کیا تو صدر صدام نے سینٹ کی اسی ترمیم کا حوالہ دیتے ہوئے اس کے بلا تعصب نفاذ پر اصرار کیا۔ مزید برآں یہ ہمیں اب معلوم ہوا ہے کہ کچھ جگہوں کے معائنے کی اجازت نہ دینے

کے معاملہ میں صدام حسین حق بجانب تھا۔ اس حوالے سے اسے خود سر اور ضدی قرار دینا درست نہیں۔ یہ انکشاف کافی عرصہ بعد ہوا کہ امریکہ معائنہ کرنے والی ٹیم کے ارکان کو ٹیپ ریکارڈز کی قسم کے آلات دے کر بھیجتا تھا کہ معائنہ کے دوران جہاں ممکن ہو انہیں نصب کر دیا جائے۔

یہ حقیقت بھی اپنی جگہ قابل توجہ ہے کہ ”کیمیکل کنونشن“ کے ابتدائی ڈیڑھ سال کے تفصیلی مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ کنونشن کے احکامات کی تعمیل کے حوالے سے امریکہ کا ریکارڈ بالکل تاریک ہے جو کہ دنیا کی دیگر اقوام کے لیے نہایت افسوسناک مثال ہے۔

حصہ سوم

امریکہ کی بدمعاشیاں

بعض اہل مہم

دنیا بھر میں امریکی مداخلت کاریاں

(1945ء سے زمانہ حال تک)

دوسری جنگ عظیم کے بعد سے آج تک دنیا بھر میں جاری امریکی مداخلت کارپوں کی تفصیل ذیل میں پیش کی جا رہی ہے۔ اس میں مداخلتوں کے وہ مزید کیس بھی شامل کئے گئے ہیں جو مصنف کی کتاب "Killing Hope : U.S. Military and CIA interventions since world war II" میں نہیں ہیں۔

مزید تفصیلات کی خاطر مذکورہ کتاب کا مطالعہ کیجئے تاکہ ان مداخلتوں اور ذرائع کا علم ہو سکے جن کا یہاں ذکر نہیں کیا گیا)

سلطنت روم

”دنیا کا کوئی کونہ ایسا نہیں تھا جہاں کوئی مفادات خطرے میں نہ تھے یا کسی حملے کا خطرہ نہ تھا۔ اگر براہ راست روم کے مفادات نہیں تھے تو اس کے کسی حلیف کے تھے اور اگر کوئی حلیف ہی نہیں تھا تو حلیف پیدا کیے جاسکتے تھے۔ جب ایسے مفاد کو حیلہ بنانا قطعی ناممکن ہو جاتا تو پھر قومی عظمت کی توہین کو جواز بنایا جاتا۔ لڑائی ہمیشہ قانون کے دائرے میں لڑی گئی۔ روم پر ہمیشہ شیطان صفت ہمسایوں نے حملہ کیا..... پوری دنیا دشمنوں سے بھری ہوئی تھی اور ان کے جارحانہ عزائم سے محفوظ رہنا روم کی ذمہ داری تھی.....“

وہ معاملات جن کا یہاں پہلے ہی ذکر کیا جا چکا ہے ان میں سے بہت کم ایسے ہیں

جو فتوحات والی جنگوں کے پختہ مقاصد کی وضاحت کر سکیں۔ ہمارے خیال میں وہاں نہ تو کوئی جنگجو قوم تھی نہ ہی آغاز میں فوجی خود مختاری یا فوجی طرز کی حامل طبقہ اشرافیہ کی حکومت تھی۔ بس یہ سمجھ لیں کہ محض اپنے مفادات کے حصول کی خاطر وہ اٹھ کر کھڑا ہوا تھا۔“

(جوزف شمیٹر 1919ء)

”آج امریکہ اپنے وسیع مفادات کے تحفظ کی خاطر عالمی سطح پر انقلاب مخالف تحریک کا سربراہ بنا ہوا ہے۔ آج وہ بھی انہی مقاصد کے حصول کے لیے کھڑا ہے جن کی خاطر روم کھڑا ہوا تھا۔ روم نے اپنے زیر اثر ممالک میں غریبوں کے خلاف امیروں کی دل کھول کر مدد کی۔ غریب ہمیشہ سے ہی امیروں کے مقابلہ میں تعداد میں زیادہ ہوتے ہیں اور روم کی پالیسی اس اکثریت کے لیے عدم مساوات اور نا انصافی پر مبنی رہی۔“

(آرٹلڈ ٹوائس بی 1961ء)

سلطنت امریکہ

جلد ہی آپ کے کسی نزدیکی ملک میں قائم ہونے والی ہے۔

چین 1945ء

دوسری جنگ عظیم کے اختتام پر امریکہ نے خانہ جنگی میں مداخلت کرتے ہوئے ماؤزے تنگ کے اشتراکیوں کے خلاف چیا تنگ کا ٹی فیک کے قوم پرستوں کا ساتھ دیا حالانکہ جنگ کے دوران اشتراکی امریکہ کے نہایت قریبی حلیف تھے۔ ستم بالائے ستم امریکہ نے شکست خوردہ جاپانی سپاہیوں کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا۔ شکست کے بعد 1949ء میں بہت سے قوم پرست سپاہیوں نے شمالی برما میں پناہ لے لی جہاں سی آئی اے نے انہیں ایک بار پھر اکٹھا کیا ان کے ساتھ ایشیاء کے مختلف مقامات سے رگروٹوں کو بھرتی کیا اور بھاری تعداد میں اسلحہ اور جہاز فراہم کئے۔

50ء کی دہائی کے آغاز میں اس فوج نے چین کو بے شمار حملوں کا نشانہ بنایا ایک وقت میں ہزاروں دستے سی آئی اے کی سربراہی میں کارروائیاں کر رہے تھے۔

فرانس 1947ء

جرمنوں سے اشتراک کر لینے والے فرانسیسیوں کے برخلاف اشتراکی پارٹی کے ارکان نے دوران جنگ لڑائی میں حصہ لیا تھا۔ جنگ کے بعد اشتراکیوں نے قانونی راستہ اختیار کرتے ہوئے سیاسی میدان میں مقابلہ کرنے کے لیے مضبوط مزدور تنظیمیں قائم کیں مگر امریکہ نے انہیں تسلیم نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ ان میں سے بعض تنظیمیں فرانسیسی فوجوں کو جو امریکہ کی مدد سے اپنی سابقہ نوآبادی ویتنام کو دوبارہ فتح کرنے کی کوشش کر رہی تھیں ہتھیاروں کی فراہمی روکنے کے لیے اقدامات کر رہی تھیں۔ امریکہ نے اشتراکیوں کی سب سے بڑی مخالف سوشلسٹ پارٹی کو بڑی بڑی رقمیں فراہم کیں، کیونٹ پارٹی کی یونین کی برتری ختم کرنے کے لیے امریکن فیڈریشن آف لیبر کے ماہرین بھیجے گئے، اشتراکیوں کی ہڑتالوں کا توڑ کرنے کے لیے اٹلی سے افرادی قوت منگوائی گئی، بد معاش گروہوں کو اسلحہ اور پیسہ فراہم کیا گیا، جماعت کے دفاتر جلائے گئے، جماعت کے اراکین اور ہڑتال کرنے والوں کے ساتھ مار پیٹ کی گئی اور کئی موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے، نفسیاتی جنگ کے ماہرین پر مشتمل ٹیمیں بھیجی گئیں جن کا کام ان تمام اقدامات کو عوام کے بہترین مفاد میں قرار دینا، ان پر دواہ واہ کرنا اور ساتھ ساتھ امداد اور خوراک کی فراہمی روک دینے کی دھمکیاں دینا تھا۔ یہ سب کچھ کیونٹ پارٹی کی شہرت کو نقصان پہنچانے اور ان کی حمایت ختم کرنے کے لیے تھا جس میں انہیں حسب خواہش کامیابی حاصل ہوئی۔

ان خفیہ کارروائیوں پر خرچ ہونے والی رقم کا ایک حصہ مارشل پلان کے فنڈز سے آیا تھا جس نے 1948ء میں اٹلی کے انتخابات میں دھاندلی کے ذریعہ حسب منشاء نتائج کے حصول کے لیے دل کھول کر مدد کی (اس بارے میں تفصیل آگے آئے گی) اور ایسی خفیہ کارروائیوں کے لیے ایک ایجنسی قائم کی جو بعد میں سی آئی اے میں مدغم ہو گئی۔ یہ مارشل پلان کے چند پوشیدہ ”کارنامے“ ہیں جو کہ عرصہ دراز تک دنیا کے لیے امریکہ کی خیر خواہی اور بے لوث خدمت کی سنہری مثال بنے رہے۔

یہی وہ وقت تھا جب امریکہ فرانسیسی حکومت پر دباؤ ڈال رہا تھا کہ وہ اپنے اشتراکی وزراء کو برخاست کر دے ورنہ اس کی اقتصادی امداد بند کر دی جائے گی۔ وزیر اعظم پاؤل راما

وائر نے اس صورتحال پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ ”ہماری تھوڑی بہت آزادی بھی ہر قرضے کے ساتھ رخصت ہو رہی ہے۔“

مارشل آئی لینڈز 1946-58ء

سرد جنگ کی ضروریات کو مد نظر رکھتے ہوئے امریکہ نے درجنوں بین البراعظمی ہیلٹک میزائل اور ایٹم بموں کی تنصیب کے ساتھ ساتھ دیگر ایٹمی تجربات کے لیے ان جزائر کے رہائشیوں کو زبردستی یہاں سے نکال کر غیر آباد جزایروں میں رہائش پذیر ہونے پر مجبور کیا۔ سب سے زیادہ ظلم کینی ایٹول کے رہائشیوں کے ساتھ ہوا۔ 1968ء میں جانسن انتظامیہ کی جانب سے کینی کے سابقہ رہائشیوں کو بتایا گیا کہ ان کے جزیرہ کو صاف کر دیا گیا ہے اور اب وہ رہائش کے لیے محفوظ ہے۔ ان میں سے بہت سے اپنے گھروں کو واپس چلے گئے۔ بعد میں انہیں بتایا گیا کہ انہیں یہاں بھیجنے کا مقصد تابکاری اثرات کا اندازہ کرنا تھا۔ جب ان پر تجربہ مکمل ہو گیا تو انہیں دوبارہ یہ جگہ چھوڑ دینے کو کہا گیا۔ 1983ء میں ایک بار پھر امریکی حکمہ داخلہ نے اعلان کیا کہ جزیرے کے باسی فوری طور پر واپس اپنے گھروں کو جاسکتے ہیں مگر اکیسویں صدی کے آخر تک اپنی زمین پر اگی ہوئی فصل نہیں کھا سکتے۔ پس ان میں سے کسی نے واپس جانے کا سوچا تک نہیں۔

اٹلی 1947ء سے 70ء کی دہائی تک

1947ء میں امریکہ نے اٹلی کی حکومت پر شدید دباؤ ڈالا کہ وہ کابینہ کے کیونسٹ اور سوشلسٹ ارکان کو برخاست کر دے ورنہ اس کی اقتصادی امداد بند کر دی جائے گی۔ اس سے اگلے سال اور پھر اگلی کئی دہائیوں تک عام انتخابات میں کیونسٹ اور سوشلسٹ جماعتوں کا اتحاد ہوتا یا پھر کیونسٹ جماعت تنہا ہی امریکہ کی حمایت یافتہ عیسائی جمہوریت پسند جماعت کے لیے خطرہ بنتی رہی۔ سی آئی اے نے ہر (غلط) طریقہ اختیار کیا اور اٹلی کے عوام پر سیاسی اقتصادی اور نفسیاتی جنگ کے تمام حربے استعمال کئے اس کے ساتھ ساتھ عیسائی جمہوریت پسند جماعت کے امیدواروں کو خفیہ طور پر دل کھول کر مالی امداد فراہم کی۔ جس نے انہیں کامیابی دلائی۔ ایک بار نہیں بار بار اس طریقہ پر عمل کیا گیا اور بار بار کامیابی حاصل کی گئی۔ جمہوریت کی روح کے منافی یہ تمام اقدامات اٹلی میں ”جمہوریت کے تحفظ“ کے نام پر کئے

گئے۔ کئی امریکی کارپوریشنوں نے بھی بائیس بازو کی جماعت کو اقتدار سے باہر رکھنے کے لیے لاکھوں ڈالرز کی امداد کے ذریعہ اپنی حکومت سے بھرپور تعاون کا مظاہرہ کیا۔

یونان 1947-49ء

امریکہ نے خانہ جنگی میں مداخلت کرتے ہوئے بائیس بازو کے یونانیوں کے خلاف فاشسٹوں کا ساتھ دیا۔ حالانکہ بائیس بازو کے یونانی نازیوں کے خلاف نہایت جراتمندی سے لڑے تھے۔ فاشسٹوں کی کامیابی کے ساتھ ظالم حکومت برسرِ اقتدار آگئی جس کے لیے سی آئی اے نے داخلی سلامتی کی تنظیم قائم کی۔ اگلے چند برس تک یونان امریکہ کے اشاروں پر ٹاپنے والا ملک بنا رہا۔

فلپائن 1945-53ء

امریکہ نے بائیس بازو کی ہک فوجوں کے خلاف اس وقت لڑائی شروع کی جبکہ ابھی وہ جنگ عظیم میں جاپانی حملہ آوروں کے خلاف برسرِ پیکار تھیں۔ جنگ کے بعد امریکہ نے فلپائن کی مسلح افواج کو نکالنے کے خلاف لڑائی جاری رکھنے کے لیے منظم کیا اور بالآخر انہیں شکست دے کر ان کی اصلاحی تحریک کو کچل دیا۔ سی آئی اے نے عام انتخابات میں مداخلت کرتے ہوئے صدارتی امیدواروں کے لیے کھ پتلیوں کی وسیع قطار کھڑی کر دی جن میں سے فرڈیننڈ مارکوس کے نام قمر لکھا اور اس کے نتیجہ میں وہ طویل آمرانہ حکومت قائم ہوئی جس کا طرہ امتیاز تشدد تھا۔

کوریاء 1945-53ء

جنگ عظیم دوم کے بعد امریکہ نے دورانِ جنگ اپنی حلیف ترقی پسند عوامی تنظیموں کو بزرگوں کی طاقت دباتے ہوئے ان کے خلاف ان قدماء پرستوں کا ساتھ دیا جو جاپانیوں کے معاون رہے تھے۔ نتیجتاً شمالی اور جنوبی کوریاء کو یکجا کرنے کے بہترین مواقع ضائع کر دیے گئے۔ اس کے بعد جنوب میں بددیانت رجعت پسند اور سنگدل حکومتوں کا دور شروع ہوا اور 1950-53ء کے دوران کوریائی جنگ میں بڑے پیمانے پر امریکی فوج کی مداخلت اور جنگی جرائم کا سلسلہ عمل میں آیا۔ شمالی کوریاء کے جنوبی کوریاء پر حملے کو تو محض بہانہ بنایا گیا تھا حالانکہ امریکی فوجوں نے یہاں جو کچھ کیا اس کا اس سارے معاملہ سے دور کا واسطہ بھی نہیں تھا جبکہ

دنیا پر یہ ظاہر کیا جاتا رہا کہ مظلوم کی مدد کی جارہی ہے۔

1999ء میں یہ بات ہمارے علم میں آئی کہ جنگ شروع ہونے کے کچھ ہی عرصہ بعد امریکی سپاہیوں نے مشین گنوں سے فائرنگ کر کے سینکڑوں نہتے بے گناہ اور بے یارو مددگار شہریوں کو بلاوجہ مار ڈالا۔ ایسے ہی بے شمار واقعات میں سے کچھ میں سینکڑوں معصوم شہری اس وقت مارے گئے جب امریکہ نے قصداً وہ پل نذر آتش کر دیئے جن پر سے وہ گزر رہے تھے۔

البانیہ 1949-53ء

امریکہ اور برطانیہ نے البانیہ میں کمیونسٹ حکومت کا تختہ الٹ کر مغرب کی حامی حکومت کا قیام عمل میں لانے کے لیے بڑی تعداد میں غیر ملکی گوریلے ملک میں داخل کر دیئے حالانکہ یہاں اکثریت شاہ پرست اٹلی کے فاشٹ اور نازیوں کی مددگار تھی۔ سینکڑوں غیر ملکی گوریلے یا تو ہلاک ہو گئے یا پھر جیلوں میں ڈال دیئے گئے۔

مشرقی یورپ 1948-56ء

سی آئی اے کے سربراہ ”ایلن ڈیولس“ نے شطرنج کی ایک شاندار چال چلتے ہوئے پولینڈ کے ایک اعلیٰ افسر دفاع ”جوزف سوئیکو“ کو اکسایا کہ وہ متنازعہ امریکی ”نویٹل فیلڈ“ کو استعمال کرتے ہوئے مشرقی یورپ میں قومی سلامتی کی انتظامیہ کے اہلکاروں میں شدید احساس برتری، خود کو بہت کچھ سمجھنے کا جنون پیدا کر دے۔ اس کے نتیجے میں بریت کے لیے بے شمار مقدمے ہوئے ہزاروں گرفتاریاں اور قیود عمل میں آئیں اور کم از کم سینکڑوں افراد ہلاک ہوئے۔

جرمنی 50ء کی دہائی

سی آئی اے نے مشرقی جرمنی میں وسیع پیمانے پر توڑ پھوڑ دہشت گردی اور آخری حد تک غلط کارروائیوں کا بازار گرم کرنے کے ساتھ ساتھ نفسیاتی جنگ کے ہر ممکن حربے آزمائے۔ 1961ء میں دیوار برلن کی تعمیر کی بہت سی وجوہات میں سے یہ ایک نہایت اہم سبب تھا۔

امریکہ نے جرمنی میں ایک خفیہ شہری فوج بھی تشکیل دی جس نے ان 200 اہم

سامی جمہوریت پسندوں 15 اشتراکیوں اور بے شمار دیگر اہم افراد پر مشتمل ایک فہرست تیار کی جنہیں سوویت حملے کی صورت میں ”راستے سے ہٹانا“ تھا۔

اس خفیہ فوج کی طرح کی کئی تنظیمیں پورے مشرقی یورپ میں موجود تھیں جو کہ ”آپریشن گلیڈ یو“ کا حصہ تھیں۔ ”آپریشن گلیڈ یو“ سی آئی اے اور دیگر خفیہ اداروں کا تیار کردہ تھا جو کہ اپنی کارروائیوں کے بارے میں کبھی ریاست کے قانون کے سامنے جوابدہ نہیں تھا۔ 1949ء میں نیٹو کے قیام کے بعد یہ اس کے زیر اثر آ گیا۔ ”گلیڈ یو“ نے یورپ میں دہشت گردی کی بے شمار کارروائیاں کی جن میں سے ایک اہم بولوگنہ ریلوے سٹیشن پر بم دھماکہ کی کارروائی تھی جس میں 86 افراد ہلاک ہوئے۔ دہشت گردی کی ان کارروائیوں کا مقصد یہ تھا کہ ان کا الزام بائیں بازو کی جماعت پر دھر کے سوویت جارحیت کے خلاف عوامی اشتعال میں اضافہ کیا جائے اور اس کے ذریعہ بائیں بازو کے انتخابی امیدواروں کو نقصان پہنچایا جائے۔ نیٹو کو یہ خوف تھا کہ اگر اس کے کسی رکن ملک میں بائیں بازو کی حکومت قائم ہوگئی تو وہ ایسی قانون سازی کر سکتی ہے جو اس ملک میں نیٹو کے اڈوں اور کارروائیوں کے لیے خطرہ ثابت ہوگی۔

ایران 1953ء

امریکہ اور برطانیہ کی مشترکہ کارروائی کے نتیجے میں وزیراعظم مصدق کی حکومت کا تختہ الٹ دیا گیا۔ مصدق پارلیمنٹ میں بھاری اکثریت کے نتیجے میں وزیراعظم کے عہدہ پر فائز ہوا تھا مگر بد قسمتی سے اس سے ایک ایسی غلطی ہوگئی جو اس کی حکومت کے خاتمے کا باعث بنی وہ غلطی یہ تھی کہ اس نے ایران میں کام کرنے والی ایک برطانوی ملکیتی تیل کمپنی کو قومیاں کی تحریک شروع کر دی تھی۔ مصدق حکومت کے خلاف انقلاب کے نتیجے میں شاہ کو دوبارہ مکمل اختیارات سونپ دیئے گئے اور جبر و تشدد کے 25 سالہ دور کا آغاز ہو گیا جبکہ تیل کی صنعت دوبارہ غیر ملکی ملکیت میں دے دی گئی جس میں سے برطانیہ اور امریکہ ہر ایک نے 40 فیصد حصہ حاصل کیا۔

گوئے مالا 1953ء سے 90ء کی دہائی تک

مزاح نگار ڈیو پیری نے موزون نظریہ کو مندرجہ ذیل تین سادہ سے نکات میں سمیٹ

دیا ہے۔

- 1- اس کرۂ ارض پر دوسری قوموں کو کسی قوم کے اندرونی معاملات میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں ہے۔
- 2- مگر ہمیں ہے۔
- 3- ہا ہا ہا۔

جیک آرئیز کی جمہوری بنیادوں پر منتخب ترقی پسند حکومت کا تختہ سی آئی اے کے منظم شدہ انقلاب کے ذریعہ الٹا اور اس کے بعد 40 سال پر مشتمل فوجی دور حکومت کا آغاز ہوا۔ قاتل ٹولے کے برسرِ اقتدار آتے ہی تشدد، اغوا، پھانسیوں اور ناقابلِ تصور ظلم و ستم کا بازار گرم ہو گیا جس میں 200,000 سے زائد افراد متاثر ہوئے۔ بغیر کسی اختلاف کے اسے بیسویں صدی کا غیر انسانی دور قرار دیا جاسکتا ہے۔ کئی سالوں بعد اس فوجی انقلاب کا جواز یہ پیش کیا گیا کہ گوئے مالا سودیت یونین کے قبضہ میں جانے والا تھا۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ روسیوں کو اس ملک میں اتنی دلچسپی بھی نہیں تھی کہ اس کے ساتھ سفارتی تعلقات ہی رکھتے۔ اصل مسئلہ یہ تھا کہ آرئیز نے امریکہ کی ایک فرم یونائیٹڈ فروٹ کمپنی جس کے امریکی ایوانِ اقتدار میں نہایت قریبی تعلقات تھے کی غیر کاشت شدہ اراضی حکومتی تحویل میں لے لی تھی۔ مزید برآں امریکہ کو یہ خوف بھی لاحق تھا کہ کہیں گوئے مالا کی سماجی جمہوریت کی طرز کی حکومت لاطینی امریکہ کے دیگر ممالک میں بھی نہ پھیل جائے۔

1996ء میں حکومت اور باغیوں کے درمیان ہونے والے ”امن“ معاہدہ کے باوجود گوئے مالا میں انسانی حقوق کے احترام کا صرف تصور ہی کیا جاسکتا ہے۔ یونین کے اراکین اور دیگر مخالفین کی ہلاکتوں کا سلسلہ مستقل طور پر جاری ہے، تشدد کی کارروائیاں دن بدن شدت اختیار کرتی جا رہی ہیں، نچلا طبقہ آج بھی ہمیشہ کی طرح پس رہا ہے، فوج کو آج بھی ایک بھیانک ادارہ کی حیثیت حاصل ہے، امریکہ مستقل طور پر گوئے مالا کی فوج کو مسلح کرنے اور تربیت دینے میں مصروف ہے اس کے ساتھ ساتھ فوجی مشقیں بھی جاری ہیں اور اس ”امن“ معاہدہ“ کی بنیادی شرط یعنی فوجی اصلاحات اب تک نہیں کی گئیں۔

کوشاریکا 50ء کی دہائی کا وسط اور 71-1970ء

آزاد خیال امریکی سیاسی رہنماؤں کے نزدیک صدر جوزف کیمپوز ایک ہمہ صفت ”آزاد خیال جمہوریت پسند“ تھا۔ اس کا سیاستدانوں کی اس قسم سے تعلق تھا جنہیں نہ صرف یہ کہ امریکہ خود پسند کرتا ہے بلکہ چاہتا ہے کہ دنیا بھی انہیں پسند کرے۔ سیاستدانوں کی یہ قسم فوجی آمروں سے بھی زیادہ امریکی خارجہ پالیسی کی فطری مقلد ہوتی ہے۔ اس کے باوجود امریکہ نے فلکبوڑز کا 50ء کی دہائی میں اور غالباً 70ء کی دہائی میں بھی جب وہ دوسری بار صدر بنا تھا تختہ الٹنے کی اور دوبار اسکو خفیہ طور پر قتل کرانے کی کوشش کی۔ اس کی وجہ کیا تھی؟ ایک تو یہ کہ فلیورز بائیں بازو کے لیے سخت ثابت نہیں ہوا اسکے دور میں کوشاریکا، سوویت یونین اور مشرقی یورپ کے ساتھ سفارتی تعلقات قائم کرنے والا وسطی امریکہ کا پہلا ملک بن گیا۔ دوسرے یہ کہ وہ مختلف مواقع پر امریکی خارجہ پالیسی پر کھلے عام اعتراضات کرنے لگا تھا جیسے کہ جنگی سوز بھونکتے ہیں۔

مشرق وسطیٰ 58-1956ء

آئزن ہاور نظریہ کے مطابق ”اگر مشرق وسطیٰ کا کوئی ملک کسی ایسے ملک کی مسلح جارحیت کے خلاف جو بین الاقوامی اشتراکیت کے زیر اثر ہو امریکہ سے مدد کی درخواست کرتا ہے تو امریکہ اسے مسلح فوجی امداد فراہم کرنے کیلئے تیار ہے۔“ آسان الفاظ میں اسے یوں کہہ لیجئے کہ امریکہ کے سوا کسی کو برتری کی یا مشرق وسطیٰ اور اس کے تیل کے ذخائر کی طرف دیکھنے کی بھی یا اس پر اثر انداز ہونے کی قطعی اجازت نہیں دی جائے گی اور اگر کسی نے ایسا کرنے کی کوشش کی تو اسے ”اشتراکی“ قرار دے دیا جائے گا۔ اس پالیسی کے عین مطابق امریکہ نے دوبار شام کی حکومت کا تختہ الٹنے کی کوشش کی، اردن اور لبنان میں امریکہ کی حمایت یافتہ حکومتوں کے خلاف اٹھنے والی تحریکوں کو کچلنے اور انہیں خوفزدہ کرنے کے لیے بحیرہ روم میں طاقت کے کئی مظاہرے کئے، لبنان میں 14 ہزار فوجی دستے اتارے اور مصر کے صدر ناصر کی حکومت کا تختہ الٹنے اور ان کے خفیہ قتل کی سازشیں تیار کی گئیں کیونکہ انکی عرب قوم پرستی امریکہ کے لیے مصیبت بن گئی تھی۔

انڈونیشیا 58-1957ء

صدر ناصر کی طرح سویکارنو بھی تیسری دنیا کے رہنماؤں کی اس قسم سے تعلق رکھتا تھا جو امریکہ کے لیے کسی طور قابل برداشت نہیں۔ ایک قوم پرست جو سرد جنگ کے دوران نہایت بنجیدگی سے غیر جانبدارانہ پالیسی پر عمل پیرا رہا۔ جس نے امریکہ کے ساتھ ساتھ چین اور سوویت یونین کے دورے بھی کیے، جس نے ایک سابقہ نوآبادیاتی طاقت ہالینڈ کی کئی نجی ملکچیں تو میا لیس اور انڈونیشیا کی کمیونسٹ پارٹی پر پابندی عائد کرنے سے صاف انکار کر دیا جو قانونی دائرہ میں اپنے امور سرانجام دے رہی تھی اور انتخابی حلقوں میں قابل قدر حیثیت کی حامل تھی۔ سویکارنو کی یہ پالیسیاں امریکہ کے لیے شدید خطرہ کا باعث بن رہی تھیں کیونکہ یہ تیسری دنیا کے دیگر ممالک کو بھی ”غلط راہ“ پر ڈال سکتی تھیں یہی وجہ ہے اس صورتحال سے نمٹنے کے لیے سی آئی اے نے انتخابات میں حسب فضاء نتائج کے لیے پیسہ پانی کی طرح بہانا شروع کر دیا۔ اس کے ساتھ ساتھ سویکارنو کے خفیہ قتل کی سازشیں تیار کی گئیں، اسے جعلی جنسی فلم کے ذریعہ بلیک میل کرنے کی کوشش کی گئی اور حکومت کے خلاف پوری قوت کے ساتھ جنگ لڑنے کے لیے مخالف فوجی افران کو ساتھ ملایا گیا اس میں امریکی پائلٹوں کی طرف سے ہونے والی بمباری بھی شامل تھی مگر سویکارنو ان سب سے محفوظ رہا۔

ہٹی 1959ء

ہٹی کے بدنام زمانہ آمر فرینکس ڈویلپیر کے فوجی دستوں کی تربیت پر مامور امریکی فوجی مشن نے کیوبا اور دیگر لاطینی امریکیوں کے حمایت یافتہ ہٹی کے چھوٹے سے گروپ کی جانب سے ڈویلپیر حکومت کا تختہ الٹنے کی کوشش کو ناکام بنانے کے لیے اپنی فضائی، بحری اور بری طاقت کا بھرپور استعمال کیا۔

مغربی یورپ 50ء سے 60ء کی دہائی

دو دہائیوں تک سی آئی اے نے امریکی فلاحی تنظیموں، خیراتی اداروں اور اسی طرح کے دیگر اداروں کے ذریعہ جن میں کچھ سی آئی اے کے اپنے منظم کردہ تھے پورے مغربی یورپ کی تنظیموں کو خفیہ طور پر رقم کی فراہمی کا سلسلہ جاری رکھا۔ اس خفیہ امداد سے فائدہ اٹھانے والی سیاسی جماعتیں، جرائد، خبر رساں ادارے، صحافی، مختلف النوع یونین، مزدور تنظیمیں،

طلباء، نوجوانوں کی تنظیمیں، وکلاء، ایسوسی ایشنز اور دیگر شعبہ ہائے زندگی سے متعلق ادارے بظاہر آزاد تھے مگر حقیقت میں وہ امریکہ کے خدمت گار تھے جو سرد جنگ کے دوران اپنی اپنی سطح پر امریکہ کے اشتراکیت مخالف ایجنڈا پر نہ صرف عمل پیرا تھے بلکہ اس کے فروغ کے لیے نہایت تندہی سے مصروف عمل تھے۔ ایک ایسا ایجنڈا جس نے فوج کے زیر اثر اور متحدہ مغربی یورپ کو بھی شامل کر لیا تھا۔ پھر مغربی یورپ صرف امریکہ حلیف ہی نہیں بنا بلکہ اس کے زیر اثر آ گیا اور فرضی سودیت خطرے سے نمٹنے کے لیے مشترکہ منڈی اور نیٹو کو پناہ گاہ تسلیم کرتے ہوئے ان کی حمایت شروع کر دی۔

برطانوی ریگٹا 1953-54ء

امریکہ اور برطانیہ نے مل کر جمہوری طور پر منتخب رہنما چننے کی جنگ کی زندگی اس حد تک اجیران کر دی کہ بالآخر اسے اقتدار سے علیحدہ ہونا پڑا۔ (تفصیلات کے لیے انتخابات والا باب ملاحظہ فرمائیے) جگن کا شمار بھی تیسری دنیا کے ان رہنماؤں میں ہوتا ہے جنہوں نے خود مختار اور غیر جانبدار رہنے کی پالیسی اپنا کر امریکہ کے لیے مستقل پریشانی اور خطرہ کی صورتحال پیدا کر دی تھی۔ اس نے امریکہ کے غضب کو لٹکانے کی کوشش کی تھی۔ اگرچہ وہ بائیں بازو سے تعلق رکھتا تھا اور سویٹکارنو اور آرمینز سے بھی زیادہ سخت نظریات کا مالک تھا مگر اس کی حکومتی پالیسیاں انقلابی نہیں تھیں۔ اس کے باوجود وہ امریکہ کے لیے مستقل خطرہ تھا، ایک ایسا ہدف جو مستقبل میں خطرناک صورتحال پیدا کر سکتا تھا۔ وہ سامراجیت کے مقابلہ میں ایک ایسے معاشرہ کی تشکیل کر رہا تھا جو آنے والے وقت میں بہترین اور کامیاب ترین نظام ثابت ہو سکتا تھا اور حقیقتاً سامراجیت کے مقابلہ میں اس کے تشکیل کردہ نظام معاشرت کو ترجیح دی جاتی۔ یہی وجہ ہے کہ جان ایف کینیڈی نے بذات خود اس کی حکومت کے خاتمہ کا حکم دیا اس سے قبل صدر آئزن ہاور نے بھی ایسا ہی حکم صادر کیا تھا۔

گھیاناجو جگن کے دور میں اس علاقہ کے خوشحال ممالک میں سے ایک تھا۔ 80ء کی دہائی تک غریب ترین ممالک کی فہرست میں شامل ہو چکا تھا اور اس کی سبب سے بڑی برآمد اس کے شہری بن گئے تھے۔

عراق 1958-63ء

جولائی 1958ء میں جنرل عبدالکریم قاسم نے بادشاہت کا تختہ الٹ کے عوامی حکومت قائم کر دی۔ گو کہ وہ اصلاحات کا حامی تھا مگر کسی لحاظ سے بھی انتہا پسند نہیں تھا۔ البتہ اس کے اقدامات نے عوام الناس میں انقلابی جوش و خروش پیدا کر دیا اور عراقی کمیونسٹ پارٹی کا زور بے حد بڑھ گیا۔ اسی سال اپریل میں سی آئی اے کے ڈائریکٹر ایلن ڈیوس نے کانگریس کے سامنے حسب عادت بات کو بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہوئے کہا کہ ”عراق کے اشتراکی بعث مکمل طور پر حکومت پر قابض ہونے ہی والے ہیں اور اس وقت عراق دنیا بھر میں سب سے زیادہ خطرناک صورتحال سے دوچار ہے۔“ جبکہ حقیقت یہ تھی کہ قاسم سرد جنگ کے دوران غیر جانبدارانہ کردار ادا کر رہا تھا اور اشتراکیت مخالف پالیسیوں کو جاری رکھے ہوئے تھا۔ انہیں نہ تو اس نے اپنی کابینہ میں نمائندگی دی تھی نہ ہی مکمل قانونی حیثیت حالانکہ وہ ان دونوں اقدامات کے شدت سے خواہشمند تھے۔ وہ اشتراکیوں کو علیحدہ رکھتے ہوئے دیگر نظریاتی گروہوں کی مدد سے اقتدار کو قائم رکھے ہوئے تھا۔

1958ء کے انقلاب کے فوری بعد امریکہ کے جوائنٹ چیفس آف سٹاف نے امریکہ اور ترکی کے مشترکہ حملے کا ایک خفیہ منصوبہ تیار کر لیا تھا۔ کہا جاتا ہے سوویت یونین کی جانب سے عراق کی حمایت کی دھمکی نے امریکہ کو اس منصوبہ پر عملدرآمد نہیں کرنے دیا۔ مگر دوسری چال چلتے ہوئے 1960ء میں امریکہ نے کمرگوریوں کی مالی امداد شروع کر دی جو اختیارات کے حصول کی لڑائی میں مصروف تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ سی آئی اے نے قاسم کے خفیہ قتل کی کوشش بھی کی جو ناکام رہی۔

عراقی رہنما نے اس وقت تو خود کو بالکل ہی توپ کے دہانے پر بٹھا دیا جب اسی سال اس نے تیل برآمد کرنے والے ممالک کی تنظیم (اوپیک) کی تشکیل میں مدد کی۔ یہ وہ تنظیم تھی جس نے عربوں کے تیل پر چلنے والی مغربی تیل کمپنیوں کی اجارہ داری کو چیلنج کیا تھا اور 1962ء میں تو قاسم نے قومی تیل سے استفادہ کرنے کے لیے قومی تیل کمپنی قائم کر کے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔

فروری 1963ء میں قاسم نے فرانسیسی اخبار ”لی موئنڈے“ کو بتایا کہ امریکہ نے

مجھے خاصے کھلے الفاظ میں دھمکی دی ہے کہ اگر میں نے اپنا رویہ تبدیل نہ کیا تو عراق کے خلاف پابندیاں عائد کر دی جائیں گی..... دراصل سامراجیوں (امریکہ اور برطانیہ) کے ساتھ ہماری مشکلات کا آغاز اسی روز سے ہو گیا تھا جب ہم نے کویت پر اپنے قانونی حق کا دعویٰ کیا تھا۔ (مشرق وسطیٰ کے تیل کی دولت پر قابض ہونے کی امریکی و برطانوی خواہش کے سلسلہ میں کویت کو بنیادی حیثیت حاصل تھی) قاسم کے اس بیان کے شائع ہونے کے محض چند دن بعد ایک انقلاب کے ذریعہ اس کا تختہ الٹ دیا گیا اور نہایت مختصر کارروائی کے بعد اسے پھانسی دے دی گئی جبکہ ہزاروں کی تعداد میں اشتراکی ہلاک کر دیئے گئے۔ اس کارروائی کے فوری بعد وزارت خارجہ نے پریس کو بتایا کہ ”یہ نہایت خوش آئند بات ہے کہ نئی حکومت بین الاقوامی معاہدوں کی تعظیم کرے گی اور وہ عراق کی سب سے بڑی تیل کی کمپنی کو جس کا ایک بڑا حصہ امریکہ کی ملکیت ہے کو میمانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی۔“ اس نئی حکومت نے کم از کم اس وقت تو کویت پر اپنے دعویٰ کے حوالے سے بھی خاموشی اختیار کر لی تھی۔

بعد ازاں برطانوی کابینہ کی 1963ء کی دستاویز کے ذریعہ انکشافات ہوئے کہ اس انقلاب کے پیچھے برطانیہ اور سی آئی اے تھے۔

سوویت یونین 40ء سے 60ء کی دہائی

امریکہ نے بے شمار جلاوطن روسیوں کو ان مقاصد کے حصول کے لیے سوویت یونین میں داخل کیا کہ وہ فوجی اور تکنیکی اڈوں کے بارے میں خفیہ معلومات اکٹھی کریں، خفیہ قتل کریں، شناختی دستاویزات کے جدید نمونے حاصل کریں، مغربی جاسوسوں کو بحفاظت نکالنے میں مددگار ثابت ہوں، دہشت گردی اور انتشار پھیلانے میں مثال کے طور پر ریل گاڑیوں کو پٹر یوں سے اتارنا، پل اڑانے، اسلحہ فیکٹریوں اور بجلی کے پلانٹس پر حملے وغیرہ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اشتراکی حکومت کے خلاف مزاحمتی تحریک کی صورت میں مسلح سیاسی جدوجہد شروع کریں۔ اس سلسلہ میں سی آئی اے کی سوویت یونین کے خلاف پراپیگنڈہ مہم بھی پورے جوش و خروش سے جاری تھی۔ انگریزی میں معروف مصنفین سے سوویت یونین کے خلاف ہزاروں کتابیں لکھوا کر نہ صرف شائع کی گئیں بلکہ سینکڑوں غیر ملکی زبانوں میں ان کے تراجم کرا کے دنیا بھر میں تقسیم بھی کی گئیں۔

ویتنام 73-1945ء

ڈک گرینری کے الفاظ میں ”ہم ویتنام میں کیا کر رہے ہیں؟ پہلے کو ختم کرنے کے لیے سیاہ فام کو استعمال کر رہے ہیں تاکہ سفید فام اس زمین پر قابض رہ سکے جو سرخ سے حاصل کی تھی۔“

اس اکھاڑ پچھاڑ کا آغاز اس وقت ہوا جب امریکہ نے فرانس کا ساتھ دیا جو کہ سابقہ نوآباد کار جاپانیوں کا مددگار اور ہوچی منہ اور اس کے ساتھیوں کا بہت بڑا مخالف تھا۔ جنہوں نے جنگ میں اتحادیوں کا ساتھ دیتے ہوئے امریکہ کے ہر اقدام کی حمایت کی تھی۔ مگر بہر حال ہوچی منہ کسی حد تک ”اشتراکی“ تھا۔ (ان میں سے ایک جو آپ کے لیے خطرہ تھے) اس نے صدر ٹرومین اور محکمہ خارجہ کو بے شمار خطوط لکھے جن میں ویتنام کو فرانس سے آزاد کرانے اور ملک کے لیے پرامن حل تلاش کرنے کے لیے امریکی امداد کی درخواست کی گئی تھی۔ مگر امریکہ نے اس کی التجاؤں کو درخود اعتناء نہ سمجھا۔ کیونکہ بہر حال وہ کسی حد تک ”اشتراکی“ تھا۔ ہوچی منہ نے امریکہ کے سامنے ویتنام کی آزادی کا نیا اعلامیہ پیش کر دیا جس کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا تھا کہ ”سب انسان برابری کی بنیاد پر پیدا کئے گئے ہیں۔ ان کے خالق نے انہیں ایک برابر حقوق دیئے ہیں۔“ مگر امریکہ کے نزدیک اس کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ کیونکہ بہر حال ہوچی منہ کسی حد تک ”اشتراکی“ تھا۔

بیس سال سے زائد عرصہ گزرنے کے بعد اور دس لاکھ سے زائد ہلاکتیں ہو جانے کے بعد امریکہ کو ویتنام سے اپنی فوجیں نکالنی پڑیں۔ عام خیال یہ ہے کہ امریکہ کو اس جنگ میں ذلت آمیز شکست سے دوچار ہونا پڑا مگر ویتنام کو مکمل طور پر تباہ کر کے اس کی زمین کی تہوں اور پانی میں زہر بھر کے اس کی سلیں برباد کر کے امریکہ نے اپنا بنیادی مقصد حاصل کر لیا تھا وہ ایشیاء کی ترقی کا راستہ روکنے میں کامیاب ہو گیا تھا کیونکہ بہر حال ہوچی منہ کسی حد تک ”اشتراکی“ تھا۔

کمبوڈیا 73-1955ء

پرنس سہانوک کا شمار بھی ان رہنماؤں میں ہوتا ہے جو کسی طور امریکہ کے لیے قابل قبول نہیں ہوتے۔ اس کی حکومت کے خلاف کئی سالوں پر محیط زیادتیوں کے بعد جن میں اس

کے لائحہ عمل کے منصوبے اور 1969-70ء کے دوران ہونے والی بدنام زمانہ نکسن / کسنگر خفیہ کارپٹ بمباری جیسی کارروائیاں شامل تھی بلکہ آخر 1970ء میں ایک انقلاب کے ذریعہ امریکہ سہانوک حکومت کا تختہ الٹنے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ سارا کھیل پالیٹ اور اس کی خمیر روج کے لیے راہیں ہموار کرنے کے لیے کھیلا گیا تھا۔ آخر کار پانچ سال بعد وہ برسر اقتدار آ گئے مگر اس عرصہ میں امریکی بمباری سے کمبوڈیا کی معیشت بری طرح سے تباہ ہو چکی تھی۔ پرانا کمبوڈیا ہمیشہ کے لیے برباد ہو کر رہ گیا تھا۔

اس بد قسمت ملک کے لیے خمیر روج بہت بڑا عذاب ثابت ہوئی۔ ستم بالائے ستم یہ کہ پالیٹ اور خمیر روج کی دیتا میوں کے ہاتھوں ذلت آمیز شکست کے بعد امریکہ نے ان کی مکمل حمایت اور ہر طرح سے امداد کی۔ (ملاحظہ فرمائیے) مزید تفصیلات کے لیے باب ”پالیٹ“

لاؤس 1957-73ء

لاؤس کی بائیں بازو کی جماعت نے ”پلتھیٹ لائو“ کی سربراہی میں ملک میں پر امن طریقے سے معاشرتی تبدیلی لانے کی سعی کرتے ہوئے انتخابات میں شاندار کامیابی حاصل کرنے کے بعد مختلف جماعتوں کے اتحاد سے حکومت قائم کی۔ مگر امریکہ کو اس سارے عمل سے کوئی دلچسپی نہیں تھی تبھی تو سی آئی اے اور محکمہ خارجہ نے طاقت کے استعمال رشوت اور مختلف النوع دباؤ کے ذریعہ 1958، 1959 اور 1960ء میں انقلاب ترتیب دیے۔ ایسے میں پلتھیٹ لائو پاس مسلح طاقت کے استعمال کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ سی آئی اے نے اپنی مشہور فوج کلینڈ سٹائن ”منظم کی جس میں تیس ہزار ایشیائی لڑائی میں حصہ لینے کے لیے اکٹھے کئے گئے تھے جبکہ 1965ء سے 1973ء کے دوران امریکی فضائیہ نے لائو س کے بے یار و مددگار شہریوں پر بیس لاکھ ٹن بم برسائے۔ لائو س کے شہریوں کی اکثریت آسمان سے نازل ہونے والے اس عذاب سے بچنے کے لیے سالہا سال تک غاروں میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئی۔ دیتام کے واقعات کو روشنی میں جب پلتھیٹ لائو نے ملک کا نظم و نسق سنبھالا تو لاکھوں ہلاکتیں اور اس سے زیادہ لوگ معذور ہو چکے تھے جبکہ بمباری سے متاثرہ بے شمار دیہاتوں کے صرف آثار ہی رہ گئے تھے۔

تھائی لینڈ 73-1965ء

ویتنام اور لاؤس پر روزانہ بمباری کے لیے تھائی لینڈ کو استعمال کرتے ہوئے امریکہ نے یہاں پولیس تشدد اور امریکی فوج کی موجودگی کے خلاف اور معاشی اصلاحات کے حق میں جاری تحریک کو کچلنے کا آغاز بھی کر دیا۔ امریکی فوج یہاں اپنے عظیم الشان فضائی اڈوں، بیرکوں، ہاؤس، سڑکوں اور عمارتوں کے ساتھ ساتھ کئی اہم منصوبوں سمیت قیام پذیر تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ جیسے وہ اس ملک پر قابض ہو چکی ہے۔ حقیقتاً تھائی لینڈ میں امریکی فوجوں کی تعداد 40,000 تک پہنچ چکی تھی جو کہ شہری تنازعات میں بھی ملوث ہو جاتے تھے۔ اس میں 365 گرین بیرٹ فورسز بھی شامل تھیں جو کہ ویتنام کی طرح یہاں بھی سرکاری ”مشیر“ کی حیثیت سے آئی تھیں۔

گوریلوں سے مقابلہ کرنے کے لیے امریکہ نے پولیس اور فوج کو پیسہ بھی فراہم کیا اور مسلح کرنے کے ساتھ ساتھ انہیں مکمل تربیت بھی دی اور ان کی تعداد بڑھانے کے لیے سرکاری فوجوں کو ہیلی کاپٹرز کے ذریعہ جنگ زدہ علاقوں میں بھیجا جہاں وہ مشیروں کی حیثیت سے اپنے امور سرانجام دیتے رہے اور بعض اوقات تھائی سپاہیوں کے ساتھ گوریلوں کے خلاف لڑتے بھی رہے۔ مزید برآں امریکہ نے نہایت منظم انداز میں پراپیگنڈہ کا سلسلہ جاری رکھا اور نفسیاتی جنگ کی کارروائیوں کے ذریعہ تھائی حکومت کو مزید طاقت کے استعمال اور شدید رد عمل کے لیے اکساتا رہا۔ تاہم تھائی لینڈ کے تنازعہ میں امریکہ کے کردار کا مقابلہ ویتنام سے نہیں کیا جاسکتا۔

1966ء میں واشنگٹن پوسٹ کی ایک رپورٹ کے مطابق ”بعض اہل نظر کی رائے میں تھائی لینڈ میں جاری آمریت اس وقت تک امریکہ کے مفاد میں ہے جب تک یہ امریکی فوجی اڈوں کے قیام کی ضمانت بنی ہوئی ہے اور جیسا کہ ایک امریکی اہلکار نے نہایت دو ٹوک الفاظ میں کہا کہ ”ہماری حقیقی دلچسپی اس جگہ میں ہے۔“

ایکواڈور 63-1960ء

حکومت کے ہر محکمہ میں اپنے افراد داخل کر کے یہاں تک کہ اقتدار میں صدر کے بعد دو اہم ترین شخصیات کو ساتھ ملا کر اور ناجائز اور شیطانی حربوں کے ذریعہ سی آئی اے نے

صدر جوز مار یہ ولاسکو کو اقتدار سے علیحدہ کر دیا۔ صدر جوز مار یہ ولاسکو کا قصور یہ تھا کہ اس نے کیوبا کے حوالے سے امریکی پالیسی کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا تھا اور اس نے بائیں بازو کے خلاف سخت رویہ اختیار نہیں کیا تھا۔ جب اس کی جگہ لینے والے حکمران نے بھی کیوبا کے ساتھ تعلقات ختم کرنے سے انکار کیا تو سی آئی اے کے تنخواہ دار ایک فوجی رہنما کی ایک ہی دھمکی نے اسے اپنا موقف بدلنے پر مجبور کر دیا۔

کاگو/زائرے 1960-65ء، 1977-78ء

بیلجیم سے آزادی حاصل کرنے کے بعد جون 1960ء میں پیرک لومبارا پر امن انداز میں قانونی طور پر کاگو کے پہلے وزیراعظم بنے۔ یوم آزادی کی تقریبات کے دوران وزیراعظم لومبارا نے غیر ملکی مہمانوں کے سامنے ملک کے سفید فام آقاؤں کی جانب سے مقامی آبادی پر ڈھائے جانے والے ظلم و ستم اور نا انصافیوں کی طویل فہرست بیان کرتے ہوئے قوم کی اقتصادی اور سیاسی آزادی کا مطالبہ کیا۔ یہ شخص یقیناً ”اشتراکی“ تھا اور ظاہر ہے کہ موت کا حقدار بھی خاص طور پر ایسے وقت میں جب بیلجیم کا تنگ صوبے میں ملک کے وسیع معدنیاتی ذخائر پر تھا اور آئرن ہاور انتظامیہ کے نمایاں افسران کے اس دولت کے ساتھ معاشی مفادات وابستہ تھے۔

گیارہ روز بعد کا تنگ علیحدہ ہو گیا۔ ستمبر میں امریکہ کے دباؤ پر صدر نے وزیراعظم لومبارا کو ان کے عہدہ سے برخاست کر دیا پھر آئرن ہاور کے حکم پر اور سی آئی اے کی شمولیت سے جنوری 1961ء میں لومبارا کو خفیہ طور پر قتل کر دیا گیا۔ اس کے بعد کئی سال تک ملک افراتفری اور انتشار کا شکار رہا۔ 1965ء میں موبوتو سیسی سیکو کے اقدار کا سورج طلوع ہوا۔ ایک ایسا شخص جو سی آئی اے کے لیے اجنبی نہیں تھا۔ موبوتو نے اپنے اقتدار کے تیس سال کے دوران اس ملک (جس کا نام اس نے زائرے رکھ دیا تھا) میں بدعنوانی اور ظلم و ستم کا ایسا بازار گرم کیا کہ اس کے سی آئی اے کے آقا بھی ششدر رہ گئے۔ ملک کی وسیع ترین معدنی دولت کے باوجود زائرے کے عوام غربت کے انتہائی نچلے درجے پر زندگی بسر کرتے رہے اور موبوتو ارب پتی بن گیا۔ 1977-78ء کے دوران دونوں سالوں میں کارٹر انتظامیہ نے زائرے کو بے تحاشہ فوجی امداد دی جس میں ہر قسم کے اسلحہ کے ساتھ ساتھ فوجی دستے بھی شامل ہے تاکہ

موبوتو کے خلاف سر اٹھانے والے باغیوں کو ختم کر کے اس کے اقتدار کو زیادہ سے زیادہ عرصہ تک قائم رکھا جاسکے۔ بعد ازاں صدر جارج بش نے بھی اس حوالے سے تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ ”افریقہ میں موبوتو ہمارا بہترین دوست ہے۔“

فرانس / الجیریا 1960ء

فرانسیسی صدر چارلس ڈیگال کی طرف سے الجیریا کو آزادی دینے کے ارادہ کو دیکھتے ہوئے سی آئی اے نے الجیریا میں فرانسیسی فوجی انقلاب کی حمایت کی تاکہ اس ملک کو آزاد ہونے سے روکا جاسکے۔ امریکہ کو یہ خطرہ تھا کہ آزاد الجیریا میں ”اشتراکی“ حکومت قائم ہو جائے گی۔ امریکہ کو قوی امید تھی کہ اس کا رد عمل ڈیگال کو بری طرح سے متزلزل کر دے گا جو کہ نیٹو کے امریکی برتری کے منصوبوں کے راستے میں بہت بڑی رکاوٹ بنا ہوا تھا۔ کچھ سالوں بعد بعض شہادتوں کے ذریعہ انکشاف ہوا کہ سی آئی اے نے فرانسیسی صدر کے خفیہ قتل کا منصوبہ تیار کر لیا تھا مگر اسے عملی جامہ نہیں پہنایا جاسکا۔

برازیل 1961-64ء

صدر جواؤ گولارٹ سے جو ”جرائم“ سرزد ہوئے وہ یہ تھے کہ اس نے خارجہ پالیسی کے حوالے سے خود مختار رویہ اختیار کیا، سوشلسٹ ممالک کے ساتھ از سر نو تعلقات استوار کئے اور کیوبا کے خلاف پابندیوں کی مخالفت کی۔ اس کی حکومت نے ایک قانون منظور کیا جس کے ذریعہ ملٹی نیشنل کمپنیوں کے ملک سے باہر بھیجے جانے والے سرمائے کو محدود کر دیا گیا، آئی ٹی کی صنعت کو قومیا لیا گیا اور اس کے ساتھ ساتھ اس نے اقتصادی اور سماجی اصلاحات کا وعدہ بھی کیا۔ انارنی جنرل رابرٹ کینڈی کو یہ پریشانی لاحق ہو گئی تھی گولارٹ نے ”اشتراکیوں“ کو سرکاری محکموں میں اہم عہدے دینے کی اجازت دے دی تھی۔ حالانکہ گولارٹ انتہا پسند نہیں تھا وہ ایک کروڑ پتی جاگیردار اور کیٹھولک تھا جس کے گلے میں شرافت کا تمغہ پڑا ہوا تھا مگر یہ سب اسے بچانے کے لیے کافی نہیں تھا۔ اس کے ”گناہ“ ہی بہت تھے یہی وجہ ہے کہ 1964ء میں ایک فوجی انقلاب کے ذریعہ اس کی حکومت کا تختہ الٹ دیا گیا۔ ظاہر ہے کہ اس فوجی انقلاب کو امریکی حمایت و سرپرستی حاصل تھی اس کا اندازہ اس سرکاری بیان سے لگا لیجئے جو واشنگٹن سے جاری ہوا کہ ”ہاں..... بد قسمتی سے برازیل میں جمہوریت کا خاتمہ ہو گیا ہے مگر

اب بھی..... ملک کو اشتراکیت سے بچالیا گیا ہے۔“

اگلے پندرہ سالوں کے دوران فوجی آمریت کے ایسے ایسے مظاہرے کیے گئے تھے تا انصافیوں اور جبر و تشدد کے ایسے ایسے طریقہ لاطینی امریکہ کے علم میں آئے کہ جس کا پہلے ذکر بھی نہیں سنا تھا۔ کانگریس کو ختم کر دیا گیا، سیاسی مخالفت کا تصور بھی مٹا دیا گیا، ”سیاسی جرائم“ کے حوالے سے ملزم کے عدالت میں حاضر ہونے کے حکمنامہ کا وجود ختم کر دیا گیا، صدر پر تنقید کو قانونی طور پر ممنوع قرار دے دیا گیا، مزدور تنظیموں پر حکومتی مداخلت کا روں کا قبضہ ہو گیا، احتجاجی مظاہروں اور ہجوم پر پولیس اور فوج کی فائرنگ معمول کا حصہ بن گئی، گھربلا وچہ نذر آتش کیے جانے لگے، پادریوں سے توہین آمیز سلوک معمول کی بات بن گئی..... اغواء، قتل و غارتگری اور تشدد کا راج ہو گیا۔ حکومت نے اپنے اس پروگرام کا نام برازیل کا ”اخلاقی احیاء“ رکھا۔

امریکہ اس ساری صورتحال سے نہایت خوش تھا۔ برازیل نے کیوبا کے ساتھ تعلقات ختم کر دیئے تھے۔ اور لاطینی امریکہ میں ریاستہائے متحدہ امریکہ کا انتہائی قابل اعتماد حلیف بن گیا تھا۔

پیرو 1965ء

امریکی فوج نے پیرو کے جنگل میں ایک ”جھوٹا فورٹ بریگ“ قائم کیا جس کا مقصد ان گوریلا گروپوں کا صفایا کرنا تھا جو پیرو کے عوام میں انتہا کو پہنچی ہوئی غربت کے رد عمل میں پیدا ہوئے تھے۔

جمہوریہ ڈومینیکن 1963-65ء

فروری 1963ء میں جوآن بوش نے جمہوریہ ڈومینیکن کے 1924ء کے بعد پہلے جمہوری طور پر منتخب صدر کی حیثیت سے اقتدار سنبھالا۔ جان ایف کینڈی کے اس اشتراکیت مخالف آزاد خیال صدر کے حکومت سنبھالنے سے اس الزام کی تردید ہو گئی کہ امریکہ صرف فوجی آمریت کی حمایت کرتا ہے۔ بوش کی حکومت کو ”جمہوریت کے شوکیس“ کی حیثیت سے پیش کیا گیا جو فیدل کاسٹرو کو بالکل ہی دفن کر دے گی۔ اقتدار سنبھالنے سے قبل امریکہ کی طرف سے اسے ہر حوالے سے مکمل ہدایات مل چکی تھیں۔

امریکی دباؤ میں ہونے کے باوجود بوش اپنے نظریات کے حوالے سے بالکل واضح تھا۔ اس نے اراضی کی اصلاحات کیں، کم کرائے کے گھر فراہم کئے، تجارت کو مناسب انداز میں قومیا گیا اور بیرونی سرمایہ کاری کے حوالے سے خیال رکھا گیا کہ یہ ملک کے لیے استحصال کا باعث نہ بنے اس قسم کی پالیسیاں اسے تیسری دنیا کا وہ رہنما بنا رہی تھیں جو کہ سماجی تبدیلی کے حوالے سے نہایت سنجیدگی سے جدوجہد میں مصروف تھا۔ وہ شہری آزادی کے لیے بھی نہایت سنجیدہ تھا۔ اشتراکی یا وہ جن پر اشتراکیت کا ٹھپہ لگا ہوا تھا۔ ان کے بارے میں واضح کر دیا گیا تھا کہ انہیں اس وقت تک قانون کی گرفت میں نہ لیا جائے جب تک وہ واقعتاً قانون کی خلاف ورزی کرتے ہوئے نہ پائے جائیں۔

بوش کے منصوبوں اور امریکہ کی مرضی کے بغیر کئے جانے والے اقدامات اور اس حد تک خود مختار انداز حکومت نے امریکی افران اور کانگریسوں کی بڑی تعداد کو غم و غصہ میں مبتلا کر دیا۔ اراضی کی اصلاحات اور قومیاں کا عمل امریکہ کے لیے ہمیشہ سے ہی نہایت حساس معاملہ رہا ہے گویا سوشلزم کے پھیلنے کی ابتداء ہو رہی تھی پس امریکی اخبارات میں بوش کے نام کے گرد سرخ حاشیہ لگا دیا گیا۔

ستمبر میں فوجی انقلاب کے ذریعہ بوش کا تختہ الٹ دیا گیا۔ امریکہ جولا طینی امریکہ میں فوجی انقلاب کے خلاف شدید رد عمل کا اظہار کرتے ہوئے اس کی حوصلہ شکنی کر سکتا تھا بالکل خاموش تماشا ئی بنا رہا اور اس نے کچھ نہیں کیا۔ (اس حوالے سے تازہ ترین مثال ایکواڈور کی ہے جہاں جنوری 2000ء میں فوجی انقلاب اعلیٰ امریکی افران کی جانب سے چند ٹیلی فون کا لڑ آنے کے بعد فوری طور پر منسوخ کر دیا گیا)

انیس ماہ بعد اپریل 1965ء میں بہت بڑے پیمانے پر عوامی سطح پر بغاوت شروع ہو گئی جس کا مقصد جلا وطن بوش کو دوبارہ مسند اقتدار پر فائز کرنا تھا۔ امریکہ نے اس بغاوت کو کچلنے میں حکومت کی مدد کے لیے 23,000 فوجی دستے روانہ کئے۔

کیوبا 1959ء تا حال

1959ء سے سی آئی اے کا نصب العین فیدل کاسٹرو کا تختہ الٹنا ہے۔

1959ء کے آغاز میں فیدل کاسٹرو نے اقتدار سنبھالا تھا اور اسی سال 10 مارچ کو

امریکی قومی سلامتی کونسل کا اجلاس منعقد ہوا جس کا مقصد کیوبا میں نئی حکومت کے قیام کے امکانات پر بحث کرنا تھا۔ اس کے بعد گزشتہ 40 برسوں سے مسلسل کیوبا ”ناقابل معافی“ انقلاب“ کی پاداش میں دہشت گرد کارروائیاں پر تشدد حملے، بمباری، شدید فوجی جارحیت، پابندیاں، رکاوٹیں، بندشیں اور خفیہ قتل جیسے عذاب جمیل رہا ہے کیونکہ امریکہ کو مستقل طور پر یہ خطرہ لاحق ہے کہ کہیں یہ انقلاب لاطینی امریکہ میں ”مثالی نمونہ“ بن کر اپنے پیروکار نہ پیدا کرنے شروع کر دے۔

اس کا سب سے افسوسناک پہلو یہ ہے کہ دنیا کو کبھی بھی یہ معلوم نہیں ہو سکے گا کہ اگر کیوبا کو مستقل طور پر توپوں کے دہانے پر اور جارحیت کے خطرے سے دوچار نہ رکھا جاتا، اگر اسے امن و امان سے رہنے دیا جاتا، اگر یہاں سکون سے حکومتی امور انجام دینے کا موقع دیا جاتا اور اگر اسے اس کے راستے پر چلنے دیا جاتا تو کس قسم کا معاشرہ وجود میں آتا۔ یہاں اعلیٰ تصورات، دوراندیشی، قابلیت، صلاحیت، لیاقت اور بین الاقوامیت سب ہی کچھ تو تھا مگر ہمیں اس جوہر کا کبھی پتہ نہیں چل سکے گا اور یقیناً یہی امریکی منصوبہ تھا۔

ناقدین کے مطابق کیوبا کی حکومت ہر مسئلہ اور ہر بحران کو سی آئی اے کی پیداوار قرار دیتی ہے جبکہ حقیقت میں کیوبا کے نصف مسائل کے پیچھے سی آئی اے کا ہاتھ ہے مگر وہ کوئی نصف مسائل ہیں یہ کیوبا کی حکومت بھی نہیں بتا سکتی۔

انڈونیشیا 1965ء

سب کچھ درہم برہم کر دینے والے واقعات کا ایک ایسا سلسلہ شروع کیا گیا کہ واقعی ہر چیز برباد ہو گئی۔ ایک انقلاب لایا گیا جسے روکنے کے لئے ایک اور انقلاب آیا اور اس مزاحمتی انقلاب کے خاتمے کے لیے ایک اور انقلاب اور یہ سب کچھ امریکہ کے اشاروں پر ہوا تھا جس کے نتیجے میں سوئیکارنو کو اقتدار سے علیحدہ کر کے اس کی جگہ جنرل سہارتو اور انڈونیشیا کی افواج کو اقتدار سونپ دیا گیا جن کے امریکی فوج کے ساتھ نہایت قریبی روابط تھے۔ اس انقلاب کے ساتھ ہی اشتراکیوں، ان کے ہمدردوں، مشکوک اشتراکیوں اور ان مشکوک اشتراکیوں کے ہمدردوں کا قتل عام شروع ہو گیا۔ جسے ”نیویارک ٹائمز“ نے ”جدید سیاسی تاریخ کا سفاک ترین قتل عام“ قرار دیا۔ چند سالوں کے دوران ہونے والی ان ہلاکتوں کے

اندازے 50 ہزار سے شروع ہوئے اور دس لاکھ سے اوپر تک پہنچ گئے تھے۔
 کچھ عرصہ بعد یہ انکشاف ہوا کہ امریکی سفارتخانہ نے 5000 اشتراکیوں مشتمل
 ایک فہرست تیار کی تھی جس میں اعلیٰ طبقہ سے لے کر غریب دیہاتیوں تک کے نام شامل تھے۔
 یہ فہرست فوج کے حوالے کر دی گئی جس نے انہیں چن چن کر ہلاک کیا۔ پھر ان لوگوں کے نام
 جو یا تو ہلاک کر دیئے گئے یا پھر پکڑے گئے تھے امریکیوں نے اس فہرست سے خارج کر
 دیئے۔ ایک امریکی سفارتکار کے مطابق ”اس سے فوج کو بہت مدد ملی۔ بے شک انہوں نے
 بے شمار لوگوں کو ہلاک کیا اور بے شک ان کا لہو میرے ہاتھوں پر بھی ہے مگر اس میں کوئی برائی
 نہیں ہے کیونکہ ایک ایسا وقت ضرور آتا ہے جب آپ کو کسی نتیجہ تک پہنچنے کے لیے سختی کرنا
 پڑتی ہے۔“

گھانا 1966ء

کواے نمروما کی بد قسمتی کا آغاز اس وقت ہو گیا تھا جب اس نے اپنے ملک کا
 مغرب پر انحصار کم کرنے کے لیے ”سوویت یونین“ چین اور مشرقی جرمنی کے ساتھ اقتصادی
 اور فوجی روابط مستحکم کرنے شروع کئے۔ سی آئی اے کے حمایت یافتہ فوجی انقلاب کے ذریعہ
 اسی افریقی رہنما کو جلاوطن کر دیا گیا جہاں سے وہ کبھی واپس نہیں آ سکا۔ 1977ء میں منظر عام
 پر آنے والی سی آئی اے کی ایک دستاویز کے ذریعہ انکشاف ہوا کہ سی آئی اے کا فوجی منصوبہ
 سازوں سے قریبی رابطہ تھا اور نمروما کو اقتدار سے علیحدہ کرنے کے فوجی منصوبہ کی پل پل کی
 کارروائی سے امریکہ کو مکمل طور پر باخبر رکھا جا رہا تھا۔ یہ آخری رپورٹ فوجی انقلاب سے محض
 ایک دن پہلے تیار کی گئی تھی۔ اس میں اس بات کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا گیا کہ سی آئی اے
 نے کبھی نمروما کو ان میں سے کسی بھی منصوبے کی اطلاع دی تھی۔

یوراگوئے 1969-72ء

60ء کی دہائی ٹوپا ماروز کی تھی۔ بے حد ہوشیار وسیع تعلقات کے حامل انتہائی
 مہذب اور عدم تشدد کے حامی راہن ہڈ جیسے شہری گوریلے دنیا نے پہلی بار دیکھے تھے۔ وہ اتنے
 اچھے تھے کہ ان کی ہر بات گوارہ تھی۔ پھر یہ ہوا کہ امریکی ماہرین کی ایک جماعت یہاں آئی
 اور اس نے پولیس کو ہر طرح کے ہتھیار، گاڑیوں اور اطلاعات فراہم کرنے والے آلات سے

لیس کر دیا۔ وہ انہیں خفیہ قتل دھماکہ خیزی، دہشت گردی، تشدد پوچھ کے جاہلانہ طریقوں کی تربیت دینے اور یہاں خفیہ ایجنسی ڈیڑھ سکوڑ قائم کرنے کے لیے آئے تھے۔ یہ سب تیاریاں ٹوپاماروز اور ان کے ہمدردوں کے خلاف جنگ کی منصوبہ بندی کا حصہ تھیں اور پھر ٹوپاماروز کا نام و نشان مٹ گیا۔

1998ء میں یوراگوئے کی بحریہ کے ریٹائرڈ ریئر ایڈمرل اور خفیہ ایجنسی کے سابق سربراہ ایلاڈ پولمول نے یوراگوئے کے کمیشن چیئرمین آف ڈیپٹی کے سامنے تصدیق کرتے ہوئے کہا کہ ”یوراگوئے کی ”ناپاک جنگ“ کے دوران اسیر ٹوپاماروز کے بارے میں امریکہ احکامات جاری کرتا تھا ان کے بارے میں امریکہ نے سختی سے ہدایت کر رکھی تھی کہ ان گرفتار شدہ گوریلوں سے معلومات حاصل کرنے کے بعد انہیں فوری طور پر ہلاک کر دیا جائے۔“

جلی 1964-73ء

امریکہ کی متعدد شخصیات کی نظر میں سالویئر ریلیف راجنہائی قابل نفرت شخص تھا۔ اس سے زیادہ نفرت انگیز بات اور کیا ہوگی کہ ایک مارکسٹ مقتدر اعلیٰ بن گیا تھا۔ ایک منتخب مارکسٹ کے پاس اقتدار آ گیا تھا جو نہ صرف یہ کہ آئین کی تعظیم بھی کرتا تھا اور جس کی عوامی مقبولیت میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا۔ اس نے اس سنگ بنیاد کو ہلا کر رکھ دیا جس پر اشتراکی مخالفت کی عمارت تعمیر کی گئی تھی۔ عرصہ دراز کی سازشوں، منصوبہ بندیوں اور ہر قسم کے جھکنڈوں کے ذریعہ اس نظریہ پر یقین دلایا گیا تھا کہ ”اشتراکی“ صرف دغا بازی اور طاقت کے ذریعہ ہی اقتدار حاصل کر سکتے ہیں اور دہشت گردی اور عوام کے ذہنوں کو مفلوج کر کے ہی اس اقتدار کو قائم رکھ سکتے ہیں۔ یہ نظریہ پختہ چور ہوتا نظر آ رہا تھا۔

ایلیٹ کی انتخابی جدوجہد کو ناکامی سے دوچار کرنے کے لیے 1964ء میں بہت بڑے پیمانے پر گزب پھیلائی گئی مگر اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود 1970ء میں سی آئی اے کو بری طرح سے ناکامی کا سامنا پڑا۔ اس کے بعد اگلے تین سال تک سی آئی اے اور امریکی محکمہ خارجہ نے ایلیٹ کے حکومت کو ناکامی سے دوچار کرنے کے لیے کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ رکھا۔ انہوں نے خاص طور پر اقتصادیات کی تباہی اور فوجی عداوت کی جانب اپنی توجہ مرکوز رکھی بلا آخر ستمبر 1973ء میں جنرل ہوشے کی سربراہی میں فوج نے حکومت کا تختہ الٹ دیا۔ اس

فوجی کارروائی کے دوران ایلینڈے جاں بحق ہو گیا۔

اس کے بعد ایک ہفتہ کے لیے اس ملک کے رابطے دنیا بھر سے ختم کر دیے گئے۔ اس انقلاب نے دنیا کی تاریخ میں جبر و تشدد کا ایسا باب رقم کیا کہ جو آج بھی روکتے کھڑے کر دینے کو کافی ہے۔ گلی گلی ٹینگوں کا گشت شروع ہو گیا، فوجیوں نے گھروں میں گھس کر تشدد کیا، سٹیڈیم پھانسی گھاٹ بن گئے۔ مردہ جسم گلیوں میں گھٹنے سڑنے کے لیے چھوڑ دیے گئے یا دریاؤں میں بہا دیے گئے، تشدد خانوں کا کاروبار عروج پر پہنچ گیا، قیدی عورتوں پر جنسی تشدد کے لیے تربیت یافتہ کتے چھوڑ دیے گئے، محض الاخلاق کتابیں سرعام فروخت ہونے لگیں، عورتوں کے پاجامے پھاڑ کر سپاہی آوازے کتے کہ ”آہ! چلی میں عورتیں کپڑے پہنتی ہیں۔“ غریب اپنی فطری حالت میں واپس آ گئے اور دنیا کے لوگوں نے امریکہ اور بین الاقوامی مالیاتی مراکز میں اپنی چیک بکس کھول لیں۔ آخر میں ایک اندازہ کے مطابق تین ہزار سے زائد بے گناہ موت کے گھاٹ اتار دیے گئے، ہزاروں افراد غائب کر دیے گئے اور ہزاروں سچیں قسم کے تشدد کا شکار ہوئے۔

ایف بی آئی نے امریکہ میں چلی کے بائیں بازو سے تعلق رکھنے والوں کو پکڑنے کے سلسلہ میں نئی حکومت کی ہر طرح سے مدد کی جبکہ سیکرٹری خارجہ ہنری کسنجر نے پنوشے کو یقین دہانی کرائی کہ ”جیسا کہ آپ کے علم میں ہے کہ یہاں جو کچھ آپ کر رہے ہیں اس سلسلہ میں ہماری تمام تر ہمدردیاں آپ کے ساتھ ہیں..... ہم آپ کی حکومت کی کامیابی کے لیے دعا گو ہیں۔“

یونان 1967-74ء

ملک میں عام انتخابات کی مہم شروع ہونے سے صرف دو دن قبل اپریل 1967ء میں فوجی انقلاب آ گیا۔ ان انتخابات کے ممکنہ نتائج کے حوالے سے مشہور آزاد خیال رہنما جارج پائاندریو کی بطور وزیر اعظم واپسی کی پیشگوئیاں کی جارہی تھیں۔ یہ انقلاب رائل کورٹ، یونانی فوج، سی آئی اے اور یونان میں موجود امریکی فوج کی مشترکہ کاوش تھا۔ انقلاب کے فوری بعد روایتی مارشل لاء نافذ کر دیا گیا اور سنسرشپ، گرفتاریوں، تشدد اور ہلاکتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ پہلے ماہ کے دوران 8,000 متاثرین کا اندازہ لگایا گیا۔ انقلاب کے ساتھ ہی

روایتی اعلامیہ جاری کر دیا گیا کہ یہ کارروائی قوم کو اشتراکی قبضہ سے بچانے کے لئے کی گئی ہے۔ امریکہ کے فراہم کردہ آلات اور سکھائے گئے طریقوں کی مدد سے تشدد کی سنگین کارروائیاں معمول کا حصہ بن گئیں۔

جارج پایاندریو کسی پہلو سے بھی انتہا پسند نہیں تھا۔ وہ آزاد خیال اشتراکیت مخالفوں میں شمار ہوتا تھا۔ مگر اس کا بیٹا ایندریس جو کہ ولی عہد تھا۔ یونان کو سرد جنگ سے نکال لینے کا شدید خواہشمند تھا اور اس نے اپنی اس خواہش کو محض رکھنے کی کبھی کوشش نہیں کی تھی۔ اس نے امریکہ کا آلہ کار بن کر نیٹو میں شامل رہنے پر بھی شدید تکتہ چینی کی تھی۔

انقلاب کے وقت ایندریس پایاندریو کو گرفتار کر کے آٹھ ماہ تک قید رکھا گیا۔ رہائی کے فوراً بعد وہ اپنی اہلیہ مارگریٹ کے ہمراہ امریکی سفیر فلیس ٹالیوٹ سے ملاقات کے لیے متعین کیا گیا۔ اس حوالے سے پایاندریو کا کہنا ہے کہ ”میں نے ٹالیوٹ سے پوچھا کہ کیا یونان میں جمہوریت کو قتل ہونے سے بچانے کے لیے انقلاب کیرات امریکہ کچھ کر سکتا تھا؟ اس نے صاف انکار کرتے ہوئے کہا کہ امریکہ اس سلسلہ میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اس پر مارگریٹ نے جھجکا ہوا سوال کیا کہ اگر یہ انقلاب اشتراکیوں یا بائیں بازو کا لایا ہوا ہوتا تو اس صورت میں کیا ہوتا؟ ٹالیوٹ نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے فوراً کہا جب یقیناً ہم مداخلت کرتے اور انقلاب کو ناکامی سے دوچار کر دیتے۔“

جنوبی افریقہ 60ء سے 80ء کی دہائی

سی آئی اے نے جنوبی افریقہ کی خفیہ ایجنسی کے ساتھ قریبی روابط قائم کیے جن کا مقصد آزادی کی جدوجہد میں مصروف عوامی تنظیم افریقین نیشنل کانگریس پر نظر رکھنا اور اس کی کارروائیوں کے بارے میں تمام تر معلومات اکٹھی کرنا تھا حالانکہ اس تنظیم پر پابندی عائد کر کے دیس نکالا دیا جا چکا تھا۔ خفیہ ایجنسی نے سی آئی اے کے ساتھ بھرپور تعاون کرتے ہوئے تنظیم کے سرگرم ارکان کی نشاندہی کی، ان کے ممکنہ حملوں سے خبردار کیا اور ہمسایہ ممالک میں مقیم افریقین نیشنل کانگریس کے اراکین کے بارے میں معلومات فراہم کیں جس کی روشنی میں 1981ء میں جنوبی افریقہ نے ان افراد کے خفیہ قتل کے لیے جن کی نشاندہی کی گئی تھی ماہر قاتلوں کی ایک ٹیم موزمبیق روانہ کی تھی۔

افریقن نیشنل کانگریس کے رہنما نیلن منڈیلا کی گرفتاری بھی سی آئی اے کی کارروائی تھی۔ مزید برآں 70ء سے 80ء کی دہائی کے دوران امریکہ اقوام متحدہ میں جنوبی افریقہ کی حمایت کرتا رہا۔ اور سی آئی اے خفیہ طور پر اس ملک کو ہتھیار فراہم کرتے ہوئے جنوبی افریقہ کے خلاف اقوام متحدہ کی جانب سے عائد کردہ ہتھیاروں پر پابندی کی خلاف ورزی کرتی رہی (اس سلسلہ میں امریکہ اس کا علی الاعلان حمایتی تھا) اس کے ساتھ ساتھ جنوبی افریقہ کی فوج کو سیاسی شکل و صورت دینے کی کوششوں کی حمایت بھی جاری تھی۔

بولیویا 1964-75ء

1952ء میں ایک مسلح عوامی انقلاب نے فوج کو شکست دے کر اسے مختصر کرتے ہوئے۔ کمزور مضبوط اور بدنام فورس میں تبدیل کر دیا۔ مگر امریکہ کو یہ بات پسند نہیں آئی پھر امریکی رہنمائی اور مدد سے آہستہ آہستہ مسلح افواج نے قوت حاصل کرنا شروع کر دی بلاآخر 1964ء تک سی آئی اے اور پیٹھاگوں کی مدد سے یہ فوج اس قابل ہو گئی تھی کہ اس نے صدر وکنز پیز کا تختہ الٹ دیا۔ یہ شخص امریکہ کے لیے نہایت قابل نفرت تھا کیونکہ اس نے امریکہ کی کیوبا مخالف پالیسیوں کو ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ اس کے بعد بولیویا پر حکومت کرنے والوں کے لیے امریکی ہدایات کا سلسلہ جاری رہا۔

1967ء میں سی آئی اے نے کیوبا کے جلاوطن اپنے ایجنٹوں کے ذریعہ چچی گوڈیرا کو گرفتار کر کے فوری طور پر دوسری دنیا روانہ کر دیا۔

آسٹریلیا 1972-75ء

سی آئی اے نے لیبر پارٹی کی مخالف جماعتوں کو لاکھوں ڈالر فراہم کئے مگر انتخابات میں لیبر پارٹی کی کامیابی کا راستہ روکنے میں ناکام رہی۔ 1972ء میں برسر اقتدار آنے کے فوری بعد ہی اس نے امریکہ کو پہلی تکلیف اس وقت پہنچائی جب اس نے نہ صرف یہ کہ ویتنام سے آسٹریلیوی فوجیوں کو واپس بلا لیا بلکہ جنگ کے خلاف دیگر اقدامات کرنے کے ساتھ ساتھ ہنوئی پر امریکی بمباری کی بھی شدید مذمت کی۔ اس حکومت نے قومی سلامتی کے نام پر ہونے والی خفیہ کارروائیوں کے حوالے سے بھی جو کہ سی آئی اے کو نہایت عزیز تھیں روایتی جوش و خروش کا مظاہرہ نہیں کیا۔ نو منتخب وزیراعظم ایڈورڈ گاؤف وائٹلیم ان اقدامات کے

ذریعہ آہستہ آہستہ مگر یقینی طور پر اپنی قسمت پر مہر لگا رہا تھا۔ بلاخر امریکہ، برطانیہ اور آسٹریلیوی حزب اختلاف نے مخصوص قانونی سازشوں کے ذریعہ کورنر جزل جان کیئر کو قابو کر لیا جس کے سی آئی اے کے ساتھ نہایت دیرینہ تعلقات تھے اور پھر اس نے 1975ء میں داکٹلم کو ”قانونی“ طور پر وزارت عظمیٰ سے برخاست کر دیا۔

عراق 1972-75ء

اپنے نہایت ہی اہم حلیف شاہ ایران کی مدد کرتے ہوئے صدر نکسن اور قومی سلامتی کے مشیر ہنری کسپر نے عراق میں اپنی خود مختاری کی جنگ لڑنے والے کردوں کو بے پناہ فوجی امداد دی۔ 16 ملین ڈالر کی اس امداد کے اصل مقصد سے کد بھی واقف نہیں تھے۔ یہ امداد خود مختاری کی جنگ میں انہیں فتح دلانے کے لیے نہیں تھی بلکہ عراقی وسائل کو تباہ و برباد کرنے اور ایران کی جانب سے عراق کی توجہ ہٹانے کے لیے تھی۔

1974ء کی سی آئی اے کی ایک یادداشت کے مطابق یہ زچ کر دیے والی صورتحال ہماری طرح ایران کے بھی مفاد میں ہے جس میں کردوں کی جانب سے نیم خود مختاری سے انکار اور لڑائی جاری رہنے کی صورت میں یہ عراق کزور سے کزور تر ہو رہا ہے۔ اس مسئلہ کا کسی صورت بھی حل نہ تو ایران کے مفاد میں ہے نہ ہم اس کے خواہشمند ہیں۔“

بعد ازاں کانگریس کی پانیک کمیٹی نے سی آئی اے کے خلاف تحقیقات کرتے ہوئے تبصرہ کیا کہ ”یہ پالیسی کردوں کے حق میں ہرگز نہیں تھی جنہیں لڑائی جاری رکھنے کے لیے نہ صرف اکسایا گیا بلکہ ان کی مسلسل حوصلہ افزائی کی جاتی رہی یہاں تک کہ خفیہ کارروائی کے ضمن میں بھی اسے ہماری ایک نہایت ہی پیچیدہ مہم قرار دیا جاسکتا ہے۔“

1975ء میں تیل کی پالیسی نے ایران اور عراق کو حشد کیا تو ایران نے امریکہ کے ساتھ مل کر کردوں کو نہایت ہی خوفناک انجام سے دوچار کر دیا۔ نہایت ہی آڑے وقت میں جب کردوں نے کسپر سے مدد کی بجائے مانگی تو ان کی درخواست یکسر نظر انداز کر دی گئی۔ کرد قوتوں کا قلع قمع کر دیا گیا اور ان کے سینکڑوں رہنماؤں کو چھانسی دے دی گئی۔ بعد ازاں اس حوالے سے پانیک کمیٹی کے افغراض کے جواب میں ہنری کسپر نے کہا کہ ”خفیہ کارروائی کو نیکی کے کام کے ساتھ الجھانا نہیں چاہیے۔“

پر نکال 76-1974ء

1974ء میں ایک پرامن فوجی انقلاب کے ذریعہ امریکہ کی حمایت یافتہ 48 سالہ فاشٹ حکومت کا خاتمہ کر دیا گیا جو دنیا کی واحد نوآبادیاتی طاقت رہ گئی تھی۔ اس کے بعد ایک پروگرام جاری کیا گیا جس کے تحت اہم صنعتیں قومیاں، کارکنوں کی حدود مقرر کرنے، کم از کم اجرتوں کے تعین، اراضی کی اصلاحات اور دیگر ترقیاتی کاموں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ امریکہ اور ملٹی نیشنل کمپنیوں کے سربراہان کے لیے یہ پروگرام نہ صرف پریشان کن بلکہ شدید خطرہ کا باعث تھا۔ پس حکومت کو غیر مستحکم کرنے کے منصوبہ کا آغاز ہو گیا۔ خفیہ کارروائیاں، امریکی اخبارات کی جانب سے حملے، ٹریڈ یونینز میں انتشار، مخالف ذرائع ابلاغ کی امداد قرضوں اور تجارت کے ذریعہ اقتصادی تباہی و بربادی، انتخابات میں چند مخصوص امیدواروں کے لیے بھاری مالی امداد جیسے اقدامات کے ساتھ ساتھ امریکہ نے پر نکال کے لیے ان فوجی اور ایٹمی اطلاعات کا راستہ بند کر دیا جو کہ عام پریٹنڈ کے ارکان کو حاصل ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ نیٹو کی بحری اور فضائی مشقوں کی آڑ میں پر نکالی ساحل ہر قسم کی سرگرمی کے لیے بند کر دیئے جبکہ لڑبن کی بندرگاہ پر نیٹو کے 19 بحری بیڑے لنگر انداز کر دیئے گئے۔ پر نکالیوں کی اکثریت کے مطابق یہ تمام اقدامات حکومت کو ناکام کرنے کے لیے کئے جا رہے تھے اور بالآخر انہیں اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہوئی اور پر نکال کی انقلابی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ اس کے بعد ہی آئی اے کے مراعات یافتہ امیدوار کامیاب ہو گئے اور سالہا سال تک حکومت کرتے رہے۔

مشرقی تیمور 99-1975ء

1975ء میں جب مشرقی تیمور پر نکال کے نوآبادی قبضہ سے نکلنے کے مراحل سے گذر رہا تھا تو اس جزیرہ پر بے شمار سیاسی گروپ تشکیل پا چکے تھے۔ انہی میں سے ایک جماعت یوڈی ٹی نے اگست میں پر نکالی حکومت کے خلاف انقلاب برپا کر دیا۔ اس سلسلہ میں اسے انڈونیشیا کی حمایت حاصل تھی۔ مختصر پیمانہ پر خانہ جنگی شروع ہو گئی جس میں بائیں بازو کی ایک تحریک فریشلین سب پر حاوی رہی بالآخر ستمبر میں فریشلین مکمل طور پر غالب آ گئی اور نومبر میں پر نکال کے قبضے سے مشرقی تیمور کی آزادی کا اعلان کر دیا گیا۔ نو دن بعد انڈونیشیا نے مشرقی تیمور پر حملہ کر دیا۔ اس جارحیت کا ارتکاب امریکی صدر جیرالڈ فورڈ اور دیگر بڑی خارجہ

ہنری کسنجر کی انڈونیشیا سے واپسی کے ٹھیک اگلے روز کیا گیا تھا کیونکہ اپنے اس دورہ میں صدر امریکہ صدر سہار تو کو امریکی ہتھیاروں کے استعمال کی اجازت دے کر آئے تھے حالانکہ امریکی قانون کے مطابق امریکی ہتھیار کسی قسم کی جارحیت کے لیے استعمال نہیں ہو سکتے۔ جنوب مشرقی ایشیاء میں انڈونیشیا امریکہ کا سب سے قیمتی حلیف تھا اور کسی بھی حالت میں امریکہ کسی بائیں بازو کی حکومت کو برداشت نہیں کر سکتا۔ انڈونیشیا نے امریکی ہتھیاروں اور سفارتی حمایت کے ذریعہ جلد ہی مشرقی تیمور پر قبضہ کر لیا۔ بعد ازاں اقوام متحدہ میں امریکی سفیر ڈیٹھیل موینہان نے لکھا کہ ”امریکہ اپنی خواہش کے مطابق نتیجہ کا خواہاں ہوتا ہے اور اس کے حصول کے لیے بروقت اور جدوجہد اقدامات کرتا ہے۔ امریکی حکمہ خارجہ کے خیال میں اقوام متحدہ نے جو بھی اقدامات کئے ان میں سے کسی میں بھی اسے کامیابی نہیں ملی۔ پھر یہ کام میرے سپرد کیا گیا اور اس حوالے سے میں نے جو کچھ بھی کیا اسے سناٹے کا میابی کے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔“

ایمٹھی نٹیشیل کے اندازے کے مطابق 1989ء تک انڈونیشیا کے فوجی دستے چھ سات لاکھ کی آبادی میں سے دو لاکھ افراد کو ہلاک کر چکے تھے۔ انڈونیشیا کے مشرقی تیمور پر دعویٰ کی مستقل حمایت اور کشت و خون کے اس کھیل میں آخری وقت تک امداد کرنے کی وجہ سے امریکہ حقیقتاً دنیا میں تمہارہ گیا تھا لیکن اس کے باوجود انڈونیشیا کے لیے ہتھیاروں اور فوجی آلات کی فراہمی اور اس کام کی تکمیل کے لیے تربیت کا سلسلہ مسلسل جاری تھا۔ حالانکہ امریکہ اس امر کی مستقل تردید کرتا رہا مگر حقیقت یہ ہے کہ امریکی امداد اس وقت بھی جاری تھی جب 1999ء میں انڈونیشیا کے سپاہیوں اور ملیشیا کے جوانوں کے ہاتھوں آزادی کی جدوجہد میں مصروف تیموریوں کا قتل عام ہوا تھا۔

1995ء میں کنٹنن انظامیہ کے ایک سینئر افسر نے سہار تو کے بارے میں تبصرہ

کرتے ہوئے کہا تھا کہ ”وہ ہمارے مطلب کا آدمی ہے۔“

انگولا 1975ء سے 80ء کی دہائی

امریکہ، چین اور جنوبی افریقہ نے اپنے مطلب کے لیے خانہ جنگی کی حمایت کی تو سوویت یونین اور کیوبا نے اپنے مفادات کے پیش نظر اور پھر کئی دہائیوں تک کشت و خون کا یہ

کھیل جاری رکھا۔ انسانیت کو اس بے رحمی اور سفاکی سے خون میں نہلایا گیا کہ آج تک یہ خون رس رہا ہے۔ 5 لاکھ کے قریب انسان صفحہ ہستی سے مٹا دیئے گئے، غربت، افلاس اور بھوک انتہائی درجہ کو پہنچ گئی قدم قدم پر پچھلی بارودی سرنگوں کی وجہ سے معذوری کی شرح دنیا بھر میں سب سے زیادہ یہاں ہو گئی تھی۔ شروع کے سالوں میں ہنری کسنجر اس مسئلہ کے کسی بھی پر امن حل کے لیے راستے میں ذاتی طور پر رکاوٹ بنا رہا۔ یہ شخص سوویت یونین کے ہر اقدام کا مقابل کرنے اور اسے منہ توڑ جواب دینے کے جنون میں مبتلا رہتا تھا خواہ وہ کرہ ارض کے کسی بھی حصہ میں کئے جائیں خواہ خاص ہوں یا عام، حقیقی ہوں یا تصوراتی، قسمت کا کوئی کھیل ہوں یا شعوری کوشش یا اندازہ وہ جب تک جوابی اقدام نہ کر لیتا اسے جھن نہیں ملتا تھا۔ 90ء کی دہائی میں امریکہ نے اپنے مقلد یو این آئی ٹی اے (UNITA) کے سربراہ جونس سویمبی کو جنگ کو طول دینے سے باز رکھنے کی کوشش کی مگر انگولا کی عوام کے حق میں بہت زیادہ بہتر ہوتا اگر امریکہ 60ء کی دہائی میں شروع ہونے والی انگولا کی اس سیاست میں اب بھی مداخلت نہ کرتا۔ اس وقت تو چونکہ روس کو اس میں کوئی دلچسپی نہیں تھی اس لیے ہنری کسنجر کو بھی نہیں تھی۔

جمیہ کا 1976ء

وزیر اعظم مائیکل منیلے کو اس لیے امریکی عقاب کا سامنا کرنا پڑا کہ اس نے کیوبا سے سفارتی تعلقات استوار کر کے انگولا میں امریکہ مخالف دھڑے کی حمایت کی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ اس نے بین الاقوامی ایلیو میٹم کمپنیوں کے خلاف اقدامات شروع کر دیئے تھے۔ 1976ء کے انتخابات میں امریکہ نے ہر قسم کا جھکنڈہ اختیار کیا کہ کسی طرح سے منیلے دوبارہ منتخب نہ ہو سکے مگر امریکہ کو ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔

ہوٹل راس 80ء کی دہائی

80ء کی دہائی میں امریکہ نے ہوٹل راس کو اپنی نو آبادی بنالیا تھا جہاں قائم امریکی فوجی اڈوں پر ہزاروں فوجی دستے تعینات تھے جن کا مقصد اہل سیلوڈور اور گوسٹے مالا میں باغیوں کے خلاف جاری کارروائیوں میں بھرپور مدد فراہم کرنا اور سب سے بڑھ کر ٹکارا گوا کی حکومت کے خلاف کوئٹرا س کو ہتھیار مہیا کرنا، ہر طرح کی مدد دینا اور ضرورت پڑنے پر پناہ بھی فراہم کرنا تھا۔ اس قسم کی مستقل کارروائیوں کو کامیابی سے جاری رکھنے کے لیے کسی بھی طرح

مداخلت نہ کرنے والی اور بے حس عوام کی ضرورت ہوتی ہے۔ امریکہ نے ہونڈراس کی فوج اور پولیس کو مخالفین کا مجسہ بند کرنے کے لیے ہتھیاروں اور فوجی آلات سے لیس کرنے اور انہیں مکمل تربیت دینے کے علاوہ بے پناہ مالی امداد بھی دی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ امریکہ مخالف عناصر (جو طوریہ انداز میں اپنے ملک کو پولیس ایس ہونڈراس کہتے تھے) جو سیلوڈور کے باغیوں اور نکاراگوا کے سینڈیگاز کی قومی شخص کی مہم کے حامی تھے اور ہونڈراس میں سماجی تبدیلی لانے کے لیے کوشاں تھے ابھی تک ان کی جانب سے کسی گوریلہ تحریک کے شروع ہونے کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔ 1988ء میں نیویارک ٹائمز کے ایک تبصرہ کے مطابق ”امریکی سفارتکار کرہ ارض کے کسی بھی ملک کی نسبت ہونڈراس کی مقامی سیاست میں بہت زیادہ عمل دخل رکھتے ہیں اور اس حقیقت کو یہاں آفاقی طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے۔“

نکاراگوا 1978-90ء

1978ء میں جب سینڈیگاز نے سوموز آمریت کا تختہ الٹا تو امریکہ پر یہ واضح ہو گیا تھا کہ وہ اس کے لیے ایک اور کیوبا“ ثابت ہوں گے۔ سرپرستی ہوئی خطرہ کی ایک مستقل تلوار۔ اس انقلاب کو ناکام کرنے کی صدر کارٹر کی کوششوں نے سفارتی اور اقتصادی صورت اختیار کر لی۔ ریگن کے دور میں تشدد کو بہترین حل تصور کرتے ہوئے اپنایا گیا۔ خطرات سے بھرپور آٹھ سال کے طویل عرصہ تک نکاراگوا کے عوام سوموزا کے بدظہنت قومی محافظوں اور آمریت کے حامیوں پر مشتمل امریکہ کی منظم کردہ فوج کنٹر اس کے حلوں کی زد میں رہے۔ یہ ایک مکمل جنگ تھی جس کا مقصد حکومت کے سماجی و اقتصادی ترقی کے پروگرام کو تباہ کرنا تھا۔ اس سلسلہ میں سکول اور ہسپتال نذر آتش کئے گئے، عصمت دری، تشدد بارودی سرنگیں بچھانا، بمباری اور گولہ باری کونا ایسا تباہ کن اقدام تھا جو یہاں نہیں کیا گیا اور یہ سب کچھ وہ شریف انفس لوگ کر رہے تھے جنہیں رونالڈ ریگن بڑے پیار سے ”آزادی کی لڑائی لڑنے والے“ کہہ کر پکارتے تھے۔

1990ء میں امریکہ نے عام انتخابات میں نہایت سنجیدگی سے مداخلت کی جس کے نتیجہ میں سینڈیگاز کو شکست ہو گئی۔

بالکل کیوبا کی طرح ہم کبھی یہ بھی جان نہیں پائیں گے کہ اگر سینڈیگاز کو امن و

سکون سے رہنے دیا جاتا اور انہیں اپنا آدھا بجٹ جنگ میں نہ جھونکنا پڑتا تو ان کا تکفیل کردہ ترقی یافتہ معاشرہ کیسا ہوتا؟

بین الاقوامی ترقیاتی تنظیم ”آکس فیم“ نے 76 ترقی پذیر ممالک میں کام کرنے کے اپنے تجربے کے حوالے سے بتایا کہ ”سینڈ ہاؤز کے دور میں نکاراگوا کی ترقی کی رفتار غیر معمولی تھی اور اس کی وجہ یہ تھی کہ حکومت نہایت سنجیدگی اور دیانتداری سے عوام کی حالت بہتر بنانے اور ترقیاتی کاموں میں ان کی عملی شراکت کے لیے کوشاں تھی۔“

آزاد منڈی کی حکمرانی میں لوٹنے کے دس سال بعد نکاراگوا کرہ ارض کی غریب ترین اقوام میں شامل ہو چکا تھا اور اس کی نصف سے زیادہ آبادی شدید غذائی قلت اور ناخواندگی و جہالت کا شکار بن چکی تھی۔

فلپائن 70ء سے 90ء کی دہائی

فلپائن میں غربت، سماجی ناانصافی، قتل و غارت گری اور تشدد کی بڑھتی ہوئی کارروائیوں کے خلاف وسیع پیمانے پر احتجاجی تحریکیں اور مسلح مزاحمت شروع ہو گئی۔ اس موقع پر امریکی فوج اور سی آئی اے نے میدان عمل میں اترتے ہوئے ان تحریکوں کو کچلنے کے لیے حکومت کی ہر طرح کی امداد کی۔ 1987ء میں یہ انکشاف ہوا کہ ریگن انتظامیہ نے سرکشی کے خاتمے کی مہم میں سی آئی اے کی مداخلت بڑھانے کے لیے دو سالہ منصوبہ کے تحت 10 ملین ڈالر مختص کیے تھے۔ سی آئی اے نے وسیع پیمانے پر نفسیاتی جنگ شروع کر دی اور امریکی فوج کے مشیر بھی معمول کے مطابق فلپائن فوجی دستوں کے ہمراہ تمام کارروائیوں میں شریک ہوتے رہے۔ ایشیاء میں جنگی کارروائیوں کے لیے فلپائن ہمیشہ سے امریکی جنگی حکمت عملی کے حوالے سے جغرافیائی طور پر بہترین ملک رہا ہے جہاں امریکہ نے کئی بڑے بڑے فوجی اڈے قائم کر رکھے ہیں اور جن کے خلاف شہریوں کی جانب سے شدید احتجاجی مظاہرے ہوتے رہتے ہیں۔ 1991ء میں امریکی سفارتخانے کی جانب سے ذرائع ابلاغ کو بتایا گیا کہ ”سفارتخانہ کی رائے شماری کے مطابق امریکی فوجی اڈوں کی حمایت کرنے والے فلپائنی عوام کی تعداد کہیں 68 فیصد کہیں 72 فیصد اور کہیں 81 فیصد ہے۔“ تاہم یہ رائے شماری کبھی منظر عام پر نہیں آئی۔ بعد ازاں سفارتخانہ کے ایک افسر نے تسلیم کرتے ہوئے کہا کہ ”میں نے یہ تعداد بڑھا

دی تھی۔“

سیٹیلیٹس 1979-81ء

امریکہ کے لیے قابل نفرت رہنماؤں میں سے ایک فریک البرٹ رہنے بھی تھا۔ اس کے خلاف نفرت کی دیگر وجوہات کے ساتھ ساتھ یہ بھی تھیں کہ وہ سوشلسٹ تھا، غیر جانبدارانہ تحریک کا حامی تھا، بحر ہند کو نیوکلیر فری زون بنانے کا خواہشمند تھا اور یہ بات اس کے لیے نہایت تکلیف دہ تھی کہ اس کا ملک امریکی فضائیہ کے سیٹلائٹ ٹریکنگ سٹیشن کا ٹھکانہ بنا ہوا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ 1979ء سے وہ امریکی سازشوں اور اس کی حکومت کو غیر مستحکم کرنے والی کارروائیوں کی زد میں تھا۔ ایک رپورٹ کے مطابق نومبر 1981ء میں جو جزیرہ کی قوم پر جارحیت کا ارتکاب کیا گیا تھا وہ سی آئی اے کی ہدایات کے مطابق اس کے زرخیزوں نے کیا تھا جس کی منصوبہ بندی جنوبی افریقہ میں کی گئی تھی اور یہ سیٹیلیٹس ایئر پورٹ پر مسلح لڑائی سے آگے نہیں بڑھ سکا تھا۔

جنوبی یمن 1979-84ء

امریکہ نے شمالی یمن میں حکومت کا تختہ الٹنے کے لیے پیرامٹری قوتوں کی بھرپور حمایت کی جس کی وجہ ایک تو یمن کے ہمسایہ سعودی عرب کی خواہش کی تکمیل تھی اور دوسرے یہاں بھی سرد جنگ چھڑنا تھا کیونکہ شمالی یمن کو سوویت یونین کی حمایت حاصل تھی جبکہ اس کے مخالف جنوبی یمن کو مکمل طور پر مغرب کی پشت پناہی حاصل تھی۔ شمالی اور جنوبی یمن کے درمیان سالہا سال سے لڑائی جاری تھی۔ امریکہ نے شمالی یمن میں فوجی امداد اور تربیت یافتہ پیرامٹری دستے روانہ کئے تاکہ وہ شمالی یمن میں پلوں کو اڑانے کے ساتھ ساتھ انتشار اور تباہی و بربادی کی دیگر کارروائیاں کریں۔ مارچ 1982ء میں شمال والوں نے تیرہ افراد پر مشتمل ایک پیرامٹری ٹیم کو پکڑ لیا، تشدد کے نتیجہ میں انہوں نے پوری ایمانداری سے سچائی بیان کرتے ہوئے تسلیم کیا کہ وہ سی آئی اے کے تربیت یافتہ ہیں۔ ان میں سے بارہ کو چھانسی دے دی گئی۔ جلد ہی یہ آپریشن اختتام پذیر ہو گیا۔

ریکن کے دور میں سی آئی اے کے ڈائریکٹر ولیم کیسی کو جو کہ انتہا پسند سوویت مخالف تھا اس بات کا یقین تھا کہ کیوبا، اٹلی کی ریڈ بریگیڈ اور آئی آر اے کے ساتھ ساتھ جنوبی یمن

بھی سوویت یونین کے بین الاقوامی دہشت گردی نیٹ ورک کا حصہ ہے۔ جبکہ حقیقت یہ تھی کہ 1979ء سے سوویت یونین شمالی اور جنوبی یمن دونوں کو یکساں فوجی امداد اور مشاورت فراہم کر رہا تھا کبھی بیک وقت اور کبھی مختلف اوقات میں حسب ضرورت یہاں تک کہ اس نے بائیں بازو کی گوریلا تحریک کو کچلنے کے لیے شمالی یمن کو بھرپور امداد فراہم کی تھی۔ 1990ء میں شمالی اور جنوبی یمن متحد ہو کر ”جمہوریہ یمن“ کی صورت میں دنیا کے نقشہ پر ابھرے اور سرد جنگ ایک ہفت رنگی تماشا ثابت ہوئی۔

جنوبی کوریا 1980ء

مئی میں امریکہ نے جسے جنوبی کوریا کے فوجی معاملات میں مختار کل کی حیثیت حاصل تھی حکومت کی درخواست پر مشترکہ پولیس کورین کمان سے جنوبی کوریا کے کچھ فوجی دستے واپس بھجوا دیئے تاکہ وہ کوآکچو شہر میں سرانٹھانے والی طلباء و کارکنوں کی احتجاجی تحریک کو کچلنے میں مقتدر فوجی جن ڈوہوان کا ساتھ دیں۔ اس احتجاجی تحریک کا مقصد مارشل لاء کا خاتمہ تھا۔ یہ لوگ مارشل لاء کے مخالفین، ان کے خاندانوں اور دوستوں کی گرفتاریوں کے خلاف احتجاج کر رہے تھے اس کے ساتھ ساتھ دھوکہ دہی کی بنیاد پر ہونے والے انتخابات، تشدد اور سماجی ضروریات کی عدم دستیابی کے خلاف آواز اٹھا رہے تھے۔ اس کے خاتمے کے لیے شروع ہونے والی خوفناک کارروائی میں ہزاروں افراد ہلاک کر دیئے گئے سینکڑوں کو مسلح قوتوں نے سخت زیادتیوں اور تشدد کا نشانہ بنایا اور اس سلسلہ میں حکومت کو کارٹر انتظامیہ کی جانب سے جسے انسانی حقوق کا رکھوالا قرار دیا جاتا تھا بھرپور امریکی حمایت حاصل تھی۔ محکمہ خارجہ کے ایک ترجمان کے مطابق ”ابھی یا مری ہمارے صورتحال یہ ہے کہ معاہدہ کے تحت کوریا ہمارا حلیف ہے اور دنیا کے اس حصے میں امریکی سلامتی کے نہایت اہم مفادات وابستہ ہیں۔“

فروری 1981ء میں جن کو یہ اعزاز بخشا گیا کہ اسے صدر ریگن کے پہلے حکومتی مہمان کی حیثیت سے وائٹ ہاؤس میں مدعو کیا گیا، امریکہ اور جنوبی کوریا نے نئی انتظامیہ کے تحت پہلی مشترکہ فوجی مشقیں شروع کیں۔ انتظامیہ نے کانگریس کو جنوبی کوریا کے صدر کی امریکہ میں موجودگی تک بین الاقوامی انسانی حقوق کی سلاٹنڈر رپورٹ کی اشاعت مؤخر کرنے کو کہا تاکہ اسے کسی قسم کی شرمندگی یا پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے اور ریگن نے جن کے اعزاز

میں دیئے جانے والے عشائیہ میں اعلان کیا کہ ”آپ نے 5000 سالہ آزادی کی روایت کو قائم رکھنے کے لیے قابل قدر کارنامے سرانجام دیئے ہیں۔“

1996ء میں کوریا کی ایک عدالت نے جن کے خلاف غداری اور قتل و غارتگری کے جرائم ثابت ہو جانے پر اور کوآکچو کے قتل عام کے سلسلہ میں اسے ذمہ دار ٹھہراتے ہوئے اسے سزائے موت سنائی۔

جاڈ 1981-82ء

لیکن انتظامیہ لیبیا کے کرٹل معرقدانی کے حوالے سے جغرافیائی، قانونی اور اخلاقی ہر قسم کے خطرہ کے وہم میں بری طرح سے مبتلا تھی۔ لیبیا نے اپنے ہمسایہ ملک چاڈ کی حکومت کی درخواست پر وہاں اپنی مسلح افواج تعینات کر دیں کیونکہ ایک تو اس حکومت کو مسلح سرکشی کا سامنا تھا دوسرے وہ لیبیا کی اپنے بارڈر پر دوست حکومت کی خواہش کی تکمیل چاہتی تھی۔ امریکہ چاہتا تھا کہ کسی طرح اس حکومت کی جگہ لیبیا کی مخالف حکومت قائم کر دی جائے اس مقصد کے لیے اس نے لیبیا سے جلاوطن کیے جانے والے قذافی کے مخالفین جو چاڈ میں مقیم تھے بھرپور امداد فراہم کر کے کھلی آزادی دے دی کہ وہ سرحد پار سے لیبیا کے خلاف مستقل حملوں کا سلسلہ جاری رکھیں۔ اس کے ساتھ ساتھ امریکہ نے چاڈ کے سابقہ نوآبادیاتی حکمران فرانس کے ساتھ مل کر رشوت اور سیاسی دباؤ کے ذریعہ چاڈ کی حکومت کو مجبور کر دیا کہ وہ لیبیا کو واپس چلے جانے کو کہے۔ لیبیا نے کافی پس و پیش کے بعد اس پر عمل کیا اور پھر اس کی جگہ افریقی اتحاد کی تنظیم کی فوجیں تعینات کر دی گئیں جنہیں چاڈ کی سلامتی و دفاع کے حوالے سے نہایت معمولی اختیارات دیئے گئے تھے اور ان کی حقیقت کٹھ پتلی سے زیادہ نہیں تھی۔ سی آئی اے نے سوڈان میں مخالف چاڈ فوج کی تنظیم نو کی اور اسے ہتھیاروں سے لیس کر کے مالی امداد سیاسی حمایت اور تکنیکی تربیت فراہم کی۔ تب اس فوج نے حسین یا برے کی سربراہی میں افریقی اتحاد کی تنظیم کی فوج کی موجودگی میں جو محض نمائشی طور پر وہاں رکھی گئی تھی جون 1982ء میں چاڈ کی حکومت کا تختہ الٹ دیا۔ اس کے بعد امریکی حمایت یافتہ ہارے آٹھ سال تک اس ملک پر حکمرانی کرتا رہا۔ اس کی حکومت کے دوران اس کی خفیہ پولیس نے ہزاروں افراد ہلاک کئے، دولاکھ کے قریب افراد پر تشدد کیا گیا اور بے شمار غائب کر دیئے گئے۔

2000ء میں اس کے تشدد کا شکار ہونے والے سیدگال میں جہاں وہ مقیم تھا اسے ”افریقہ کا نیوشے“ قرار دیتے ہوئے نشانہ بنانے میں کامیاب ہو گئے۔

گریناڈا 1979-81ء

کوئی بھی ملک چاہے کتنا ہی ترقی پذیر، کمزور، چھوٹا اور دور افتادہ کیوں نہ ہو امریکہ کے لیے خطرہ بن سکتا ہے۔ 1979ء کے انقلاب کے ذریعہ مورلیس بشپ اور اس کے حامیوں نے ایک لاکھ دس ہزار کی آبادی پر مشتمل اس جزیرہ کا اقتدار سنبھالا گوکہ ان کی پالیسیاں کاسترو کی طرح انقلابی نہیں تھیں مگر امریکہ کو ”ایک اور کیوبا“ کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ یہ خطرہ اس وقت اور بڑھ گیا جب گریناڈا کے رہنما نے علاقے کے دیگر ممالک کے ساتھ نہایت جوش و خروش کے ساتھ خوشگوار تعلقات استوار کرنا شروع کیے۔

انقلاب کے فوری بعد ہی ریگن انتظامیہ نے بشپ حکومت کو غیر مستحکم کرنے کے ہتھکنڈے آزمانا شروع کر دیئے تھے۔ انواہوں اور سازشوں کے منہ ختم ہونے والے سلسلہ کا آغاز ہو گیا تھا۔ بالآخر اکتوبر 1983ء میں جارحیت کا ارتکاب کرتے ہوئے اقتدار ان لوگوں کے حوالے کر دیا گیا جو امریکی خارجہ پالیسی کے بہت بڑے مقلد اور محافظ تھے۔ اس کے نتیجے میں 135 امریکی مارے گئے یا زخمی ہو گئے جبکہ 400 گریناڈا کے اور 84 کیوبا کے باشندے ہلاک ہوئے۔

امریکہ نے بین الاقوامی قانون کی اس کھلی خلاف ورزی پر وضاحت پیش کرنے کے لیے اپنی جارحیت کو سفید جھوٹ کا سہارا لے کر چھپانے کی کوشش کی۔

سرینام 1982-84ء

امریکہ نے سرینام کی حکومت کا تختہ الٹنے کے لیے ایک سازش تیار کی کیونکہ امریکہ کے خیال میں یہ حکومت ”کیوبا کے مدار“ میں داخل ہو رہی تھی۔ منصوبہ کے مطابق 300 افراد پر مشتمل ایک ٹیم نے جارحیت کا ارتکاب کرنا تھا جن میں آدھے امریکی اور جنوبی امریکی اور آدھے سرینام سے تعلق رکھنے والے تھے۔ سی آئی اے نے اپنے اس منصوبہ کے حوالے سے کانگریس کو پہلے ہی آگاہ کر دیا تھا کہ اس میں پیرا ملٹری فورس استعمال کی جائے گی جس کی صدر ریگن نے اجازت دے دی تھی۔ کانگریس نے اس حوالے سے خاص جوش و خروش کا

مظاہرہ نہیں کیا پھر بھی ولیم کسی اور اس کے سی آئی اے کے جیلے اپنے منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے کے لیے مصروف رہے مگر اس وقت وہ اپنے قدم پیچھے ہٹانے پر مجبور ہو گئے جب نیدرلینڈ جو کہ سرینام کا سابقہ نوآبادیاتی حکمران تھا اور جس کے دور میں یہ دج گیانا کہلاتا تھا کہ اندرونی سلامتی کی ایجنسی نے یہ منصوبہ بے نقاب کر دیا۔

لیبیا 1981-89ء

ریگن انتظامیہ کی لیبیا کے صدر معمر قذافی کے خلاف نفرت اور دشمنی کی سرکاری وجہ یہ بتائی جاتی رہی کہ وہ دہشت گردی کی حمایت کرتا تھا۔ جبکہ حقیقت میں لیبیا کے صدر کا جرم یہ نہیں تھا کہ وہ دہشت گردوں کی حمایت کر رہا تھا بلکہ یہ تھا کہ وہ ”غلط“ دہشت گردوں کی حمایت کر رہا تھا وہ ان دہشت گردوں کی حمایت نہیں کر رہا تھا جنہیں ریگن انتظامیہ کی حمایت حاصل تھی جن میں ٹکارا گوا کے کنسراس، انگولا میں یو این آئی ٹی اے (UNITA) میامی میں مقیم کیوبا کے جلاوطن ایل سیلو اور گوسے مالا کی حکومتیں اور گریناڈا میں تعینات امریکی فوج وغیرہ شامل تھے۔ صرف دہشت گردوں کا ایک گروپ ایسا تھا جس کی یہ دونوں حمایت کر رہے تھے اور وہ تھے افغانستان کے مجاہدین۔

مشرق وسطیٰ کے تیل پیدا کرنے والے ممالک سے امریکہ کی گہری نفرت اور عداوت کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ وہ ان کے وسائل پر مکمل طور پر قبضہ کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ قذافی کے خلاف نفرت اس لیے زیادہ تھی کہ اس نے امریکہ کے پسندیدہ حکمران گروہ کا تختہ الٹ کر خلائی ریاست قائم کر دی تھی۔ تبھی امریکہ نے اسے اور اس کے ملک کو ان کی حیثیت یاد دلانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ 1981ء میں لیبیا کی فضائی حدود میں امریکی طیاروں نے لیبیا کے دو طیارے مار گرائے۔ پانچ سال بعد امریکہ نے قذافی کی ایک رہائشگاہ پر بمباری کی جس سے بے شمار لوگ مارے گئے۔ قذافی پر کئی قاتلانہ حملے کئے گئے، اس کی حکومت کا تختہ الٹنے کے لیے کئی کارروائیاں ہوئیں اقتصادی پابندیاں عائد کی گئیں بڑے پیمانے پر نہایت ہی گھنیا قسم کی افواہیں پھیلانے کی مہم چلائی گئی جن میں دہشت گردوں کی حمایت کے حوالے سے ایک سے بڑھ کر ایک مبالغہ آمیز خبریں شامل تھیں اور 1988ء میں بین الاقوامی 103 پر ہونے والی بمباری کا الزام ایران اور شام سے ہٹا کر لیبیا پر عائد کر دیا کیونکہ

امریکہ کو خلیج کی جنگ کے حوالے سے اول الذکر دونوں ممالک کی حمایت درکار تھی۔ امریکہ کے لیے لیبیا کی حیثیت متناطیس کی تھی کہ کوئی بھی معاملہ ہوائی اسی کی جانب اٹھتی تھی۔

جینی 1987ء

جمہوری انتخابات کے ذریعہ اپریل میں وزارت عظمیٰ کا عہدہ سنبھالنے والے ٹرمی باورڈ کا صرف ایک ماہ بعد فوجی انقلاب کے ذریعہ تختہ الٹ دیا گیا۔ لیبر پارٹی سے تعلق رکھنے والے باورڈ نے امریکہ کو اپنے بعض اقدامات کے ذریعہ ناراض کر دیا تھا۔ اول تو یہ کہ اس نے خود کو غیر جانبدارانہ تحریک کے ساتھ منسلک کر لیا تھا، دوم اس وعدہ کے ساتھ اقتدار سنبھالا تھا کہ فوجی کو غیر ایٹمی علاقہ کی دہشت میں واپس لایا جائے گا جس کا مطلب یہ تھا کہ اب وہاں نہ تو ایٹمی طاقتیں دباؤ ڈال سکیں گی اور نہ ہی ایٹمی جھتیلا لے جانے والے جہاز نگر انداز ہو سکیں گے۔ 1982ء میں جب باورڈ کے پیشرو آرائس کے مانانے بھی اسی قسم کی پالیسی پر عملدرآمد کرنے کا فیصلہ کیا تو اس فصل سے روکنے کے لیے اس پر امریکہ کی جانب سے شدید قسم کا دباؤ ڈالا گیا۔ اس سال فوجی میں تعینات سابق امریکی سفیر ولیم بوڈر جونیر کے ایک بیان کے مطابق ”ہماری حکمت عملی کی ضروریات کی بناء پر امریکہ کے لیے غیر ایٹمی علاقہ قطعی طور پر ناقابل قبول ہوگا۔ اس تحریک کو کچلنے کے لیے امریکہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔“ اسی سال مارانے پالیسی ختم کر دی۔ یہ صاف ظاہر تھا کہ باورڈ اکو اتنی آسانی سے نہیں جھکایا جاسکتا کیونکہ اس نے غیر ایٹمی بحرالکاہل کے اتحاد کے ایک حصہ کی حیثیت سے اقتدار سنبھالا تھا۔

باورڈ کے اقتدار سنبھالنے کے دو ہفتے بعد اقوام متحدہ میں امریکی سفیر ورنن والٹرز نے جزیرہ کا دورہ کیا۔ سی آئی اے کے اس ساتھ ڈپٹی ڈائریکٹر کارلکا ریڈ یہ تھا کہ اس کے دورہ سے ذرا پہلے دوران یا پھر فوری بعد سی آئی اے کی عدم استحکام کی کارروائیاں شروع ہو جاتی تھیں۔ والٹرز نے باورڈ سے بظاہر اقوام متحدہ کے معاملات پر گفت و شنید کے لیے ملاقات کی۔ وہ فوج کی سربراہی کے حوالے سے تیسری اہم ترین شخصیت لیفٹیننٹ کرنل سٹیوینی ربوکا سے بھی ملا۔ اس کے صرف دو ہفتے بعد ربوکا نے فوجی انقلاب کے ذریعہ باورڈ کا تختہ الٹ دیا۔

ربوکا کے ایک ماہ پر مشتمل اقتدار کے دوران بحرالکاہل کے علاقہ میں اچانک ہی

لیبیا سے دہشت کی عجیب و غریب مہم شروع کر دی گئی۔ اس سے قبل بھی ایک ہارر گین انتظامیہ امریکہ میں ایسی ہی اہمقانہ ”لیبیا دہشت“ مہم کے حوالے سے مذاق کا نشانہ بن چکی تھی۔ فوجی میں فوجی انقلاب کی توجیہ پیش کرنے کے لیے بھی رپوکا اور اس کے حامیوں نے لیبیا کی جانب سے جارحیت کے خطرہ کو ڈھال بنایا۔

اس ڈرامہ میں ایسے ہی کئی اور ”اتفاقات“ بھی سامنے آئے جن میں انقلاب سے قبل جمہوری استعداد بڑھانے کے لیے چندہ جمع کرنے کی غرض سے فوجی میں سی آئی اے کی لیبر مافیا اور امریکی فوجی دستوں کی آمد سرفہرست تھی۔

انقلاب کے اگلے روز پینٹاگون کے ذرائع نے اس سلسلہ میں امریکہ کے ملوث ہونے کی تردید کرتے ہوئے اعلان کیا کہ ”ہم بہت خوش ہیں..... اچانک ہی پتہ چلا کہ ہمارے جہاز فوجی نہیں جاسکتے اور اب فوری طور پر وہ جاسکتے ہیں۔“

پانامہ 1989ء

دیوار برلن گرنے کے دو ہفتوں کے اندر امریکہ نے عالمی امن کے نئے دور کے آغاز پر اپنی خوشی کا اظہار پانامہ پر چڑھائی کر کے کیا۔ امریکہ نے یہاں ایک بار پھر وحشیانہ بمباری شروع کر دی۔ 20 دسمبر 1989ء تک پانامہ شہر کی رہائشی عمارتوں کی بہت بڑی تعداد کا صفایا پھیر دیا گیا۔ 15,000 لوگ بے گھر ہو گئے۔ امریکہ اور پانامہ کی فوج کے درمیان کئی دنوں پر مشتمل میدانی جنگ کے دوران سرکاری اعداد و شمار کے مطابق 500 سے زائد مقامی باشندے ہلاک ہوئے جسے امریکہ اور امریکی حمایت یافتہ پانامہ کی نئی حکومت نے تسلیم کیا جبکہ دیگر ذرائع کے اعداد و شمار اور شہادتوں کے مطابق ہلاک ہونے والوں کی تعداد ہزاروں میں تھی۔ مزید برآں 3,000 پانامی زخمی ہوئے 23 امریکی مارے گئے اور 324 زخمی ہوئے۔

ایک رپورٹر نے اس حوالے سے صدر بش سے سوال کیا کہ کیا فوریکا کا حصول اتنی اہمیت کا حامل تھا کہ اس کے لیے بے شمار لوگوں کو موت کے منہ میں دھکیل دیا گیا؟
جارج بش نے اس کے جواب میں کہا کہ ”ہر انسانی جان بہت قیمتی ہے۔ مجھے چونکہ جواب دینا ہے اس لیے ہاں یہ اتنی اہمیت کا حامل تھا۔“

مینیول فوریکا کئی برسوں سے امریکہ کے اتحادی کی حیثیت سے فرائض سرانجام

دے رہا تھا یہاں تک کہ وہ اپنی افادیت کھو بیٹھا تھا مگر اس حملہ کی بنیادی وجہ اس کے حصول کو ہی بنایا گیا۔ حقیقت یہ ہے بش نکاراگوا کے عوام کو یہ پیغام دینا چاہتا تھا کہ اگر دو ماہ بعد ہونے والے انتخابات میں انہوں نے سینڈسٹاز کو دوبارہ منتخب کیا تو یہی سب کچھ ان کے ساتھ بھی ہو گا۔ بش کچھ فوجی قوتوں کو بھی جھکانا چاہتا تھا تا کہ حال ہی میں ”سوویت خطرے“ کے خاتمے کے باوجود بڑی تعداد میں لڑاکا فوج کی ضرورت کے حوالے سے کانگریس کو وضاحت کی جائے۔ سرکاری وضاحت میں امریکہ سے بے دخلی کی وجہ نوریگا کے منشیات کے کاروبار کو قرار دیا گیا حالانکہ امریکہ اس کے بارے میں کئی برسوں سے آگاہ تھا مگر اسے اس سے کسی قسم کی کوئی پریشانی نہیں تھی۔ اور وہ بھی بے گناہ پانامیوں کے خون سے ہاتھ رنگے بغیر اس شخص پر ہاتھ ڈال سکتے تھے۔

افغانستان 1979-92ء

افغانستان میں اسلامی انتہا پسند طالبان کی جانب سے خواتین پر عائد پابندیوں کا تو خوب شہرہ ہوا مگر اس بات سے دنیا کو اتنی اچھی طرح آگاہ نہیں کیا گیا کہ 70ء اور 80ء کی دہائیوں میں افغانستان میں قائم حکومت خواتین کو یکساں حقوق دیتے ہوئے اپنے ترقی پذیر ملک کو اکیسویں صدی میں لے جانے کی خواہشمند تھی مگر امریکہ نے اس حکومت کے خلاف جنگ میں کروڑوں ڈالر اس لیے جھونک ڈالے کہ اس حکومت کو سوویت یونین کی حمایت حاصل تھی۔ انتہا پسند حزب اختلاف کی بھرپور امداد کر کے امریکہ جان بوجھ کر سوویت جارحیت کے امکانات میں اضافہ کر رہا تھا۔ اور جب اس کا مقصد پورا ہو گیا اور سوویت یونین نے حملہ کر دیا تو سی آئی اے نے ہدایات جاری کرنے کا فریضہ سنبھالتے ہوئے مشرق وسطیٰ کے حامیوں کو بھرپور مالی امداد فراہم کرنے کا حکمنامہ جاری کیا۔ اس سلسلہ میں امریکہ کی جانب سے ہمسایہ ملک پاکستان پر مستقل طور پر دباؤ ڈالا جا رہا تھا تو کبھی رشوتوں کی پیشکش کی جا رہی تھی کہ یہاں امریکی فوجی اڈے قائم کرنے کی اجازت دے دی جائے۔ جہاں سے ہتھیاروں کی فراہمی اور فوجی تربیت کا سلسلہ جاری رکھا جاسکے۔

آخر میں امریکہ اور طالبان کو فتح حاصل ہو گئی اور خواتین اور باقی افغانستان ہار گیا۔ دس لاکھ سے زائد ہلاکتیں ہوئیں 30 لاکھ کے قریب مغدور ہوئے اور کل آبادی کا نصف حصہ

یعنی 50 لاکھ افراد بے گھر ہو گئے۔

ایل سیلوا ڈور 1980-92ء

سیلوا ڈور کی حزب مخالف نے نظام کے تحت کام کرنے کی کوشش کی مگر حکومت نے امریکی حمایت سے انتخابات میں بار بار دھاندلیاں کر کے اور سینکڑوں احتجاجی مظاہرے کرنے والوں اور ہڑتالیوں کا قتل عام کر کے ان کی کوششوں کو ناکام بنا دیا۔ بالآخر جنگ آ کر 1980ء میں حزب اختلاف نے بندوق اٹھالی اور خانہ جنگی کا آغاز ہو گیا۔ جس پر امریکہ نے فوری رد عمل کا اظہار کیا۔

سرکاری طور پر ایل سیلوا ڈور میں موجود امریکی فوج کی حیثیت صرف مشاورت تک محدود تھی جبکہ حقیقت میں امریکی فوج اور سی آئی اے نے یہاں مستقل طور پر نہایت سرگرم کردار ادا کیا۔ تقریباً 20 امریکی فوجی جاسوسی یا ایسی ہی دیگر کارروائیوں کے دوران جنگ زدہ علاقوں پر سے اڑنے والے ہیلی کاپٹر اور ہوائی جہازوں کی تباہی سے ہلاک ہو گئے اسی طرح میدانی جنگ میں بھی امریکی کردار کے حوالے سے بے شمار شواہد ہیں۔ 1992ء میں مندرجہ ذیل نتائج کے ساتھ جنگ اپنے اختتام کو پہنچی۔ 75,000 شہری ہلاکتیں امریکی خزانہ کی 6 بلین ڈالرز سے محرومی یا مقصد سماجی تبدیلی ناپید چند مخصوص دولت مندوں کے ہاتھوں میں ملک کی باگ ڈور غریب ہمیشہ کی طرح غریب اور حزب مخالف کو دائیں بازو کی جانب سے مستقل موت کا خطرہ وغیرہ وغیرہ ایل سیلوا ڈور میں کسی قسم کی سماجی تبدیلی نہیں لائی جاسکی۔

ہٹی 1987-94ء

امریکہ نے 30 سال تک ڈومیلیئر خاندان کی آمریت کی حمایت جبکہ اصلاحات پسند پادری جین برٹینڈ آریسٹائیڈ کی مخالفت کی۔ اس دوران سی آئی اے موت کے ہر کاروں، تشدد پسندوں اور منشیات کا کاروبار کرنے والوں کے ساتھ مل جل کر کام کرتی رہی۔ اس تمام پس منظر کے ساتھ 1994ء میں کنٹینن انتظامیہ نے خود کو بہت نازک صورتحال سے دوچار پایا کہ ”جمہوریت“ کے حوالے سے ان کے زیریں خیالات محض دکھاوا ہیں۔ تب انہوں نے جمہوری طور پر منتخب ایریسٹائیڈ کی اقتدار میں واپسی کی حمایت کی 1991ء میں فوجی انقلاب کے ذریعہ تختہ الٹ دیا گیا تھا۔ اس کی واپسی کو دو سال سے زیادہ مؤخر کرنے کے بعد امریکہ نے

اس شرط کے ساتھ اقتدار ایریٹا نیڈ کے حوالے کیا کہ وہ امیروں کی بنیاد پر غریبوں کی مدد نہیں کرے گا اور آزاد مندی کی معیشت پر سختی سے کاربند رہے گا۔ اس کا واضح مطلب یہ تھا کہ بیٹی مستقل طور پر امریکی اشاروں پر ناپتا رہے گا اور اس کے کارکن افلاس زدہ رہیں گے اور اگر ایریٹا نیڈ نے اس معاہدہ کو توڑنے کا تصور بھی کیا تو اسے صرف اپنی کمزری کے پار نظر ڈالنی ہوگی جہاں امریکی فوجی دسے اس کے بچے کچے اقتدار پر بھی قابض ہونے کے لیے براجمان تھے۔

بلغاریہ 1990-91ء

نومبر 1999ء میں بلغاریہ کے اپنے دورہ کے دوران صدر کلشن نے صوفیہ میں ایک مجمع سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ وہ صاف شفاف انتخابات کرانے اور اشتراکیت کو مسترد کر دینے پر انہیں سلام پیش کرتے ہیں۔ صدر صاحب یہ ذکر کرنا بھول گئے کہ ان کے ایسے ہی ایک صاف شفاف انتخابات میں فتح حاصل کر کے برسر اقتدار آنے والی اشتراکی حکومت کا امریکہ نے تختہ الٹ دیا تھا۔

1990ء میں قومی استرداد برائے جمہوریت (NED) نے بلغاریہ کی سوشلسٹ پارٹی (سابقہ کمیونسٹ پارٹی) کو جون 1990ء کے عام انتخابات میں شکست سے دوچار کرنے کے لیے 15 لاکھ ڈالر خرچ کیے۔ آبادی کے لحاظ سے یہ کسی بیرونی طاقت کے لیے امریکہ کی انتخابی مہم پر 3 کروڑ 80 لاکھ ڈالر خرچ کرنے کے مساوی تھا۔ قومی استرداد برائے جمہوریت کی بخشش وصول کرنے والی سب سے بڑی جماعت متحدہ جمہوری محاذ تھی جو اہم ترین مخالف جماعت تھی۔ اس نے 517,000 ڈالر وصول کئے جبکہ اس کے اخبار کو 233,000 ڈالر مزید فراہم کئے گئے۔ امریکہ کو اس وقت شدید پریشانی اور مایوسی کا سامنا کرنا پڑا جب بلغاریہ کی سوشلسٹ پارٹی نے انتخابات میں فتح حاصل کر لی۔

امریکہ نے فیصلہ صادر کر دیا کہ بلغاریہ سوشلسٹ پارٹی کو اقتدار پر فائز نہیں رہنے دیا جائے گا۔ ایسا نہ کہی ہو سکتا تھا اور نہ ہی ہوگا کہ بلغاریہ سوشلسٹ پارٹی کو یہ ثابت کرنے کا موقع دیا جائے کہ جمہوریت اور سوشلزم کے اشتراک سے تشکیل پانے والی مخلوط معیشت مغربی یورپ میں کامیابی سے ہمکنار ہو سکتی ہے ایک ایسے وقت میں جبکہ سامراجیت کی وجہ سے پہلے ہی لوگوں میں اس حوالے سے غلط فہمیوں کا ازالہ ہو رہا تھا۔

منصوبہ کے مطابق قومی استعداد برائے جمہوریت نے حزب اختلاف کی اہم جماعتوں کو فراخ دلی سے چندے اور اسی حساب سے ہدایات دیں۔ جنہوں نے ان احکامات پر عمل کرتے ہوئے پانچ ماہ تک دہشت گردی اور انتشار کا بازار گرم کئے رکھا۔ جگہ جگہ مسلح اور تباہ کن مظاہرے بد امنی، تشدد، بھوک ہڑتالیں، پارلیمنٹ کے گھیراؤ، حکومت کے محاصرہ جیسی کارروائیوں کے بعد بالآخر صدر اپنے کچھ وزراء سمیت استعفیٰ دینے پر مجبور ہو گیا اور پھر وزیراعظم نے بھی اقتدار چھوڑ دیا۔

1991ء میں قومی استعداد برائے جمہوریت (NED) نے ایک بار پھر عام انتخابات میں لاکھوں ڈالرز لگائے اور اس بار بقول این ای ڈی کے ”جمہوری قوتیں“ کامیاب ہو گئیں۔

البانیہ 1991-92ء

یہ کہانی بہت حد تک بلغاریہ سے ملتی جلتی ہے۔ مارچ 1991ء کے انتخابات میں اشتراکی جماعت نے فتح حاصل کر کے عنان اقتدار سنبالا۔ اس حکومت کے قیام کے دو ماہ کے اندر اندر ملک بھر میں وسیع پیمانے پر بد امنی، انتشار اور بد نظمی پھیل گئی۔ گلیوں میں احتجاجی مظاہرے معمول کا حصہ بن گئے بالآخر جون میں تین ہفتوں پر مشتمل عام ہڑتال حکومت کے خاتمہ پر منتج ہوئی۔ یہاں بھی قومی استعداد برائے جمہوریت (NED) نے نہایت نمایاں کردار ادا کیا۔ اس نے عروج و تحریک کو 80,000 ڈالرز دیئے جبکہ ”جماعت کی تربیت اور تعلیمی پروگرام“ کے نام پر 23,000 ڈالرز فراہم کئے۔ مارچ 1992ء میں نئے انتخابات ہوئے۔ انتخابی مہم کے دوران امریکہ کی سیاسی حکمت عملی کے ماہرین اور سفارتکار امریکی سفیر کے ہمراہ کھلے عام جمہوری پارٹی (اشتراکی حکومت کی سب سے بڑی مخالفت جماعت) کے امیدواروں سے ملاقاتیں کرتے رہے اور انہیں واضح الفاظ میں یہ پیغام پہنچاتے رہے کہ اگر اشتراکیوں کو دوبارہ فتح حاصل ہوئی تو امریکی امداد بند کر دی جائے گی اور ”بہت سے مغربی سرمایہ کار اور حکومتیں کسی اور ملک میں سرمایہ کاری کریں گی۔“ قومی استعداد جمہوریت ایک بار پھر ان ”اچھے لوگوں“ کے ساتھ ہر قسم کی نیکی کرنے کے لیے موجود تھی اور پھر جمہوری پارٹی جیت گئی۔

صومالیہ 1993ء

امریکی افواج کی آمد کو قحط زدہ انسانوں کی غذائی امداد کا مشن سمجھا جا رہا تھا حالانکہ امریکہ تو عرصہ دراز سے اس ملک کے سیاسی نقشے کو ازسرنو ترتیب دینے کی کوششوں میں مصروف تھا جس میں غالب جنگجو سردار محمد عیدی اور اس کے طاقتور گروہوں کا کوئی عمل دخل نہ ہو۔ صومالیہ کے سیاسی منظر نامہ سے انہیں غائب کر دینا امریکہ کا مطمح نظر تھا۔ جون کے آغاز میں کئی مواقع پر امریکی ہیلی کاپٹروں نے عیدی کے حامی گروہوں پر میزائل برسائے جس سے کئی ہلاک ہو گئے پھر اکتوبر میں امریکی فوج نے عیدی کے قبیلہ کے دوسرا دروں کو گرفتار کر لیا جس کے نتیجے میں خوفناک خونی معرکہ ہوا۔ لڑائی کے اختتام پر جو اعداد و شمار سامنے آئے ان کے مطابق 5 امریکی ہیلی کاپٹر مار گرائے، 18 امریکی مارے گئے، 73 زخمی ہوئے جبکہ 500 سے 1000 تک صومالی باشندے ہلاک اور اس سے زیادہ زخمی ہوئے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا واقعی قحط زدہ انسانوں کو خوراک فراہم کرنا اتنی ہی اہمیت کا حامل تھا جتنی کہ یہ حقیقت کہ چار امریکی تیل کمپنیاں اس ملک کے وسیع علاقوں میں تیل کی تلاش میں مصروف تھیں اور انہیں قوی امید تھی کہ امریکی فوجی دستے افراتفری کی اس صورتحال کا خاتمہ کر لیں گے جس کی وجہ سے ان کی وسیع سربراہیہ کاری خطرہ میں پڑی ہوئی تھی۔ اس وقت پینٹاگون کو ضرورت اس بات کی تھی کہ کسی طرح کانگریس کو راضی کیا جائے جو سرد جنگ کے خاتمہ کے بعد فوجی بجٹ میں کمی کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ”انسانیت کی فلاح و بہبود“ کے لیے ہونے والی کارروائیاں اور امریکی بحری بیڑوں کے (غیر ضروری) جوش و خروش کے ساتھ ٹیلی وژن کے کیمروں شی زد میں ساحلوں پر لنگر انداز ہونا کانگریس کو راضی کر سکتا تھا پس امریکہ نے یہ کارروائی اس رنگ میں کی کہ یہ محسوس ہونے لگا کہ یہ اقوام متحدہ کا امدادی منصوبہ نہیں بلکہ امریکی فوج کا کارنامہ ہے۔

اور پھر ان بحری بیڑوں کے لنگر انداز ہوتے ہی اس شدید قحط کا خاتمہ ہو گیا جس کے عروج پر ہونے کا امریکہ پچھلے چند ماہ سے مسلسل پراپیگنڈہ کر رہا تھا۔

عراق 1990ء

پاگل خانے اور جیل ایسے لوگوں سے بھرے ہوئے ہیں جو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ

انہیں ایسی آواز آئی تھی جو انہیں ایسے لوگوں کو قتل کرنے کا حکم دیتی تھی جن سے وہ پہلے کبھی نہیں ملے تھے، جنہوں نے انہیں کبھی کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا اور نہ ہی کبھی ایسی کوئی دھمکی دی تھی۔ امریکی سپاہی ان احکامات کو سنتے ہوئے ایسے لوگوں کو قتل کرنے کی غرض سے مشرق وسطیٰ روانہ ہو گئے، قتل کا حکم دینے والی یہ آواز جارج بوش کی تھی۔

مشرق وسطیٰ کی ترقی یافتہ ترین اقوام سے ایک قوم پر 40 دن اور رات ہونے والی وحشیانہ بمباری نے اس کے قدامت اور جدت کے حسین امتزاج سے مزین دارالحکومت کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیا۔ 177 ملین پاؤنڈ وزنی بم عراق کے شہریوں پر گرائے گئے۔ اس وقت تک کی عالمی تاریخ کی یہ سب سے وحشیانہ اور تباہ کن فضائی تباہ کاری تھی۔ ڈیپلیٹڈ یورینیم ہتھیار انسانوں کو بھسم کر رہے تھے انہیں کینسر اور دیگر متعدد امراض میں مبتلا کر رہے تھے۔ کیمیاوی وحیاتاتی ہتھیاروں کے استعمال اور تیل کی صنعتیں تباہ ہونے کی وجہ سے فضا زہریلی ہو گئی تھی، سپاہی زندہ دفن ہو رہے تھے، انفراسٹرکچر تباہ ہو گیا تھا، صحت عامہ پر نہایت مضر اثرات مرتب ہو رہے تھے، 21 ویں صدی میں بھی پابندیاں بدستور عائد تھیں، ان تمام مسائل کے سبب دس لاکھ سے زائد بچے ہلاک ہو چکے تھے یہ تعداد بالغوں سے بھی زیادہ تھی۔ یونیسف کی اگست 1999ء کی ایک رپورٹ کے مطابق ”پابندیوں کے سالوں کے دوران جنوبی اور وسطیٰ عراق میں پانچ سال سے کم عمر بچوں کی اموات کی شرح دو گنا ہو گئی تھی۔“

آج کے دن تک امریکہ اور برطانیہ سلگتی ہوئی آگ یعنی عراق کے خلاف میزائل چلا رہے ہیں۔ ہر روز ہی ان کے جہاز پر بمباری کرتے ہیں اور اس بمباری کا اختیار وہ ایک دوسرے سے حاصل کر لیتے ہیں۔ 1999ء کے پہلے آٹھ ماہ کے دوران ان دونوں ممالک نے دس ہزار جہاز عراق پر سے اڑائے جنہوں نے ایک ہزار بموں اور میزائلوں سے 400 مقامات کو نشانہ بنایا۔ جس سے سینکڑوں افراد ہلاک اور زخمی ہوئے۔ اس کارروائی کے سربراہ امریکی بریگیڈیئر جنرل ولیم لونی کے مطابق:

”اگر وہ اپنے راڈار کا استعمال کرتے ہیں تو ہم ان کا پورا نظام تباہ کر دیتے ہیں۔ وہ اس بات سے آگاہ ہیں کہ ہم ان کے ملک کے مالک ہیں۔ ہم ان کی فضائی حدود کے مالک ہیں..... ہم انہیں بتاتے ہیں کہ وہ کیسے رہیں اور کیا بات کریں۔ اور یہ ہے جو آج امریکی عظمت

کہلاتی ہے۔ یہ بہت اچھی بات ہے خاص طور پر اس وقت جب یہاں بے انتہا تیل ہے اور ہمیں اس کی ضرورت ہے۔“
یہ کہا جاسکتا ہے کہ امریکہ نے دوسری عالمی جنگ کے بعد جرمنی اور جاپان کو دی جانے والی سزاؤں کے مقابلہ میں عراق کو اپنے انتقام کو زیادہ نشانہ بنایا ہے۔
نوم چومسکی لکھتا ہے کہ ”40 کی دہائی سے امریکی خارجہ پالیسی کا یہ واضح نظریہ رہا ہے کہ خلیج میں واقع تیل کے وسیع ذخائر امریکہ اور اس کے حواریوں کے قبضہ میں رہیں۔ اور اس حوالے سے کسی خود مختار مقامی طاقت کو تیل کی پیداوار اور قیمت کے تعین کے بارے میں اپنا اثر و رسوخ استعمال کرنے کی قطعی اجازت نہیں دی جائے گی۔“

ہو سکتا ہے یہی عراق کا جرم ہو۔ یہ جرم نہیں کہ اس نے 1990ء میں کویت پر جارحیت کا ارتکاب کیا تھا، ایسی جارحیت جس کی حوصلہ افزائی امریکہ نے کی اور جس کے لیے امریکہ کے نہایت قریبی حلیف، کویت نے خود اُسکیا تھا، ایسی جارحیت جس نے امریکہ کو کارروائی کے لیے وہ موقع فراہم کر دیا تھا جس کی تلاش میں وہ کافی عرصہ سے تھا۔ کیونکہ بہر حال عراق کی جارحیت اس سے زیادہ نہیں تھی جو کچھ انڈونیشیا نے امریکی کی مرضی سے مشرقی تیمور میں کیا تھا۔

پیرود 1990ء تا حال

ایک دہائی سے زائد عرصہ سے امریکہ پیرود کو مستقل طور پر فوجی امداد فراہم کر رہا ہے جس میں فوجی مشاورت اور تربیت کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ، بحری اور زمینی افواج، ہر قسم کے ہتھیار اور فوجی آلات، راڈار سسٹم اور جس چیز کی ضرورت پیش آسکتی ہے شامل ہے یہ سب کچھ مغربی کرہ ارض کی سب سے زیادہ آمر اور جاہل حکومت کو فراہم کیا جا رہا ہے جس کے ظالم اور آمر مطلق حکمران البرٹو فوجی موری کی زیر قیادت ہونے والی جبروت شدہ کی نگین کارروائیوں انسانی حقوق کی وسیع پیمانے پر ہونے والی خلاف ورزیوں اور ملک بھر میں قائم عقوبت خانوں کی اینسٹی انٹرنیشنل، ہیومن رائٹس واچ، امریکہ اور محکمہ خارجہ کی انسانی حقوق کی رپورٹوں میں کئی بار مذمت کی جا چکی ہے۔

وہ کون سے اسباب ہیں جن کی وجہ سے امریکی حمایت مستقل بنیادوں پر جاری ہے؟

امریکہ کی جانب سے یہ وضاحت کی جاتی ہے کہ وہ مل کر غشیات کے خلاف جنگ کر رہے ہیں۔ مگر اس بارے میں کیا وضاحت پیش کی جائے گی کہ جو ایئر فورس کے چار افسر بشمول فوجی موری کے ذاتی پائلٹ گرفتار کئے گئے تھے کیونکہ ان کے فوجی ہوائی جہاز سے 383 پاؤنڈ کوکین برآمد ہوئی تھی اور وہ جو چار مختلف مواقع پر نیوی کے جہازوں سے 220 پاؤنڈ کے مجموعی وزن کی کوکین برآمد ہوئی تھی اور وہ جو فوجی موری مشیر خاص والا دبیر مونٹگو غشیات کی دنیا کا بے تاج حکمران اور اس سے قبل غشیات کے منگروں کا وکیل تھا یہ وہ ہی مونٹگو ہے جو طویل عرصہ تک سی آئی اے کا تنخواہ دار ملازم بھی رہا اور ایک خفیہ تنظیم بھی چلاتا تھا جس کی 1999ء میں امریکی سینٹ نے کھلے عام مذمت کی تھی کیونکہ یہ تنظیم غشیات فروشوں میں ملوث تھی اور وہ جو فوج دکھاوے کے لیے غشیات فروشوں پر چھاپے مارتی ہے جبکہ اندر خانہ ان کو تحفظ فراہم کیا جاتا ہے..... اب امریکہ کیا سوچ رہا ہے؟ وہ معمول کی بات سوچ رہا ہے کہ گورنر بلا تحریک کو کھینچنے کے لیے حکومت کی مدد پہلی ترجیح ہے۔ 1997ء میں فوجی موری نے ہائیں بازو سے تعلق رکھنے والے 14 افراد کو قتل کر دینے کا حکم دیا۔ ان میں زیادہ تر نوجوان تھے اور ان کا قصور یہ تھا کہ انہوں نے انسانی حقوق کی پاسداری اور اقتصادی ترقی کے اپنے مطالبات منوانے کے لیے جاپانی سفیر کی رہائشگاہ پر عارضی طور پر قبضہ کر لیا تھا اور اپنے ہی خون میں نہلائے جانے سے قبل انہوں نے پراسن طریقے سے ہتھیار ڈالنے کی کوشش بھی کی تھی۔ وہ کمانڈر کی جنملا نے یہ کارروائی کی تھی جنہیں اس قسم کی کارروائیوں کے لیے گھنٹکی امداد اور تربیت امریکہ سے ملی تھی۔ اس خاص فنی تربیت میں RU-38A جہازوں کی اونچی اڑائیں بھی شامل تھیں جن کے ذریعہ خفیہ عمارتوں اور موٹی دیواروں کے اندر کی تصاویر بھی لی جاسکتی ہیں۔ حملہ کی اس کارروائی میں اور بھی بہت سے گھنٹکی طریقے استعمال کئے گئے۔

امریکہ نے غشیات کے کاروبار کی وجہ سے ان نوجوانوں کی سزا کے حوالے سے کوئی مدد نہیں کی۔

میکسیکو 1990ء تا حال

”میکسیکو کی حکومت کے لیے ضروری ہوگا کہ وہ قومی سلامتی کی پالیسی اور علاقہ پر اپنے مؤثر کنٹرول کا مظاہرہ کرنے کے لیے زیناٹلاز کو علیحدہ کر دیں..... اور محتاط انداز

میں یہ بھی سوچنے کی ضرورت ہے کہ اگر حزب اختلاف انتخابات میں فتح حاصل کر لیتی ہے تو اسے تسلیم کیا جائے یا نہیں۔“ اس کے لیے جیمز ہینٹن بینک نیویارک کے لیے کام کرنے والے لاطینی امریکہ کی معاشی منڈیوں کے مشیر رائیوڈن رائٹ کی 1995ء کی یادداشت پڑھیں جس میں اس نے میکسیکو کے اس پے ہوئے طبقہ کی تحریک کے بارے میں بات کی ہے جو اپنی خود مختاری اور سیاسی معاشی حقوق کا مطالبہ کر رہے تھے اور آج تک کر رہے ہیں۔ تاہم یہ مطالبات NAFTA اور عالمی معیشت کے دیگر عناصر جو زہ پائٹاز کو مخصوص علاقوں سے باہر نکال دینا چاہتے تھے یا کم از کم زمین کی ملکیت کے دعویدار نہیں تھے کہ نظریات سے ٹکرائے تھے۔ اور اس کی بہت سی وجوہات تھیں جن میں تیل اور قدرتی وسائل سرفہرست تھے اور یہ بھی حقیقت تھی کہ ان کے مطالبات ماننے کی صورت میں میکسیکو اور وسطی امریکہ کے مزدوروں کو شہل سکتی تھی۔ پیٹا کا منصوبہ یہ تھا کہ یہاں کی زراعت جو اس پے ہوئے طبقہ کے ہاتھوں عرصہ دراز سے قدیم طریقوں کے مطابق ہی چل رہی تھی اسے جدید ٹیکنالوجی کی مدد سے چلایا جائے تاکہ رہز اور لکڑی کی برآمدات سے زیادہ سے زیادہ منافع حاصل کیا جاسکے۔

غشیات کے خلاف جنگ کے نام پر امریکہ نے میکسیکو میں فوجی امداد اور تربیت کے لیے کروڑوں ڈالر خرچ کئے۔ اس کے ساتھ ساتھ امریکی پولیس ایجنٹس، فوجی مشیر سی آئی اے کے کارندے اور سپیشل فورسز بھی روانہ کی جاتی رہیں۔ یہ سب حمایت اور امداد نمایاں طور پر بدعنوان حکومت، فوج، پیرامٹری اور پولیس کے لیے تھی جن کی اکثریت غشیات کے کاروبار، قتل و غارتگری، تشدد کی کارروائیوں اور انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں میں ملوث تھی۔ زہ پائٹاز کے دعوئی کے مطابق امریکہ اور ارجنٹائن کے مشیروں نے اس پیرامٹری فورس کو مکمل تربیت فراہم کی ہے جو اس نئی ”ناپاک جنگ“ میں جو کہ خوفناک حد تک لاطینی امریکہ جیسی ہے اہم ترین کردار ادا کر رہی ہے۔

امریکہ کی فراہم کردہ فوجی امداد میں وہ جدید ترین ٹیکنالوجی بھی شامل تھی جس کے ذریعہ جنگوں اور پہاڑوں میں چھپے ہوئے زہ پائٹاز کو تلاش کر کے قابو کیا جاسکے اس کے علاوہ سینکڑوں ہیلی کاپٹر جن کے ذریعہ آبادیوں پر مشین گنوں سے فائرنگ کی گئی، راکٹ برساتے اور بمباری کی گئی۔ تیسری دنیا میں آج بھی اس قسم کی امریکی امداد اور تربیت کا سلسلہ نہ صرف جاری ہے بلکہ یہ معمول کا حصہ بن چکا ہے۔

1998ء میں واشنگٹن پوسٹ نے اس موضوع پر ایک شاندار سلسلہ شائع کیا۔ اس کا ذرا ایک اقتباس ملاحظہ کیجئے۔

”یہاں تک کہ وہ ممالک جہاں داخلی طور پر کسی قسم کی مسلح مخالفت کا کوئی وجود تک نہیں ہے وہاں بھی امریکی افواج ان کی فوجوں کو تربیت دے رہی ہیں کہ مخالفین پر کس طرح سے قابو پایا جاسکتا ہے، ہیلی کاپٹروں کے ذریعہ حملوں سے انہیں کس طرح ششدر کیا جاسکتا ہے، مکمل پیشہ ورانہ مہارت کے ساتھ انسانوں کو کس طرح قتل کیا جاسکتا ہے اور ضرورت پڑنے پر خاص مواقع پر کس طرح شہروں میں گھر گھر گھس کر دود بولرائی لڑی جاسکتی ہے۔“

میکسیکو کو فراہم کی جانے والی فوجی امداد کانگریس کے اس قانون کی یکسر خلاف ورزی ہے جس کے مطابق ایسے بیرونی ملک کی سلامتی اور تحفظ کیلئے جو انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کا مرتکب ہو فوجی امداد پر مکمل پابندی عائد ہے۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ زینپالٹاز پر فضیات کے کاروبار میں ملوث ہونے کا کوئی الزام تک نہیں ہے اس کے باوجود ان کے خلاف جاری جنگ میں امریکہ کی سرگرم شمولیت کو صرف اور صرف نظریاتی تناظر میں دیکھا جاسکتا ہے۔

کولمبیا 1990ء تا حال

دنیا کی سب سے تشدد پسند قوم کولمبیا اس دہائی کے آخر تک امریکی فوجی امداد حاصل کرنے والی تیسری سب سے بڑی قوم بن گئی۔ بائیں بازو کے گوریلوں کی باغیانہ کارروائیوں کو روکنے کے لیے سینکڑوں امریکی فوجی ماہرین کی آمد کے ساتھ ساتھ امریکی فوجی اڈوں کی تعداد بھی بڑھتی چلی گئی۔ امریکہ نے ہیلی کاپٹر اور گوریلوں کے بارے میں خفیہ معلومات فراہم کر کے حکومت کو ان پر بمباری کرنے اور دیگر فوجی طریقے استعمال کرنے کے سلسلہ میں مکمل مدد فراہم کی۔ جنگی کارروائیوں کے دوران کئی بار امریکی ہوائی جہاز بھی اڑتے دکھائی دیئے اس پر گوریلوں نے دعویٰ کیا کہ امریکہ خفیہ طور پر ان جنگی کارروائیوں میں برابر کا شریک ہے۔ انہوں نے خبردار کیا کہ وہ انہیں بھی نشانہ بنائیں گے۔

امریکہ نے ایک بار پھر عوام کو مطمئن کرنے کے لیے اس خانہ جنگی میں اپنی سرگرم شمولیت کی وجہ ”منشیات کے خلاف جنگ“ کو قرار دیا۔ اپنی اس وضاحت کو بچ کے لبادہ میں لینے کے لیے امریکہ میں منشیات کی دنیا کے شہنشاہ زادیری میک کیفری کی خدمات حاصل کی گئیں جس نے معمول کے انداز میں اہم گوریلا گروپ فارک (FARC) کو منشیات کا سمگلر قرار دے دیا۔ مگر 1999ء میں ڈی ای اے (DEA) کی قائم مقام انتظامیہ نے شہادت پیش کر دی کہ ”ابھی تک ڈی ای اے اس نتیجہ پر نہیں پہنچی کہ فارک (FARC) اور ای ایل این (ELN) منشیات کے کاروبار میں ملوث ہیں یا نہیں۔“ البتہ ضرور ہے کہ منشیات پیدا کرنے والوں کے تحفظ اور ان سے وصول کئے جانے والے عیسوں کی مد میں ملنے والی رقم گوریلوں کی آمدنی کا ایک حصہ ہے۔

تاہم امریکی امداد سے سب سے زیادہ فائدہ اٹھانے والی کولمبیا کی فوجی منشیات کے کاروبار میں ملوث ہے اس کے ساتھ ساتھ اس کے بیرونی فوڈرز کے ساتھ بھی نہایت گہرے روابط ہیں جو کہ منشیات کے کاروبار اور منشیات پیدا کرنے والوں کے تحفظ میں پوری طرح ملوث ہے۔ نومبر 1998ء میں فورٹ لاڈرڈیل فلوریڈا اترنے والے کولمبیا ایئر فورس کے مال بردار ہوائی جہاز سے 639 پاؤنڈ وزنی کوکین برآمد ہوئی۔ 1996ء میں کولمبیا ایئر فورس کے افسروں نے اس وقت کے صدر اریسلو ساسپرا کے زیر استعمال ہوائی جہاز کے ذریعہ ہیروئن امریکہ سگل کرنے کی کوشش کی۔ کائنات انتظامیہ کے ایک سینئر افسر نے خود ساسپرا پر منشیات کے کاروبار میں ملوث ہونے کا الزام لگایا تھا۔

جیسا کہ 1999ء میں سینٹر پیٹرک لیہائی نے کولمبیا کے حوالے سے بات کرتے ہوئے اس جانب اشارہ کیا تھا کہ ”جو کچھ ہم یہاں دیکھ رہے ہیں وہ یہ ہے کہ فتنہ پروروں کے خلاف پالیسی نے منشیات کے خلاف جنگ کی پالیسی کا لبادہ اوڑھ لیا ہے۔“

1994ء میں ایسنٹی انٹریٹس کی رپورٹ میں پیش کئے گئے اعداد و شمار کے مطابق 1986ء سے اب تک فوج اور اس کے بیرونی ملٹری حلیوں کے ہاتھوں کولمبیا میں 20,000 افراد ہلاک کئے جا چکے ہیں اور منشیات کی جنگ میں نہیں بلکہ اس کی وجہ ان کے سیاسی نظریات تھے۔ ان کا کہنا ہونے والوں کی اکثریت کا حلق ٹریڈ یونینز انسانی حقوق کی تنظیموں اور بائیں بازو کی قانونی تحریکوں سے تھا۔ ایسنٹی نے الزام لگایا کہ امریکہ بظاہر تو فوجی آلات اور ہتھیار

مخفیات کے خلاف جنگ کے لیے فراہم کر رہا ہے مگر حقیقت میں یہ کولمبیا کی فوج کے لیے ہیں تاکہ وہ ان کے ذریعہ ”سرکشوں کی سرکوبی“ کے نام پر اس قسم کے سنگین اور خونی جرائم کرے۔ میکسیکو کی طرح یہاں فراہم کی جانے والی امداد بھی کانگریس کے انسانی حقوق کے قوانین کی سرینا خلاف ورزی ہے۔ بیٹا گون کانگریس کی ان پابندیوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ 1997ء میں فارن آپریشنز کے ایوان کی سب کمیٹی نے سیکرٹری خارجہ میڈلین البرائٹ کو خط لکھا کہ ”پیرامٹری گروپوں کے بڑھتے ہوئے جرائم یا سکیورٹی فورسز (حقیقت میں کولمبیا کی باقاعدہ فوج) کی جانب سے ماورائے عدالت ہلاکتوں، اغواء، تشدد، سیاسی قتل اور انسانی حقوق کی پامالی کی دیگر کارروائیوں کے خلاف کولمبیا کی حکومت کی کوششیں تسلی بخش نہیں ہیں کہ ان کی بنیاد پر ایک کروڑ ڈالر کی فوجی امداد فراہم کی جائے اور اس جان لیوا امداد کا سلسلہ جاری رکھا جائے۔“

تاہم یہ مہلک امداد جاری ہے۔ امریکہ کا خیال ہے کہ کولمبیا کے فتنہ پرور اگر برسرِ اقتدار آ گئے تو یہ نیو ورلڈ آرڈر کی عالمی معیشت کے حق میں بہتر نہیں ہوگا۔

یوگوسلاویہ 1995-99ء

اپریل 1996ء میں صدر کلنٹن نے اس وقت روس کا دورہ کیا جب ماسکو اور اس کے علیحدہ ہو جانے والے صوبہ چیچنیا کے درمیان غوثی لڑائی عارضی طور پر بند ہو گئی تھی۔ یہاں ایک پریس کانفرنس میں صدر نے اعلان کیا کہ

”آپ کہتے ہیں کہ یہاں کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ہمیں اور زیادہ تنقیدی انداز اختیار کرنا چاہیے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کا دار و مدار آپ کے فیصلہ پر ہے آپ کیا سمجھتے ہیں کہ چیچنیا روس کا حصہ ہے یا نہیں؟ میں آپ کو یاد دہانی کرانا چاہوں گا کہ ہمارے ملک میں ایک خانہ جنگی ہوئی تھی جس میں ہمارے اتنے لوگ مارے گئے تھے کہ بیسویں صدی میں ہونے والی کسی جنگ میں اتنے نہیں مارے گئے اور ابراہام لنکن نے اس قول کے لیے اپنی جان دے دی تھی کہ کسی ریاست کو ہمارے اتحاد سے نکلنے کا حق نہیں۔“

تین سال بعد کلنٹن نے یوگوسلاویہ کی تہذیب و تمدن سے بھرپور زندگی کو وحشیانہ بمباری کے ذریعہ تباہ و برباد کر کے رکھ دیا کیونکہ سلو بوڈن میلو سوچ اپنے ایک صوبہ کو سودا کو دفاتی جمہوریہ یوگوسلاویہ سے علیحدہ ہونے سے روکنے کی کوششوں میں مصروف تھا اور امریکہ کو اس کا یہ عمل بے حد ناگوار گذرا تھا۔ امریکہ نے نیٹو کی چھتری تلے اس خانہ جنگی میں مداخلت کی جس کا تشدد اور دورانیہ کے ساتھ ساتھ کسی بھی حوالے سے امریکی خانہ جنگی سے کوئی مقابلہ نہیں تھا نہ ہی اس وقت دنیا بھر میں جاری ترکی، سری لنکا، انڈونیشیا، مشرقی تیمور، انگولا اور دیگر افریقی ممالک وغیرہ کے اندرونی تنازعات کے دورانیہ کے مقابلہ میں اس کی کوئی حیثیت تھی مگر کوسووا کے خلاف وسیع پیمانے پر ہونے والے سرہیا کے فرضی ظلم و زیادتی (یک طرفہ؟) نے امریکہ اور نیٹو کے مہربان رہنماؤں کے دل گلڑے گلڑے کر دیئے۔

ان لوگوں کے لیے جو یہ دلیل دیتے ہیں کہ امریکہ پوری دنیا کی حفاظت نہیں کر سکتا یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ مخصوص لوگوں کی حفاظت کیلئے امریکہ کئی برسوں سے ترکی اور انڈونیشیا کو ان کی فوجی زیادتیوں کے سلسلے میں مکمل حمایت فراہم کر رہا ہے، 1995ء میں اس نے کرنجاسربوں کی نسل کا صفایا پھیرنے میں کروشیائی مدد کی۔ ترکی نے کوسووا کے حوالے سے نیٹو کے فیصلے کو دیکھنے کرنے کی دھمکی دے دی تھی مگر اس کو یقین دلایا گیا کہ یہ پالیسی کردوں کے معاملہ میں ترکی پر کبھی بھی لاگو نہیں کی جائے گی۔

مگر امریکہ کے لیے یہ لازمی تھا کہ اس حوالے سے بعض ضروری اصول وضع کیے

جائیں۔

- 1- سرد جنگ، سوویت یونین اور دارسا پیکٹ کی غیر موجودگی میں نیٹو کا کردار نہایت اہمیت کا حامل ہے۔
- 2- اقوام متحدہ کی سکیورٹی کونسل سے اختیار حاصل کیے بغیر نیٹو کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ جہاں مرضی آئے مداخلت کرے خواہ وہ علاقہ اس کی جغرافیائی حدود سے باہر ہی کیوں نہ ہو۔
- 3- نیٹو کو نیو ورلڈ آرڈر کے فوجی ہتھیار کی حیثیت حاصل ہوگی۔ (کارپوریٹ ہیڈ کوارٹر واشنگٹن ڈی سی میں ہوگا)

یوگوسلاویہ ان اصولوں کو ماننے کے لیے تیار نہیں تھا نہ ہی سربوں نے امریکہ کے

عالمی حلیوں بلکہ تابعدار مقلدین کے کلب میں شمولیت کی حامی بھری تھی۔ زیادہ تر صنعتیں اور مالیاتی ادارے ابھی بھی ریاست کی ملکیت تھے۔ انہوں نے اپنی روزمرہ کی مہذب زبان سے لفظ ”سوشلزم“ کو ابھی تک حذف نہیں کیا تھا۔ وہ واقعی ڈانٹا سوز تھے..... انہیں بمباری کا نشانہ بنانے کے لیے تمام جواز موجود تھے سب اسباب واضح تھے ورنہ میلو سوچ کا آمر ہونا کوئی اتنا نمایاں سبب نہیں تھا یا دنیا میں کوئی واحد مثال نہیں تھی مگر پراپیگنڈہ کے لیے یہ نہایت اہمیت کا حامل تھا۔

یوگوسلاویہ جو عرصہ دراز سے اس خوف میں مبتلا تھا کہ اس پر مشرق یعنی سوویت یونین کی جانب سے حملہ ہو سکتا ہے اس کی بجائے مغرب یعنی ”آزاد دنیا“ کے حملے کی زد میں آ گیا۔ اس بمباری کے دوران سریانی وی بھی ایک اہم ہدف تھا کیونکہ جو کچھ وہ نشر کر رہا تھا امریکہ کو وہ پسند نہیں آیا تھا۔ بموں سے ٹی وی شیٹیں کے بہت سے ملازمین ہلاک ہو گئے جبکہ زندہ بچ جانے والوں میں سے ایک ملازم کی دونوں ٹانگیں کاٹ کر اسے طبع سے نکالا گیا۔

برطانوی محکمہ خارجہ کے ایک نمائندہ رابرٹ سنک کے خیال میں ”جب ایک بار آپ لوگوں کو اس لیے ہلاک کر دیتے ہیں کہ آپ کو ان کی بات پسند نہیں آئی تو آپ ہمیشہ کے لیے جنگ کے قوانین بدل دیتے ہیں۔“

اس سارے قضیہ کا سب سے خوفناک پہلو وہ مجموعی غلط فہمی ہے جس میں اچھے خاصے سمجھدار اور ذہین لوگ بھی مبتلا ہو گئے ہیں۔ وہ اس بات پر متفق ہیں کہ امریکہ اور نیٹو کی بمباری اس وقت شروع ہوئی تھی جب نسلی الہانیوں کو زبردستی کو سو سے نکالا جا رہا تھا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہہ لیں کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ بمباری ”نسلی خاتمہ“ کی اس مہم کو روکنے کے لیے کی گئی تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ لوگوں کی اتنی بڑی تعداد میں مجبوراً جلا وطنی کا آغاز بمباری شروع ہونے کے کچھ دن بعد ہوا تھا اور ظاہر ہے کہ یہ اس وحشیانہ بمباری کے خلاف رد عمل اور اپنے شدید غصے ناراضی اور لا چاری کا اظہار تھا۔

اس بات کی تصدیق کسی بھی روزنامہ کی اشاعتوں سے ہو سکتی ہے جو 23 اور 24 کی درمیانی شب سے شروع ہونے والی بمباری سے کچھ دن قبل اور کچھ دن بعد کی ہیں۔ یا پھر سب سے آسان یہ ہے کہ 26 مارچ کے نیویارک ٹائمز کے صفحہ اول کو دیکھ لیں جس کے

مطابق

”نیو کی بمباری نے جو کہ پہلے ہی شروع ہو چکی ہے پریسٹا (کوسود کا مرکزی شہر) کو گہرے خوف اور دہشت کی لپیٹ میں لے لیا ہے اور اب انتقام کے طور پر سرب اپنا غصہ نسلی البانوی شہریوں پر اتاریں گے۔“

27 مارچ کو زبردستی کی پہلی جلا وطنی عمل میں آئی۔ مگر پراپیگنڈہ کے ذریعہ وہ مؤقف اتنا پختہ کیا جا چکا تھا کہ دنیا اسی پر قائم رہی۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے چرچ کے وجود میں کس آنے کے بعد ”پاپائی معصومیت“ لوگوں کے دلوں پر نقش ہے۔

اور بھی بہت کچھ ہے

مندرجہ بالا بحث کے حوالے سے مزید یہ کہ 1950ء سے آج تک دنیا کے ہر کونے میں حکومتوں اور تحریکوں کے خلاف امریکہ کی بلا سہائے درجنوں مداخلتیں جاری ہیں۔ امریکہ کی بدمعاشیاں جو بے نقاب ہونے کی منتظر ہیں لامحدود ہیں جبکہ مصنف کے پاس وقت محدود ہے۔ امریکہ مداخلت کاری کی مشین کا نظام خود کار پائلٹ کے ہاتھ میں ہے..... دائمی امن کے لیے دائمی جنگ۔

منشیات فروش دہشت گرد تمہاری ماں کو لینے جا رہا ہے

امریکہ کے سرکاری اہلکار بائیں بازو کے گوریلوں کو منشیات کے کاروبار میں ملوث قرار دیتے ہیں خواہ ان کا اس سے کوئی تعلق ہو یا نہ ہو۔ وہ ان گوریلوں کا ”منشیات فروش دہشت گرد“ کے طور پر ذکر کرتا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ لسانی روابط ان کی بات میں پوشیدہ مطلب کی پوری طرح توضیح کرنے میں مددگار ثابت ہوتے ہوں۔

سیٹیل فورسز کے کمانڈر کرنل جان واکلینسن نے 1987ء میں ان روابط کے حوالے سے بات کرتے ہوئے کہا کہ

”اس حوالے سے امریکی عوام اور کانگریس اس تصور پر راسخ ہیں کہ گوریل منشیات فروش دہشت گرد اس کرہ ارض پر جہاں بھی ہوں ان کا مقابلہ کرنے کے لیے مدد فراہم کرنی چاہیے..... کانگریس کے

لیے یہ مشکل ہو گا کہ وہ ہمارے حلیفوں کو تربیت، مشاورت اور سلامتی کے حوالے سے امداد فراہم کرنے کے لیے ساتھ اٹھ کھڑی ہو۔ وہ چرچ اور علمی گروہ جنہوں نے لاطینی امریکہ میں فتنہ پردازوں کی حمایت کی غور کریں تو خود کو اس معاملہ میں اخلاقی حوالہ سے غلطی پر پائیں گے۔ ان سب سے بڑھ کر حقیقت یہ ہے کہ ہماری اخلاقی حیثیت پر کوئی حملہ نہیں کیا جاسکتا۔“

شکار ہونے والوں کی یاد میں عجائب گھر

گذشتہ کئی سالوں سے سرد جنگ کے قدامت پرست واشنگٹن میں مال کے نزدیک ”اشتراکیت کا شکار بننے والوں کی یاد میں عجائب گھر“ بنانے کی منصوبہ بندی کر رہے ہیں۔ کانگریس کی منظوری اور صدر کلنٹن کے دستخطوں کے ذریعہ عمارت ان کے حوالے کر دی گئی ہے یہاں رکھنے کے لیے اس پراجیکٹ کے حوالے سے تمام تحریری مواد جو اس کے منصوبہ سازوں نے تیار کیا ہے جھوٹ، پراپیگنڈہ اور تعصب پر مبنی ہے۔ مگر یہ اصل مسئلہ نہیں ہے۔ وہ بات جو میں یہاں کرنا چاہتا ہوں یہ ہے کہ ”اشتراکیت مخالفین کا شکار بننے والوں کی یاد میں عجائب گھر“ بھی بنایا جائے اور اگر یہ اول الذکر عجائب گھر کے ہمسائے میں ہو تو اس سے اچھی اور کیا بات ہوگی۔ اس عظیم الشان عمارت کو سجانے کے لیے مواد بے حساب ہے جس میں وہ تمام مداخلتیں جن کا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے اور تشدد اور دہشت گردوں کی حمایت جن کی دیگر ابواب میں تفصیل موجود ہے شامل ہے۔

انتخابات میں دخل اندازیاں

انتخابات میں مداخلت

کسی بھی غیر ملکی قومیت کے حامل فرد کا یہ عمل قطعی طور پر غیر قانونی ہوگا کہ وہ براہ راست یا کسی فرد کے ذریعہ کسی قسم کی مالی یا قیمتی اشیاء کے ذریعہ مداخلت یا واضح یا ڈھکے چھپے وعدے کرے جن کا تعلق کسی بھی سیاسی عہدہ کے لیے ہونے والے انتخابات سے ہو یا پرائمری انتخابات

..... سے
(ناٹیکل 2، ضابطہ ترمیمی ریاستہائے متحدہ (یو ایس سی اے)، سیکشن 1441 ای اے)
کانگریس کے ری پبلکن اور ڈیموکریٹک ارکان کی جانب سے غصہ اور نفرت کے اظہار کی وجہ یہ انکشاف تھا کہ چین خفیہ امدادی مہم کے ذریعہ امریکی پالیسی پر اثر انداز ہونے کی کوشش کر سکتا ہے۔

امریکہ کے پالیسی سازوں نے عرصہ دراز سے دوسرے ممالک کے انتخابات میں حسب منشاء نتائج کی خاطر بڑی بڑی رقمیں لگانا بلا شرکت غیرے اپنا حق سمجھ رکھا ہے (ان میں وہ ممالک بھی شامل ہیں جنہوں نے غیر ملکی امداد پر پابندی عائد کر رکھی ہے) اس کے علاوہ بے شمار دیگر ناجائز طریقوں سے انتخابی نظام کو تباہ و برباد کرنے کا سلسلہ جاری ہے۔ اس کا اندازہ مندرجہ ذیل واقعات و شواہد سے با آسانی کیا جاسکتا ہے۔

انتخابات اور یہ چیز جمہوریت کہلاتی ہے

کلنٹن انتظامیہ کے دوران، صدر اور دیگر سیاسی رہنماؤں نے کئی مواقع پر ان

جذبات کا ڈھنڈوار پینا اور ذرائع ابلاغ بھی نہایت فرض شناسی سے اسے دہراتے رہے کہ مغربی نصف کرہ ارض میں کیوبا واحد غیر جمہوری ملک ہے۔

آئیے ذرا اس نظریہ کا محتاط انداز میں جائزہ لیں کیونکہ اس میں نہایت دلچسپ حقائق پوشیدہ ہیں۔

1959ء سے آج تک کیوبا کے انقلاب کے پورے دور میں لاطینی امریکہ نے انسانی حقوق کی سنگین خلاف ورزیوں کی انتہا کو چھوا جن میں تشدد کی روزمرہ کارروائیاں، اغواء حکومت کے حمایت یافتہ ڈیٹھ سکواڈز کے ہاتھوں مخصوص لوگوں کی ہلاکتیں، لاچار کسانوں کا قتل عام، طلباء اور دیگر گروپوں کی بلا سبب ہلاکتیں سرفہرست تھیں۔ اس پورے عرصے کے دوران ہونے والی ان خونی کارروائیوں کے بدترین مرتکبین میں ایل سیلوڈو، گوئے، مالا برازیل، ارجنٹائن، چلی، کولمبیا، پیرو، میکسیکو، یوراگوئے، ہیٹی اور ہونڈوراس کی فوجیں اور ان کی مددگار پیرالمٹری فورسز شامل تھیں۔

کیوبا کا بدترین دشمن بھی کاسترو حکومت پر انسانی حقوق کی ان خلاف ورزیوں کا الزام عائد نہیں کر سکتا۔ اور اگر تعلیم اور صحت کی دیکھ بھال کے حوالہ سے مزید غور کیا جائے تو ان کی ضمانت اقوام متحدہ کا ”انسانی حقوق کا عالمی اعلامیہ“ اور ”انسانی حقوق کے تحفظ اور بنیادی آزادی کا یورپی کنونشن“ دونوں دیتے ہیں۔ یہی نہیں اس سارے میں تو صدر کلنٹن نے بھی اعلان کیا کہ ”دنیا کے دیگر ممالک کے مقابلہ میں کیوبا میں تعلیم اور صحت کی صورتحال بہت بہتر ہے۔“ اور پھر یہ بھی دنیا کے سامنے پوری طرح واضح ہے کہ انقلاب کے 40 سے زائد سالوں کے دوران انسانی حقوق کی پاسداری کے حوالے سے کیوبا کا ریکارڈ پورے لاطینی امریکہ میں سب سے اچھا ہے۔

اس ریکارڈ کے باوجود اگر امریکہ اس بات پر اصرار کرتا ہے کہ مغربی نصف کرہ میں کیوبا واحد ”غیر جمہوری“ ملک ہے تو ہم اس حتمی نتیجہ پر پہنچنے پر مجبور ہیں کہ یہ چیز جسے امریکہ ”جمہوریت“ کہتا ہے اس کا انسانی حقوق سے یا تو بے حد معمولی تعلق ہے یا پھر بالکل ہی کوئی واسطہ نہیں ہے۔

بلاشبہ کئی سالوں سے امریکہ کے سرکاری ایوانوں کی جانب سے کئے جانے والے فیصلوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک جمہوریت صرف انتخابات کا نام ہے جس کا انسانی حقوق، روزگار، خوراک اور پناہ گاہ کی فراہمی سے کوئی تعلق نہیں۔

گویا ایسی قوم جہاں بھوکوں، بے گھروں، بیماروں، ان پڑھ اور بے روزگاروں کا جم غفیر ہو اور جہاں تشدد کا شکار ایسے بے شمار افراد ہوں جن کے پیاروں کو حکومت کے ایماء پر غائب یا ہلاک کر دیا گیا ہو یہ کہہ سکتی ہے کہ اس کے ہاں ”جمہوریت“ ہے۔

یونانی زبان میں جمہوریت کے لغوی معنی ”عوام کی حکومت“ کے ہیں۔ جس کا مطلب وہ طرز حیات ہے جس کے مطابق عوام زندگیاں بسر کرنا چاہتے ہیں یا آسان لفظوں میں یوں کہہ لیں کہ عوام کو وہ زندگی مہیا کی جائے جو وہ گزارنا چاہتے ہیں۔ جو کچھ جمہوریت کے نام پر عوام کو مہیا کیا جا رہا ہے وہ یہ ہے کہ ہر دو یا چار سال بعد انہیں حق دیا جاتا ہے کہ وہ ایک مخصوص مقام پر جائیں اور کسی ایسے شخص کے نام کے آگے مہر لگائیں جس نے انہیں اس قابل رحم حالت سے نجات دلانے کا وعدہ کیا ہو اور وہ یہ بھی جانتے ہوں کہ وہ اپنا وعدہ کبھی بھی پورا نہیں کرے گا۔ مزید جو انہیں مہیا کیا جا رہا ہے وہ بہت تھوڑی سی آزادی ہے۔ انہیں اپنے حکمرانوں کے ”کارناموں“ پر تنقید کرنے کی آزادی ہے جو سزا کے کسی بھی قسم کے خوف کے بغیر کھلے عام معاشرہ کو اپنی انگلیوں پر نچا رہے ہیں تنقید کی تو آزادی ہے مگر ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اس بات سے قطعی طور پر لائق رہیں کہ جو کچھ ہو رہا ہے اس پر ان کی رائے کے اظہار کا کچھ اثر بھی ہوا ہے یا نہیں۔

امریکہ کی جانب سے جمہوریت کی تعریف کو اس حد تک محدود کر دینا کوئی اتفاق نہیں ہے پوری سرد جنگ کے دوران ”آزاد اور شفاف“ جماعتی انتخابات اور شہری آزادیوں کی غیر موجودگی کو بنیاد بنا کر امریکہ نے سوویت یونین اور اس کے حامیوں کو ہدف تنقید اور نفرت کا نشانہ بنایا حالانکہ ان تمام ممالک نے اپنے شہریوں کو روزگار، خوراک، صحت، تعلیم وغیرہ جیسی سہولیات کی فراہمی کے ذریعہ مقابلتا زیادہ شاندار اور بد مذہب معیار زندگی مہیا کر رکھا تھا۔ جہاں برازیل کی طرح معمول کی تشدد کی کارروائیوں اور گونے مالا کی طرح موت کے ہر کاروں کا کوئی تصور نہیں تھا۔ جبکہ دوسری طرف اس زمانہ میں سرد جنگ میں امریکہ کے حلیف تیسری دنیا کے وہ ممالک جو بقول امریکہ کے ”آزاد دنیا“ کے ارکان تھے انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کا منبع بنے ہوئے تھے، جو پولنگ بوتھ پر ووٹ ڈالنے کی 60 سیکنڈ کی جمہوریت پر ہی اترائے ہوئے نہیں تھکتے تھے، جن کے نزدیک اس سے بڑی کوئی آزادی ہو ہی نہیں سکتی کہ مخالف کورائے کے اظہار کا موقع دیا جائے مگر یہ آزادی وہ صرف یہیں تک

برداشت کر سکتے تھے اس سے آگے بڑھنے کی صورت میں خون خرابہ اور اس سے ایک قدم آگے مخالف تحریکوں کی صورت میں ڈھالنا ان کے لیے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔

قدری طور پر سرد جنگ کو جیتنے کا صرف یہ طریقہ رہ گیا تھا کہ اپنی خوبیوں کو بڑھا چڑھا کر اور خامیوں کو خوبیاں بنا کر پیش کیا جائے اور دشمن کی معمولی سی کوتاہی کا بھی اتنا پراپیگنڈہ کیا جائے کہ دنیا بھر میں وہ نفرت کا نشانہ بن کر رہ جائے۔

پس یہ وہ سارا پس منظر ہے کہ امریکی اس بات پر اتنا پختہ ایمان رکھتے ہیں کہ انتخابات کے بغیر کسی بھی معاشرہ کی ترقی ناممکن ہے۔ انہیں یہ ہی سبق بڑھایا گیا ہے کہ انتخابات اور جمہوریت ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں اور اس کا اس بات سے کوئی تعلق نہیں ہے کہ وہ خود اپنے ملک کی انتخابی سیاست کے حوالے سے کتنے لائق ہیں۔ ان میں سے چند ہی اپنے ملک کے انتخابات کے حوالے سے کسی قسم کے شک و شبہ کو دل میں جگہ دیتے ہوئے اظہار کرتے ہیں کہ آزادانہ اور شفاف انتخابات کرانا کبھی امریکہ کی خارجہ پالیسی کا بنیادی اصول ہوا کرتا تھا۔ مندرجہ بالا بحث کی روشنی میں آئیے ذرا تاریخی حقائق کا جائزہ لیں۔

فلیپائن 1950ء

اس قوم کی سیاسی زندگی میں سی آئی اے کے واضح عمل دخل بلکہ ساز باز سے کون واقف نہیں۔ ایسے انتخابات کا انعقاد جن کے نتائج پہلے ہی تیار کئے جا چکے ہوتے ہیں جن میں غلط اطلاعات کی باقاعدہ مہم چلانا امیدواروں کو بھاری رقم کی فراہمی اور ان کے لیے تقاریر تیار کرنا تو سی آئی اے کا معمول ہے اس کے ساتھ ساتھ اپنا مقصد حاصل کرنے کے ایسی ایسی گھٹیا اور شرمناک کارروائیاں کی جاتی ہیں کہ جن کی مثال ملنا مشکل ہے جیسے کہ انتخابی مہم کے دوران سی آئی اے کے حمایت یافتہ امیدوار کے مخالف کے پانی میں نشہ آور دوا ملا دی گئی تاکہ وہ عوامی جلسہ میں نشہ میں دھت نظر آئے ایک اور امیدوار کے خفیہ قتل کی منصوبہ بندی کی گئی وغیرہ وغیرہ۔

سی آئی اے نے اپنے ان مذموم مقاصد کے بہتر حصول کے لیے اور ملک کے شہریوں کا اعتماد جیتنے کے لیے ”قومی تحریک برائے آزادانہ انتخابات“ کے نام سے ایک تنظیم بھی قائم کر رکھی ہے۔ ”نیویارک ٹائمز“ نے بھی اس پر اعتماد کا اظہار کیا۔ اس نے فلیپائن کی

سیاسی اور انتخابی ترقی کی تعریف کرتے ہوئے اعلان کیا کہ ”فلپائن کو بلاوجہ ہی ایشیاء میں جمہوریت کا مثالی نمونہ قرار نہیں دیا جاتا۔“

اٹلی 1948ء سے 70ء کی دہائی

تفصیلات کے لیے باب ”مداخلتیں“ ملاحظہ فرمائیے۔

لبنان 50ء کی دہائی

سی آئی اے نے صدر کیلے شیون اور مخصوص پارلیمانی امیدواروں کو انتخابی مہم چلانے کے لیے بڑی بڑی رقمیں فراہم کیں جبکہ مزید رقمیں ان امیدواروں کے خلاف استعمال کی گئیں جنہوں نے لبنان کی سیاست میں امریکی مداخلت کی بھرپور انداز میں پذیرائی نہیں کی تھی۔

انڈونیشیا 1955ء

سی آئی اے نے اس شرط کے ساتھ مرکزی اتحاد کی انتخابی مہم چلانے کے لیے دس لاکھ ڈالر فراہم کئے کہ وہ صدر سویکارنو اور انڈونیشیا کی اشتراکی جماعت کی کسی صورت میں حمایت نہیں کریں گے۔

ویتنام 1955ء

شمالی اور جنوبی ویتنام کے اتحاد کے لیے ہونے والے انتخابات کو منسوخ کرنے کے سلسلہ میں امریکہ نے جنوبی ویتنام کی مکمل حمایت اور معاونت کی کیونکہ انہیں یقین تھا کہ شمالی ویت نام کا اشتراکی رہنما ہوچی منہ ان انتخابات میں بہت آسانی سے فتح حاصل کر لے گا۔

برطانوی گیانا 1953-64ء

دنیا کی دو قدیم جمہوریتیں امریکہ اور برطانیہ گیارہ سال تک، تین بار جمہوری طور پر منتخب رہنما چیری جکن کو اقتدار سے باہر رکھنے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔ ناجائز ہتھکنڈے اور غیر انسانی حربے استعمال کرتے ہوئے ہڑتالوں، پراپیگنڈہ اور دہشت گردی کی کارروائیوں کے ذریعہ امریکہ اور برطانیہ ہے اس مدت کے دوران دوبار جکن کو زبردستی اقتدار سے علیحدہ کرنے میں کامیاب ہوئے۔

جاپان 1958ء سے 70ء کی دہائی

سی آئی اے نے پارلیمانی انتخابات میں قدامت پرست آزاد خیال جمہوری پارٹی کی ہر نشست کے لیے کروڑوں ڈالر کی سرمایہ کاری کر کے امریکی خزانہ خالی کر دیا۔ یہ ساری جدوجہد مخالف جماعت، جاپان کی سوشلسٹ پارٹی کو کمزور کرنے اور شکست سے دو چار کرنے کے لیے تھی۔ نتیجہ کے طور پر قدامت پرست آزاد خیال جمہوری پارٹی 38 برس تک برسرِ اقتدار رہی۔ اس کے طویل اقتدار کا مقابلہ اٹلی کے کرچن ڈیموکریٹس کے اقتدار سے کیا جاتا ہے اسے بھی سی آئی اے کی سرپرستی حاصل تھی۔ ان حربوں کے ذریعہ اٹلی اور جاپان میں مستحکم کئی جماعتی نظام قائم نہیں ہونے دیا گیا۔

حکمران خارجہ کے ایک مؤرخ کے مطابق ضائع شدہ مواد 1958-60ء کے دوران جاپان میں کی جانے والی امریکی کارروائیوں پر مشتمل تھا۔

نیپال 1959ء

سی آئی اے نے خود اس بات کو تسلیم کیا کہ اس نے بی بی کوئرالہ کی خواہش پر قومی پارلیمانی انتخابات میں اس کی نیپالی کانگریس پارٹی کو فتح دلانے کے لیے لامحدود پیانے پر خفیہ کارروائیاں کیں۔ نیپالی کانگریس پارٹی نے نئی قانون ساز اسمبلی میں واضح اکثریت حاصل کر لی اور کوئرالہ وزیراعظم بن گیا۔ نیپال کی تاریخ میں ہونے والے یہ پہلے قومی انتخابات تھے اور سی آئی اے جمہوریت کے اس عظیم فرض کو کامیابی کے ساتھ پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے وہاں موجود تھی۔

لاؤس 1960ء

سی آئی اے نے فومی نوسادان کی حمایت کرتے ہوئے اپنے ایجنٹوں کے ذریعہ بیلٹ باکس بھروائے تاکہ یہاں امریکہ کی حامی حکومت قائم کی جاسکے۔

برازیل 1962ء

سی آئی اے اور بین الاقوامی ترقی کی ایجنسی نے صدر جوآؤ گولارٹ کے مخالف امیدواروں کی حمایت کرتے ہوئے وفاقی اور ریاستی انتخابات میں کروڑوں ڈالر خرچ کیے۔

صرف یہ ہی نہیں ایجنسی نے بہت سے امیدواروں کی انتخابی مہم کو ناکام کرنے کے لیے نہایت شرمناک ہتھکنڈے استعمال کیے۔

ڈومینیکن ری پبلک 1962ء

اکتوبر 1962ء میں انتخابات سے دو ماہ قبل امریکی سفیر جان بارٹلو مارٹن نے دو اہم جماعتوں کے امیدواروں سے ملاقات کی اور انہیں انگریزی اور ہسپانوی زبان میں تحریر کردہ وہ نوٹس دیا جو اس نے خود تیار کیا تھا۔ اس کے ایک حصہ کے مطابق ”آنے والے انتخابات میں نتائج سامنے آنے کے فوری بعد ناکام اور امیدوار کامیاب ہونے والے کو کھلے عام مبارکباد پیش کرے گا“ کھلے عام اسے ڈومینیکن عوام کا صدر تسلیم کرے گا اور کھلے عام اپنے حامیوں کو بھی ایسا کرنے کو کہے گا۔۔۔۔۔ عہدہ صدارت سنبھالنے سے قبل فاتح ہارنے والی جماعت کے ارکان کو اپنی کابینہ میں نشستوں کی پیشکش کرے گا۔ (ان کی مرضی ہے کہ وہ اسے قبول کریں یا مسترد کر دیں)“

امریکہ نے ڈومینیکن حکومت کے ساتھ مل کر ان 125 لوگوں کو جلا وطن کیا جو سابق آمر ٹرو جیلو کے حامی تھے اور انتخابات ہونے تک ان کے لیے وطن واپسی پر پابندی عائد کر دی گئی۔ اس کا مقصد انتخابات کے دوران صورتحال قابو میں رکھنا تھا تاکہ انتخابات اسی طرح ہو سکیں جیسا کہ مارٹن کی ہدایات تھیں۔

اور پھر حالات نے پلٹا کھایا اور انتخابات میں فتح حاصل کرنے والے جو آن بوش کا اقتدار سنبھالنے کے محض سات ماہ بعد فوجی انقلاب کے ذریعہ تختہ الٹ دیا گیا۔ جمہوریت کے منہ پر پڑنے والے اس طمانچے پر مارٹن یا کسی اور امریکی دفتر نے کسی رد عمل کا اظہار نہیں کیا۔

گوئٹے مالا 1963ء

امریکہ نے جنرل میگوئیل ڈیگوراس کی حکومت کا تختہ اس لیے الٹ دیا کہ وہ 1964ء میں اقتدار سے علیحدہ ہو کر انتخابات کرانے کی منصوبہ بندی کر رہا تھا۔ امریکہ کو یہ خوف تھا کہ اگر انتخابات ہوئے تو ان میں سابق صدر جو آن جو سے آرویلو جو کہ آزاد خیال اصلاحات پسند اور امریکی خارجہ پالیسی کا بہت بڑا نقاد تھا یقینی طور پر فتح حاصل کر لے گا۔ ڈیگوراس کی جگہ لینے والے نے انتخابات کا ذکر تک نہیں کیا۔

یولیو 1966ء

امریکہ نے آنے والے قومی انتخابات پر اثر انداز ہونے کی کوشش کرتے ہوئے صدر اپنے پیرنٹس کو 6 لاکھ ڈالر اور دائیں بازو کی کئی جماعتوں کو اس سے کچھ کم رقم فراہم کی اور وہ اپنے اس مقصد میں کامیاب رہا۔ گلف آئل نے بھی پیرنٹس کو مزید 2 لاکھ ڈالر فراہم کیے۔

جولی 1964-70ء

1964ء اور 1970ء کے قومی انتخابات اور کانگریسی انتخابات میں امریکہ نے بے حد بے حساب مداخلتیں کیں۔ 1964ء میں تو سوشلسٹ سیلواڈور ایلیڈ اس کا شکار بن گیا مگر 1970ء میں سی آئی اے کی لاکھوں ڈالر پر مبنی اور ہر قسم کے ناجائز حربوں پر مشتمل مخالفانہ کارروائیوں کے باوجود اس نے انتخابات میں فتح حاصل کر لی۔ بعد ازاں 1973ء میں ایک فوجی انقلاب کے ذریعہ اس کا تختہ الٹنے کے بعد سی آئی اے نے باقاعدہ جشن منایا۔

پرگال 1974-75ء

1974ء کے انقلاب کے بعد جب سی آئی اے نے فوجی افسروں میں سوشلسٹوں کی خوب محسوس کی تو ان کے خلاف اپنی پراپیگنڈہ مشینری کو تیز کر دیا اور ”اعتدال پسند“ امیدواروں، خاص طور پر مار یوسوریز اور اس کی نام نہاد سوشلسٹ جماعت کی حمایت میں لاکھوں ڈالر خرچ کیے۔ اس دوران انجینیئر مغربی یورپ کی سماجی جمہوری جماعتوں کو بھی سوریز کو مزید فنڈز فراہم کرنے کی ہدایات دیتی ہیں۔ یہ منصوبہ کامیاب رہا اور سوشلسٹ پارٹی کو برتری حاصل ہو گئی۔

آسٹریلیا 1974-75ء

تفصیلات کے لیے باب ”مداخلتیں“ ملاحظہ فرمائیے۔

جمیکا 1976ء

سی آئی اے نے سوشل ڈیموکریٹ مائیکل مینلی کی جانب سے دوبارہ انتخابات کے اعلان کے بعد اس کی شکست کے لیے ایک مہم چلائی جس میں اس کے خلاف غلط اطلاعات اور اسلمہ کی سرگٹنگ، مزدور طبقہ پر زیادتیوں اور اقتصادی عدم استحکام جیسے الزامات لگانے کے

ساتھ ساتھ اس کے مخالفین کو مالی امداد فراہم کی گئی اور میلے پر کئی بار قاتلانہ حملے کئے گئے مگر ان سب کارروائیوں کے باوجود وہ فتح حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

پانامہ 1984، 1989ء

1984ء میں سی آئی اے نے ایک نہایت ہی متنازعہ صدارتی امیدوار جس کا تعلق مینونل نوریکا سے تھا کی انتخابات میں فتح کے لیے بڑی رقمیں فراہم کیں۔ حزب اختلاف نے اسے ”دھاندلی“ قرار دیا مگر امریکہ نے نئے صدر کو نہایت گرجبوشی سے خوش آمدید کہا۔ 1989ء تک چونکہ نوریکا امریکہ کی آنکھوں کا تارا نہیں رہا تھا اس لئے امریکہ نے نوریکا کے امیدوار کے مخالفین کو 10 ملین ڈالر فراہم کیے اس کے ساتھ ساتھ ووٹوں پر اثر انداز ہونے کے لیے کلینڈ سٹائن ریڈیو اور ٹی وی کی نشریات کے لیے بھی کافی رقم فراہم کی گئی۔ اور جب نوریکا کا امیدوار جیت گیا تو اس موقع پر امریکہ کی جانب سے انتخابات میں دھاندلی پر اخلاقی ناراضی اور غصے کا اظہار کیا گیا۔

نکارگوا 1984، 1990ء

1984ء میں امریکہ نے سینڈیناز حکومت کی جانب سے مقررہ انتخابات کی قانونی حیثیت کو مشتبہ بنانے کی کوشش کرتے ہوئے متحدہ حزب اختلاف کو ان انتخابات میں حصہ نہ لینے کے لیے اکسایا۔ انتخابات سے چند دن قبل دائیں بازو کی بعض جماعتوں نے بھی یہ انکشاف کیا کہ امریکی سفارتکاران پر انتخابات میں حصہ نہ لینے کے لیے دباؤ ڈال رہے ہیں۔ سی آئی اے نے سینڈیناز کے قائدین میں بھی نفاق ڈالنے کی کوشش کی مگر سینڈیناز نے ان شفاف اور آزادانہ انتخابات میں بہت آسانی سے فتح حاصل کر لی جو سینکڑوں بین الاقوامی مبصرین کی نگرانی میں ہوئے تھے۔

چھ سال بعد قومی استعداد برائے جمہوریت (NED) نے جو امریکہ نے سی آئی اے کی مدد کے لیے خاص طور پر قائم کی تھی فروری میں ہونے والے انتخابات میں سینڈیناز کی شکست کے لیے لاکھوں ڈالر خرچ کیے۔ قومی استعداد برائے جمہوریت کی مدد سے نکارگوا کی حزب اختلاف یو این او منظم کی گئی اور نئی بنائی جانے والی جماعتوں اور تنظیموں نے اس اتحاد کی حمایت کی۔

کامیاب یو این او واحد سیاسی جماعت تھی جسے امریکی امداد ملی حالانکہ دیگر آٹھ مخالف جماعتیں بھی انتخابی میدان میں تھیں۔

کہنے کے لیے تو بہت کچھ ہے مگر شاید ٹکار گوا کی عوام اس تکلیف دہ حقیقت سے آگاہ ہو گئی تھی کہ سینڈی ہاؤز کی کامیابی کا مطلب امریکہ کی جانب سے ان کے خلاف مسلسل اور تباہ کن جنگ ہو گا۔

ہٹی 88-1987ء

1986ء میں ڈیلمیر کی آمریت کا خاتمہ ہونے کے بعد اسی سال ملک میں پہلے آزادانہ انتخابات کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ تاہم ہٹی کے ٹریڈ یونین کے مرکزی رہنما نے اعلان کیا کہ امریکہ بائیں بازو کو شکست سے دوچار کرنے کے لیے کارروائیاں کر رہا ہے۔ اس نے یہ بھی انکشاف کیا کہ امریکہ کی امدادی تنظیمیں دیہی علاقوں کے عوام کو آکسار ہی ہیں کہ وہ اشتراکیوں کو مکمل طور پر مسترد کر دیں۔ اسی دوران سی آئی اے مخصوص امیدواروں کی حمایت میں بھی مصروف تھی اور اس وقت تک اس حوالے سے کارروائیاں کرتی رہی جب تک سینٹ انٹیلی جنس کمیٹی نے اسے اپنی خفیہ انتخابی کارروائیاں بند کر دینے کا حکم نہیں دے دیا۔

بلغاریہ 91-1990ء اور البانیہ 92-1991ء

ان نو خیز اور کمزور جمہوریتوں کا ذرا بھی لحاظ کیے بغیر امریکہ نے ان منتخب حکومتوں کے تختے الٹنے میں نہایت اہم کردار ادا کیا۔ (تفصیلات کے لیے باب ”مداخلتیں“ ملاحظہ فرمائیے)

روس 1996ء

مارچ سے جون تک امریکی ماہرین سیاسیات کا ایک گروپ ماسکو میں بورس یلسن کی صدارتی مہم کی حمایت میں خفیہ طور پر مصروف عمل رہا۔ اگرچہ یہ امریکی آزادانہ اپنا کام کر رہے تھے مگر صدر کلنٹن کا سیاسی گروڈک مورس ان کے اور انتظامیہ کے درمیان رابطہ کا ذریعہ بنا ہوا تھا اور مارچ میں کلنٹن نے بذات خود یلسن کو بتایا کہ ”میں اس بات کی یقین دہانی چاہتا تھا کہ امریکہ جو کچھ بھی کر رہا ہے اس کے روس کی انتخابی مہم پر مثبت اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔“ بورس یلسن کا شمار عالمی آزاد منڈی کے حامیوں میں ہوتا تھا یہی وجہ ہے کہ اس نے

کامیابی حاصل کر لی۔ ماسکو میں امریکی ماہرین سیاسیات نے اپریل میں ہونے والی کنٹین یلسن ملاقات کا ایک مسودہ تیار کیا جس میں روسیوں کو کہا گیا تھا کہ وہ مغرب کا بالکل روسی اشتراکی پارٹی کی طرح ساتھ دیں اس پر یلسن کے اہم مخالف کا اصرار تھا کہ اگر وہ جیت گئے تو ایسا ہی کریں گے۔

امریکی ماہرین سیاسیات نے پیغام رسانی، پولنگ، براہ راست خط و کتابت، مجمع اکٹھا کرنے اور مختلف گردپوں پر نظر رکھنے وغیرہ جیسے عوامل کے لیے جدید ترین طریقے استعمال کیے اس کے ساتھ ساتھ ذرائع ابلاغ کو مکمل طور پر اپنے دباؤ میں رکھتے ہوئے انہیں ہدایات جاری کیں کہ وہ اشتراکیوں کے ساتھ عوامی بحث و مباحثہ پر مشتمل پروگرام نشر نہ کریں بلکہ اشتراکیوں کی خامیوں کو اجاگر کیا جائے۔ یلسن کی انتخابی مہم میں جس بات پر سب سے زیادہ زور دیا گیا وہ اشتراکیت کی مخالفت تھی۔

اشتراکیوں کے برسرِ اقتدار آنے کی صورت میں کیا صورتحال ہوگی اس حوالے سے نہایت ہی خوفناک تصویر کشی کی گئی۔ عوام کے ذہنوں میں یہ بٹھانے کی کوشش کی گئی کہ اگر انہوں نے اشتراکیوں کو منتخب کیا تو ہر جانب ظلم و تشدد اور دہشت گردی کا بازار گرم ہوگا، انتشار، افراتفری، شہری سہولیات کا خاتمہ اور یقینی طور پر سٹالن ازم کی واپسی ہو جائے گی بلکہ شاید اس سے بھی زیادہ بدترین دور کا آغاز ہو جائے۔ ذرائع ابلاغ کی جانب سے اشتراکیوں پر مکمل طور پر پابندی عائد تھی یہی وجہ ہے کہ اپنے خلاف ہونے والے ان حملوں کا جواب دینے کا کوئی ذریعہ ان کے پاس نہیں تھا۔

یلسن کی انتخابی مہم کے سلسلہ میں امریکی ماہرین سیاسیات نے جو کردار ادا کیا اس کا اندازہ اس حقیقت سے ہو سکتا ہے کہ جب وہ ماسکو پہنچے تھے تو صرف 6 فیصد رائے دہندگان یلسن کے حق میں تھے اور جب انتخابات شروع ہوئے تو دوونگ کے پہلے راؤنڈ میں اس کا اور اشتراکیوں کا 35 سے 32 فیصد کا کاٹنے دار مقابلہ تھا اور دوسرے راؤنڈ میں وہ 54 سے 40 فیصد کی واضح برتری حاصل کر کے کامیاب ہو گیا۔ ٹائم میگزین نے اعلان کیا ”جمہوریت کو فتح حاصل ہو گئی۔“

منگولیا 1996ء

قومی استعداد برائے جمہوریت (NED) نے منگولیا کی عوامی انقلابی جماعت کی حکومت (سابق اشتراکی جنہوں نے 1992ء کے انتخابات میں فتح حاصل کی) کی مخالف جماعت کو انتخابات میں ناقابل یقین فتح دلانے کے لیے کئی سال تک اس کے لیے کام کیا۔ 1996ء کے انتخابات سے پہلے کے چھ سالوں کے دوران قومی استعداد برائے جمہوریت نے اس 25 لاکھ کی آبادی والے ملک پر دس لاکھ ڈالر خرچ کر ڈالے۔ نتیجہ کے طور پر وہ تمام مخالف جماعتوں پر مشتمل ایک نیا اتحاد تشکیل دینے میں کامیاب ہو گئی جس کا نام نیشنل ڈیموکریٹک یونین رکھا گیا۔ نیوٹکنگرچ کے امریکہ کے ساتھ معاہدہ کو ادھار لیتے ہوئے قومی استعداد برائے جمہوریت نے منگولیا کے دوطروں کے ساتھ ایک معاہدہ کیا جس کے ذریعہ نجی ملکیت کے حقوق، پریس کی آزادی اور بیرونی سرمایہ کاری کی حوصلہ افزائی کا مطالبہ کیا گیا۔ منگولیا کی عوامی انقلابی حکومت پہلے ہی مغربی طرز کی معاشی اصلاحات نافذ کر چکی تھی اور اس کی وجہ سے غربت میں بے انتہا اضافہ اور اشتراکی سماجی تحفظ کی چار دیواری بہت حد تک مسمار ہو چکی تھی۔ اس کے باوجود نئی حکومت نے اصلاحات کی رفتار تیز کرنے اور جائیدادوں کی نجکاری کا وعدہ کیا۔ وال سٹریٹ جرنل پر تو شادی مرگ کی کیفیت طاری ہو گئی اور اس کیفیت میں اس وقت اور زیادہ اضافہ ہو گیا جب ریاستی جائیدادوں کی فروخت کا اعلان کیا گیا۔ اخبار نے اس حوالے سے ادارہ شائع کیا جس کا عنوان تھا ”بے عقلوں کی دانائی۔“ اس نئی حکومت سے امریکہ کو قومی امید تھی کہ یہ منگولیا کی عوامی انقلابی حکومت کے مقابلہ میں امریکی تجارتی اداروں اور خفیہ ایجنسیوں کا نہایت کھلے دل اور گرجوئی سے استقبال کرے گی اور واقعی 1998ء تک نیشنل سیکورٹی ایجنسی نے چینی فوج کی خبر رسانی میں رکاوٹیں پیدا کرنے کے لیے منگولیا سے باہر جدید ٹیکنالوجی سے مزین اڈے قائم کر لیے تھے جن کا کام چینی فوج کے پیغامات سننا بھی تھا۔ جبکہ منگولیا کی خفیہ ایجنسی چین میں جاسوسی کے لیے خانہ بدوشوں کو استعمال کر رہی تھی۔

بوسنیا 1998ء

کارلوس ویسٹمنڈ روپ کی وجہ سے بوسنیا باقاعدہ طور پر امریکہ کے زیر انتظام آ گیا

تھا۔ کارلوس ویسلٹز روپ ہسپانوی سفارتکار تھا جسے امریکہ نے اپنے احکامات کے نفاذ کے لیے یہاں تعینات کیا تھا۔ 1995ء کے ”ڈیٹن امن معاہدہ“ کی رو سے وہ نوآباد کارگورنر جنرل کی حیثیت رکھتا تھا۔ ستمبر کے انتخابات سے قبل اس نے 14 کروٹین امیدواروں کے انتخاب لڑنے پر پابندی عائد کر دی تھی اور اس کی وجہ ہمسایہ ملک کروشیا کے ریاستی ٹیلی ویژن کی مبینہ طور پر تعصب پر مبنی نشریات کو قرار دیا گیا جو بوسنیا میں بھی دکھائی جا رہی تھی۔

انتخابات کے بعد ویسلٹز روپ نے جمہوریہ بوسنیا و ہرزیگووینا کے منتخب صدر کو اس الزام کے تحت فارغ کر دیا کہ اس کی وجہ سے ملک عدم استحکام کا شکار ہو رہا ہے۔ اس سارے پس منظر میں انہیں جو امریکہ اور دیگر مغربی طاقتوں کی خواہشات کے عین مطابق کام کر رہے تھے ”اعتدال پسند“ کے خطاب سے نوازتے ہوئے اقتدار میں شامل رہنے اور اپنا کام جاری رکھنے کی اجازت دی گئی جبکہ وہ جو مخالف نظریات کے حامل تھے انہیں تنہا اور بنیاد پرست قرار دیتے ہوئے ان کے ساتھ بالکل برعکس رویہ اختیار کیا گیا۔ جب مئی 1997ء میں ویسلٹز روپ کو بوسنیا میں ”اعلیٰ نمائندہ“ کے عہدہ کے لیے منتخب کیا گیا تو لندن کے گارڈین نے لکھا کہ ”امریکی سیکرٹری خارجہ میڈلین البرائٹ نے اس انتخاب کو بے حد سراہا ہے جبکہ بعض نقادوں کو پہلے سے ہی یہ خدشہ ہے کہ مسٹر ویسلٹز روپ بہت کمزور ثابت ہوگا اور جلد ہی امریکہ کے لیے ناکارہ شے بن جائے گا۔“

انتخابات کے ساتھ امریکی معاشرے کے مزید ثبوت

کئی ایسے واقعات بھی ہیں جن میں امریکہ نے (شاید) انتخابات میں تو مداخلت نہیں کی مگر بعد میں ان ممالک کی جمہوری طور پر منتخب حکومتوں کے تحفے اٹھانے میں اہم ترین کردار ضرور ادا کیا۔ مثال کے طور پر 1953ء میں ایران، 1954ء میں گوئے مالا، 1960ء میں کنگو، 1961ء میں انیکوڈور، 1964ء میں بولیویا، 1967ء میں یونان اور 1987ء میں فجی اس کا شکار بنے۔ جبکہ دیگر بہت سے ممالک میں امریکی مداخلت کارپوں کے باعث طویل عرصے کے وقفوں کے بعد انتخابات ہوئے۔ ایران، جنوبی کوریا، گوئے مالا، برازیل، کنگو، انڈونیشیا، چلی اور یونان وغیرہ اس کی واضح مثالیں ہیں۔

قومی استعداد برائے جمہوریت

کتنے امریکی ہیں جو قومی استعداد برائے جمہوریت (National Endowment for Democracy) سے واقف ہو گئے؟ یہ ایک ایسی تنظیم ہے جو اپنے نام کے برعکس کام کرتی ہے۔ 70ء کی دہائی کے آخر میں سی آئی اے کی کارروائیوں کے حوالے سے خوفناک حقائق منظر عام پر آنے کے بعد 80ء کی دہائی کے آغاز میں صدر ریگن کی سربراہی میں اس کا قیام عمل میں آیا۔ 70ء کا عشرہ بعض واقعات کی بناء پر بے حد نمایاں رہا یہی وجہ ہے کہ واٹر گیٹ، سینٹ کی چرچ کمیٹی، ایوان کی پائیک کمیٹی اور صدر کا منظم کردہ راک فیٹر کمیشن سب کے سب مل کر سی آئی اے کے خلاف تحقیقات میں مصروف تھے۔ ہر نئے دن کے ساتھ سی آئی اے کی کسی نہ کسی خوفناک کارروائی کا انکشاف ہو رہا تھا یہاں تک کہ بحرمانہ سرگرمیوں کا بھی جن میں سی آئی اے کئی سالوں سے ملوث تھی۔ انجینی کی بدنامی میں اضافہ ہو رہا تھا اور اس حوالے سے مقتدر طبقہ کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔

اس سلسلہ میں کچھ تو کرنا ہی تھا اور جو کچھ کیا گیا وہ ان خرافات کو روکنے کے لئے ہرگز نہیں تھا۔ جو کچھ کیا گیا وہ یہ تھا کہ بہت سے ناپسندیدہ کاموں اور ناجائز کارروائیوں کی انجام دہی ایک نئی تنظیم کے سپرد کر دی گئی جس کا نام سماعت کے لیے خاصا خوشگوار تھا اور بے حد سوچ سمجھ کر رکھا گیا تھا۔ قومی استعداد برائے جمہوریت منصوبہ یہ تھا کہ قومی استعداد برائے جمہوریت وہ تمام کارروائیاں جو سی آئی اے کئی دہائیوں سے خفیہ طور پر کر رہی تھی کھلے عام کرے گی اور اس طرح اپنی خفیہ کارروائیوں کی وجہ سے سی آئی اے کے ماتھے پر جو بدنامی کا داغ لگ چکا تھا وہ مٹ جائے گا۔ یہ سیاست، تعلقات عامہ اور ریاکاری کا حیرت انگیز نمونہ تھا۔

پس یہ ہے وہ ساری داستان جو 1983ء میں قومی استعداد برائے جمہوریت کے قیام کا باعث بنی جس کا مقصد ”نجی اور غیر سرکاری دنیا بھر میں جمہوری اداروں کی حمایت اور تحفظ کے لیے جدوجہد“ کرنا تھا۔ ذرا ”غیر سرکاری“ پر توجہ فرمائیے۔ اس کا مقصد سوائے بہترین تاثر پیش کرنے اور اسے دیومالائی تنظیم ثابت کرنے کے کچھ نہیں تھا۔ کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ اس تنظیم کے فنڈز کے لیے پائی پائی تک وفاقی حکومت کی جانب سے آتی تھی۔ اس کا ثبوت اس کے مالیاتی تخمینے کی سالانہ رپورٹیں ہیں۔ قومی استعداد برائے جمہوریت خود کو غیر سرکاری تنظیم کی حیثیت سے متعارف کرانا پسند کرتی ہے کیونکہ اس طریقہ سے دنیا بھر میں جو اس کی سہاگہ بن سکتی ہے وہ امریکہ کی سرکاری ایجنسی ہونے کی صورت میں ہرگز نہیں بن سکتی۔

ایلن وینسین نے جو قومی استعداد برائے جمہوریت کے قیام کے وقت اس کے آئین سازوں میں شامل تھا 1991ء میں بڑی صاف گوئی سے کہا کہ ”آج ہم جو کچھ کر رہے ہیں سی آئی اے پچیس سال قبل یہی سب کچھ خفیہ طور پر کر چکی ہے۔“ حقیقت یہ ہے کہ سی آئی اے قومی استعداد برائے جمہوریت کے ذریعہ اپنے کالے دھن کو سفید بنا رہی ہے۔

قومی استعداد برائے جمہوریت بنیادی طور پر جن چار اداروں کو فنڈز مہیا کرتی ہے بین الاقوامی جمہوری ادارہ، قومی جمہوری ادارہ برائے بین الاقوامی مسائل، ایک اے ایف ایل سی آئی او کا منظور شدہ ادارہ (بین الاقوامی مزدوروں کے استحکام کے امریکی ادارہ کی طرز کا ادارہ) اور ایک جیمبر آف کامرس کا منظور شدہ ادارہ نجی ملکیت کے بین الاقوامی مرکز کی طرز کا ادارہ۔ یہ ادارے قومی استعداد برائے جمہوریت سے حاصل ہونے والے فنڈز امریکہ اور دنیا بھر کے دیگر اداروں کو مہیا کرتے ہیں جو دوسری تنظیموں میں یہ فنڈز تقسیم کرتے ہیں۔

قومی استعداد جمہوریت جن بے شمار طریقوں سے دنیا بھر کے ممالک کے اندرونی معاملات میں مداخلت کر رہی ہے۔ ان میں فنڈز کی فراہمی، تکنیکی امداد، تربیت، تعلیمی مواد، کمپیوٹرز، فیکس مشینیں، فوٹو کاپی کی مشینیں، گاڑیاں اور ایسی کئی سہولیات کی فراہمی شامل ہے اور یہ سب کچھ مخصوص سیاسی گروہوں، شہری تنظیموں، مزدور یونینوں، مخالف تحریکوں، طلباء گروپوں، کتابوں کے اشاعتی اداروں، اخبارات اور دیگر ذرائع ابلاغ کو مہیا کیا جاتا ہے۔ قومی استعداد برائے جمہوریت اس بنیادی فلسفہ کے تحت کام کرتی ہے کہ کارکن طبقہ اور دیگر شہریوں کی بہترین خدمت یہ ہے کہ انہیں کام کرنے کی کھلی آزادی، طبقاتی تعاون، اجتماعی سودا کار معیشت

میں حکومت کی کم از کم مداخلت اور کسی بھی شکل میں سوشلزم کی مخالفت پر مبنی نظام مہیا کیا جائے۔ آزاد معیشت جمہوریت کے مساوی ہے جس کے لیے اصلاحات ترقی اور بیرونی سرمایہ کاری ضروری ہے۔

1994ء سے 1996ء کے دوران قومی استعداد برائے جمہوریت نے امریکن انسٹیٹیوٹ فار فری لیبر ڈویلپمنٹ کو مجموعی طور پر 25 لاکھ ڈالر پر مشتمل 15 گرانٹس مہیا کیں سی آئی اے اس ادارہ کے ذریعہ کئی دہائیوں تک ترقی پسند مزدور یونینوں کو تباہ و برباد کرتی رہی تھی۔ یہ تنظیم تیسری دنیا کی یونینوں کے لیے قومی استعداد برائے جمہوریت کے اوپر بیان کردہ بنیادی فلسفہ کے مطابق کام کر رہی ہے۔ قومی استعداد برائے جمہوریت کی جانب سے 1996ء میں اس تنظیم کو جن مقاصد کے لیے گرانٹ فراہم کی گئی تھی ان میں سے ایک ”یونین مینجمنٹ کارپوریشن“ کا قیام بھی تھا۔ بظاہر تو یہ سادہ سی بات لگتی ہے لیکن قومی استعداد برائے جمہوریت کی سادہ نظر آنے والی باتیں اپنے اندر خفیہ ہدایات لیے ہوئے ہوتی ہیں جیسے اس یونین مینجمنٹ کارپوریشن کے قیام کا اصل مطلب یہ تھا کہ ”مزدوروں میں پائی جانے والی بے چینی کو اسی طرح رکھو..... موجودہ صورتحال کو تبدیل نہ کرو۔“ قومی استعداد برائے جمہوریت اور امریکن انسٹیٹیوٹ فار فری لیبر ڈویلپمنٹ کا آپس میں وہی تعلق ہے جو سی آئی اے اور قومی استعداد اور برائے جمہوریت کا ایک دوسرے سے ہے۔

قومی استعداد برائے جمہوریت نے دائیں بازو کی اور مرکزی مزدور تنظیموں کو ان تنظیموں کے خلاف کام کرنے کے لیے امدادی رقوم فراہم کیں جو مزدوروں کے حق میں جنگی بنیادوں پر کام کر رہی تھیں۔ یہ کارروائی فرانس، پرتگال، سپین اور دیگر کئی ممالک میں کی جا چکی ہے۔ 84-1983ء کے عرصہ کے دوران قومی استعداد نے فرانس میں ٹریڈ یونین کی طرز کی طلباء اور پروفیسروں کی تنظیم کو پروفیسروں کی بائیں بازو کی تنظیموں کے خلاف کام کرنے کے لیے فنڈز مہیا کیے۔ اس سلسلہ میں سیمینارز کرائے گئے، پوسٹرز، کتابیں اور پمفلٹس شائع کرائے گئے جو معنی خیز مخالفانہ نعروں پر مشتمل تھے مثلاً ”تباہی و بربادی اور علم الہی کا انقلاب“ اور ”غیر جانبداری یا آزادی“ (یہاں غیر جانبداری سے مراد سرد جنگ کے دوران غیر جانبدارانہ پالیسی اپنانے کے حوالے سے ہے)

قومی استعداد برائے جمہوریت کی 98-1997ء کی کارروائیوں میں سے ایک

وفاقی جمہوریہ یوگوسلاویہ میں وفاقی اور مقامی سطح پر نجی شعبہ کی ترقی میں حائل رکاوٹوں کا اندازہ کرنا اور اس حوالے سے قانونی تبدیلیاں کرانا..... (اور) نجی شعبہ کی ترقی کے لیے حکمت عملیوں کا تعین کرنا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ قومی استعداد نے یوگوسلاویہ کے صدر سلو یوڈن میلو سوچ کے نقادوں کو ایک سال تک امدادی رقوم مہیا کیں۔

مختصر یہ کہ قومی استعداد برائے جمہوریت کے تمام پروگرام نیو ورلڈ کی عالمی معیشت کے بنیادی مقاصد اور ضروریات کے تقاضوں کے عین مطابق ہیں اور امریکہ کی خارجہ پالیسی کی طرح وسیع پیمانوں پر کئی سالوں سے جاری ہیں۔

1984ء میں اس وقت ایک متنازعہ صورتحال سامنے آئی جب قومی استعداد کی امدادی رقوم سی آئی اے اور مینٹل نوریکا کے حمایت یافتہ پانامہ کے ایک صدارتی امیدوار کے لیے استعمال کی گئیں۔ اس پر کانگریس نے قانون نافذ کیا جس کے ذریعہ اقتدار کے امیدواروں کی انتخابی مہم کے لیے قومی استعداد برائے جمہوریت کی امدادی رقوم کے استعمال پر پابندی عائد کر دی گئی۔ مگر اس قسم کی پابندیوں کو جمل دینے کے بے شمار طریقے ہیں جیسے کہ امریکہ کے انتخابات میں ”ہارڈ منی“ (Hard-Money) اور ”سوفٹ منی“ (Soft Money) کی اصلاحات اخذ کر لی گئی ہیں۔

جیسا کہ اس سے قبل ابواب ”انتخابات“ اور ”مداخلتیں“ میں وضاحت کی گئی ہے کہ قومی استعداد برائے جمہوریت نے 1990ء میں ٹکارا گوا اور 1996ء میں منگولیا کے انتخابات میں جوڑ توڑ کر کے حسب منشاء نتائج حاصل کیے اور 1990ء میں بلغاریہ اور 1991ء اور 1992ء میں البانیہ کی منتخب جمہوری حکومتوں کے تختے الٹنے میں اہم کردار ادا کیا۔ 1990ء کے اواخر میں قومی استعداد بینی میں دائیں بازو کے گروپوں کی حمایت میں مصروف تھا جو سابق صدر جیم برٹنڈ آرلسائیڈ اور اس کے ترقی پسند نظریات کے خلاف متحد ہو گئے تھے۔ قومی استعداد نے دنیا کے بے شمار ممالک کے انتخابی سیاسی عمل میں بری طرح اثر انداز ہو کر کھلے عام اپنے وجود کا احساس دلایا۔

قومی استعداد نے دنیا کو باور کرا رکھا ہے کہ وہ صرف ان لوگوں کو جمہوریت اور انتخابات کی الف بے سکھا رہی ہے جو ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتے مگر مندرجہ بالا پانچ ممالک کے بارے میں کیا خیال ہے؟ جہاں پہلے بھی کئی بار آزادانہ اور شفاف انتخابات ہو

چکے تھے۔ قومی استعداد کے نقطہ نظر کے مطابق مسئلہ یہ ہے کہ ان انتخابات میں ان سیاسی جماعتوں نے کامیابی حاصل کی۔ جن کا شمار قومی استعداد کی پسندیدہ جماعتوں میں نہیں ہوتا تھا۔

قومی استعداد کے مطابق ”حزب اختلاف کی تشکیل“ اور ”کثرت وجود کی حوصلہ افزائی“ اس کے اہم ترین فرائض میں شامل ہے۔ قومی استعداد کی پروگرام افسر لوئز اکون کے مطابق ”ہم ان لوگوں کی حمایت کرتے ہیں جنہیں ان کے سیاسی نظام میں کوئی اہمیت حاصل نہیں ہوتی۔“ مگر قومی استعداد نے میکسیکو ایل سیلوا اور گوئے مالا نکاراگوا یا مشرقی یورپ اور کسی حد تک امریکہ میں بھی ترقی پسند یا دائیں بازو سے تعلق رکھنے والے مخالفین کو امداد فراہم نہیں کی حالانکہ ان گروپوں کو اپنی آواز حکومت کے ایوانوں تک پہنچانے اور سیاسی نظام میں اپنی اہمیت منوانے کے لیے امدادی رقوم کی اشد ضرورت تھی۔ ہاں البتہ کیوبا کے مخالف گروپوں اور ذرائع ابلاغ کی دل کھول کر مدد کی گئی۔

جمہوریت کے حوالے سے قومی استعداد کی خدمات جاری ہیں مگر ان کے خیال میں اس کا بہترین پیمانہ سیاسی انتخابی جمہوریت ہے معاشی جمہوریت نہیں۔ اگر کیوبا جیسے کسی ملک کا معاملہ نہ ہو تو حکمرانوں کے لیے اقتدار کے اور ان کی حکومتی کارروائیوں کے حوالے سے بھی خطرہ کی کوئی بات نہیں۔

قومی استعداد نے 80ء کی دہائی میں ایران۔ کونٹراکس میں بھی نہایت اہم کردار ادا کیا۔ اس نے آلیور تارتھ کے بااثر جمہوریت پراجیکٹ نیٹ ورک کو امداد فراہم کی جس نے امریکی خارجہ پالیسی کو آزاد کیا، جنگ ٹھوکی، ہتھیاروں اور منشیات کی دوز شرع کی اور اسی قسم کی دیگر کارروائیاں انجام دیں۔ ایک موقع پر وائٹ ہاؤس کے ترجمان نے بیان دیا کہ ”قومی استعداد برائے جمہوریت والے جمہوریت پراجیکٹ چلا رہے ہیں۔“ یہ غلط بیانی تھی اگر یہ کہا جاتا تو زیادہ درست ہوتا کہ قومی استعداد جمہوریت پراجیکٹ کا عوامی ہتھیار ہے کیونکہ تارتھ خود تو خفیہ طور پر کارروائیاں کرتا ہے۔ کسی بھی موقع پر یہ بیان کسی نئے تنازعہ کو جنم دے سکتا تھا۔ اگر ایسا ہو جاتا تو پھر وہی ہوتا جو پہلے بھی ہوتا رہا ہے۔ یہ انکشاف کیا جاتا کہ اس غیر محتاط کارروائی کے پیچھے سی آئی اے تھی۔

قومی استعداد نے 80ء کی دہائی کے وسط میں فلپائن میں بائیں بازو کی بغاوت

سے نمٹنے کے لیے چوکھی مہم چلاتے ہوئے بے شمار نجی تنظیموں کو امدادی رقوم فراہم کیں جن میں یونین اور ذرائع ابلاغ بھی شامل تھے۔ یہ قومی استعداد کی تشکیل سے قبل کی سی آئی اے کی مخصوص کارروائی کی ہو بہو نقل تھی۔

1990ء اور 1992ء کے دوران قومی استعداد نے ٹیکس کی ادائیگی کرنے والوں کی رقم سے ڈھائی لاکھ ڈالر کیون بن۔ امریکن نیشنل فاؤنڈیشن کے انتہائی جنونی کاسٹرو مخالف میامی گروپ کو فراہم کیے۔ کیون بن امریکن نیشنل فاؤنڈیشن نے جواب میں جدید دور کے نہایت سفاک دہشت گرد لوئیس پوساڈا کی ریلز کو سرمایہ فراہم کیا۔ یہ وہی لوئیس کی ریلز تھا جس نے 1976ء میں کیوبا کا ایک ہوائی جہاز تباہ کیا تھا جس میں 73 افراد ہلاک ہوئے تھے۔ 1997ء میں ہوانا کے ہونٹوں میں ہونے والے بم دھماکوں میں بھی وہ ملوث تھا۔

سی آئی اے کی طرح قومی استعداد برائے جمہوریت کا بھی یہی حال ہے کہ پہلے جو کچھ کرتی ہے اسے جمہوریت کی حمایت قرار دیتی ہے اور جن حکومتوں اور تحریکوں کو شکار بناتی ہے اس کی وجہ عدم استحکام کو قرار دیتی ہے۔

اقوام متحدہ میں امریکہ بمقابلہ دنیا

نصف صدی سے زیادہ عرصہ سے ہمیں یہ باور کرایا جا رہا ہے کہ امریکہ ”آزاد دنیا“ کا قائد ہے۔ اگر واقعی ایسا ہے تو پھر یہ سوال کرنا یقیناً مناسب ہو گا کہ اس کے ماننے والے کہاں ہیں؟ کیا اس بات کا کوئی ثبوت ہے کہ امریکہ دنیا کی حکومتوں اور رہنماؤں کی اکثریت پر اپنے زر خرید گوریلوں کی بجائے اپنے عالمی نظریہ کی خوبیوں کے ذریعہ اثر انداز ہو رہا ہے؟ وہ جذبہ ستائش اور وفاداری کہاں ہے جو عام طور پر ایک دانشمند اور نیوکار قیادت کے ذریعہ وجود میں آتا ہے؟

کوریاء، ویتنام، افغانستان، خلیج فارس اور یوگوسلاویہ کے خلاف جنگوں میں حمایت حاصل کرنے کے لیے امریکہ نے رشوت، دھمکیوں اور ہیرا پھیری کا سہارا لیا۔ اقوام متحدہ میں یہ حال ہے کہ اکثر معاملات میں امریکہ اکثر ہی اکیلا پایا جاتا ہے اور پھر جنرل اسمبلی کی قراردادوں کی مخالفت کرنے کے لیے دیگر ایک یا دو ممالک کو اپنے ساتھ ملا لیتا ہے اور دعویٰ ہمیشہ کیا جاتا ہے کہ یہ مخالفت انسانی حقوق، امن، ایٹمی ہتھیاروں میں کمی، معاشی انصاف اور دیگر ترقیاتی مقاصد کے حصول کے لیے اور جنوبی افریقہ کی بے اعتنائیوں اور ظلم و ستم اور اسرائیل کی جانب سے لاقانونیت کے مظاہروں کے خلاف کی جا رہی ہے۔

مندرجہ ذیل گوشواروں کے ذریعہ امریکی کردار کی اصلیت سامنے لانے کی کوشش کی گئی جن سے یقیناً ان امریکی دعوؤں کی حقیقت کھل کر سامنے آ جائے گی۔

1978ء سے 1987ء تک دس سال کی مدت کا احاطہ کرتے ہوئے اسے ادوار کے

اعتبار سے مندرجہ ذیل تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

1978-81ء: جنرل اسمبلی کی تمام تر رائے شماریوں کا جائزہ لیا گیا، اس حصہ میں وہ قراردادیں

پیش کی گئی ہیں جن کی صرف امریکہ نے مخالفت کرتے ہوئے نفی میں ووٹ ڈالا یا پھر اس سلسلہ میں دیگر ایک دو ممالک کو اپنے ساتھ ملا لیا۔

83-1982ء: جنرل اسمبلی کی تمام تر رائے شماریوں کا جائزہ لیا گیا، اس حصہ میں وہ قراردادیں پیش کی گئی ہیں جن کی صرف امریکہ نے مخالفت کی اور نفی میں ووٹ ڈالا۔

87-1984ء: اس حصہ میں جنرل اسمبلی کی منتخب قراردادوں کو نمونہ کے طور پر پیش کیا گیا ہے تاکہ بنیادی تضادات کا اندازہ ہو سکے۔

مجموعی طور پر یہاں تقریباً 150 مثالیں پیش کی گئی ہیں۔ وہ قراردادیں جن سے امریکہ اجتناب کرتا رہا یہاں پیش نہیں کی گئیں۔ اس عرصہ کے دوران ایسی کئی قراردادیں بھی ہیں جن کی مخالفت میں صرف اسرائیل نے ”نفی میں ووٹ ڈالا اور امریکہ اس سے بالکل علیحدہ رہا۔“

سلامتی کونسل اور اقتصادی و سماجی کونسل کی قراردادوں پر ہونے والی رائے شماری کو یہاں شامل نہیں کیا گیا مگر یہ بھی جنرل اسمبلی کی رائے شماری سے مختلف نہیں۔ سلامتی کونسل میں اکیلے امریکہ کا ہی مخالفت میں ڈالا گیا ووٹ کسی بھی معاملہ کو شکست سے دوچار کرنے کے لیے کافی ہے۔

1983ء میں گریناڈا پر امریکی جارحیت کی تقریباً پورے لاطینی امریکہ میں شدید مذمت کی گئی جبکہ صرف چلی، گوئے مالا اور یوراگوئے کی آمرانہ حکومتوں نے اس کی حمایت کی۔ اقوام متحدہ نے بھی ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے اکثریت کے ساتھ اسے نامنظور کر دیا جس پھر صدر ریگن نے شدید رد عمل کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ”مجھے اس بات سے قطعی کوئی فرق نہیں پڑتا کہ جو کچھ ہم کر رہے ہیں اس سے اقوام متحدہ کے 100 رکن ممالک کو اتفاق نہیں ہے۔“

اشتراکیوں کے ایک کرتا دھرتا کا کہنا ہے کہ ہمیں ہمیشہ یہ بتایا گیا ہے کہ وہ عالمی رائے کو کبھی خاطر میں نہیں لاتے۔

..... رائے عامہ کا احترام کرنا اولین ترجیحات میں شامل ہے.....

(امریکہ کی آزادی کا اعلامیہ)

تاریخ اجراء قرار داد نمبر ہاں۔ نہیں دوٹ

1978ء

- 15 دسمبر 33/75 2-119 (امریکہ، اسرائیل)
 سلامتی کونسل نے اپنے مستقل ارکان پر بطور خاص زور دیا کہ بین الاقوامی امن اور سلامتی سے متعلق اقوام متحدہ کے تمام فیصلوں پر بطور خاص اقدامات اٹھائے جائیں۔
- 18 دسمبر 33/10 2-10 (امریکہ، اسرائیل)
 فلسطینی عوام کی حالت زار۔
- 18 دسمبر 33/113C 3-97 (امریکہ، اسرائیل، گوسٹے مالا)
 مقبوضہ علاقوں میں اسرائیل کی جانب سے انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کی مذمت۔

- 19 دسمبر 33/136 1-119 (امریکہ)
 ترقی یافتہ ممالک سے کہا گیا کہ وہ ترقی پذیر ممالک کے ترقیاتی منصوبوں کے لیے جاری اپنی امداد میں اضافہ کرتے ہوئے اس کا معیار بہتر بنائیں۔

1979ء

- 24 جنوری 33/183M 1-136 (امریکہ)
 جنوبی افریقہ کی بے اعتنائیوں کے سبب اس سے فوجی اور ایٹمی اشتراک کا خاتمہ۔
- 29 جنوری 33/196 1-111 (امریکہ)
 ترقی پذیر ممالک کی برآمدات کا تحفظ
- 23 نومبر 34/36 1-36 (امریکہ)
 بنیادی آزادی اور انسانی حقوق کی بہتری کے لیے اقوام متحدہ کے ساتھ مل کر کوششیں کرنا۔
- 23 نومبر 34/52E 3-121 (امریکہ، اسرائیل، آسٹریلیا)
 اسرائیل کے نکالے ہوئے مقامی باشندوں کی واپسی
- 11 دسمبر 34/855J 3-120 (امریکہ، برطانیہ، فرانس)

ایٹمی ہتھیاروں کی دوڑ میں کی اور خاتمہ پر گفت و شنید

- 12 دسمبر 34/90A 2-111 (امریکہ، اسرائیل)
یہ مطالبہ کیا گیا کہ اسرائیل انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں سے اجتناب کرے۔
- 12 دسمبر 34/931 3-134 (امریکہ، برطانیہ، فرانس)
جنوبی افریقہ کی پسپائی ہوئی مظلوم عوام اور ان کی تحریک آزادی کی حمایت اور معاونت
- 14 دسمبر 34/100 2-104 (امریکہ، اسرائیل)
ریاستوں کے اندرونی و بیرونی معاملات میں مداخلت کی حمایت کی مخالفت
- 14 دسمبر 34/113 2-120 (امریکہ، اسرائیل)
مقبوضہ عرب علاقوں میں فلسطینیوں کی حالت زار پر رپورٹ تیار کرنے کی درخواست۔

- 14 دسمبر 34/133 3-112 (امریکہ، اسرائیل، کینیڈا)
فلسطینی عوام کی امداد۔

- 14 دسمبر 34/136 2-118 (امریکہ، اسرائیل)

مقبوضہ عرب علاقوں کے قومی وسائل پر اختیار دلانا

- 17 دسمبر 34/158 2-121 (امریکہ، اسرائیل)

خواتین کے حوالے سے اقوام متحدہ کی کانفرنس کی تیاری اور انعقاد

- 17 دسمبر 34/160 2-122 (امریکہ، اسرائیل)

خواتین کے بارے میں اقوام متحدہ کی کانفرنس کے ایجنڈا میں فلسطینی خواتین کی

شمولیت

- 19 دسمبر 34/199 1-112 (امریکہ)

مخالف ممالک کے مشترکہ تجارتی معاملات میں ترقی پذیر ممالک کے حقوق کا تحفظ

1980ء

- 3 نومبر 35/13E 3-93 (امریکہ، اسرائیل، کینیڈا)

بے گھر کئے جانے والوں کی واپسی کے لیے اسرائیل سے درخواست

- 5 دسمبر 35/57 1-134 (امریکہ)
پسماندہ ممالک کی ترقی اور بین الاقوامی اقتصادی تعاون میں اضافہ کے لیے نئے
بین الاقوامی اقتصادی نظام کا قیام
- 5 دسمبر 35/75 2-118 (امریکہ، اسرائیل)
فلسطینی عوام کی حالت زار کے حوالے سے اسرائیلی پالیسیوں کی مذمت
- 11 دسمبر 35/119 3-134 (امریکہ، برطانیہ، فرانس)
نوآبادیاتی ممالک اور عوام کو آزادی دینے کے اعلامیہ پر عملدرآمد
- 11 دسمبر 35/122C 2-118 (امریکہ، اسرائیل)
مقبوضہ علاقوں میں اسرائیل کی جانب سے انسانی حقوق کی خلاف ورزیاں (اسی
روز، اسی موضوع پر مزید قراردادیں بھی پیش ہوئیں۔ 35/122E 2-119 دوٹ)
- 35/122F 2-117 دوٹ)
- 11 دسمبر 35/136 3-132 (امریکہ، اسرائیل، کینیڈا)
خواتین کے حوالے سے اقوام متحدہ کے دس سالہ پروگرام کے دوسرے حصہ پر
عملدرآمد کی تصدیق
- 12 دسمبر 35/145A 2-111 (امریکہ، برطانیہ)
تمام ایٹمی تجربات کا خاتمہ
- 12 دسمبر 35/154 2-110 (امریکہ، البانیہ)
غیر ایٹمی ریاستوں کے خلاف ایٹمی ہتھیاروں کے عدم استعمال کا اعلامیہ
- 15 دسمبر 35/169C 3-120 (امریکہ، اسرائیل، آسٹریلیا)
فلسطینیوں کے حقوق۔
- 15 دسمبر 35/174 1-120 (امریکہ)
اس بات پر اصرار کہ افراد اور اقوام کی ترقی بنیادی انسانی حق ہے۔
- 16 دسمبر 35/206J 3-137 (امریکہ، برطانیہ، فرانس)
جنوبی افریقہ کی پس ہوئی مظلوم عوام اور ان کی تحریک آزادی کی حمایت اور معاونت

1981ء

- 28 اکتوبر 36/12 1-145 (امریکہ)
جنوبی افریقہ اور نمیبیا میں جاری نسلی تعصب کی مخالفت و مذمت
- 28 اکتوبر 36/13 1-124 (امریکہ)
جنوبی افریقہ کی حکومت کے ساتھ بعض ریاستوں اور بین الاقوامی کارپوریشنوں کے تعاون اور اشتراک کی مذمت۔
- 28 اکتوبر 36/15 2-114 (امریکہ، اسرائیل)
مشرقی یروشلم کے بعض علاقوں سے اسرائیلی دستبرداری کا مطالبہ
- 9 نومبر 36/18 1-123 (امریکہ)
ترقی پذیر ممالک میں باہمی تعاون کی تحریکوں کی حوصلہ افزائی (زراعت، تجارت، رہائش، خریداروں کا تحفظ، سماجی خدمات)
- 9 نومبر 26/19 1-126 (امریکہ)
کسی بھی قسم کی بیرونی مداخلت کے بغیر ہر ریاست کیلئے اپنی عوام کی مرضی کے مطابق اقتصادی و سماجی نظام کے انتخاب کا حق۔
- 13 نومبر 36/27 2-109 (امریکہ، اسرائیل)
عراقی ایٹمی تنصیب پر اسرائیلی بمباری کی مذمت
- کیم دسمبر 36/68 3-133 (امریکہ، برطانیہ، گوئے مالا)
نوآبادیاتی علاقوں میں معاشی مفادات پر مبنی غیر ملکی سرگرمیوں کی مذمت
- 4 دسمبر 36/73 2-109 (امریکہ، اسرائیل)
فلسطینی عوام کی حالت زار کے حوالے سے اسرائیلی پالیسی کی مذمت
- 9 دسمبر 36/84 2-118 (امریکہ، برطانیہ)
ایٹمی ہتھیاروں کے تمام تجربات کا خاتمہ
- 9 دسمبر 36/87B 2-107 (امریکہ، اسرائیل)
مشرق وسطیٰ میں ایٹمی ہتھیاروں سے پاک علاقہ کا قیام

- 9 دسمبر 36/92J (امریکہ کیڈا، برازیل) 3-78
ایٹلی جنگ روکنے، ہتھیاروں کی دوڑ کے خاتمے اور ہتھیاروں میں کمی کی حمایت میں
دستخط کرانے کی عالمی مہم
- 9 دسمبر 36/98B (امریکہ) 1-109
کیمیائی و حیاتیاتی ہتھیاروں پر پابندی کیلئے گفت و شنید پر اصرار
- 9 دسمبر 36/98 (امریکہ، اسرائیل) 2-101
اسرائیل کے ایٹمی ہتھیاروں کے استعمال کے خاتمے کا مطالبہ
- 10 دسمبر 36/120A (امریکہ، اسرائیل) 2-121
فلسطینیوں کے حقوق
- 10 دسمبر 36/120B (امریکہ، اسرائیل، کینیڈا) 3-119
یروشلم کی حیثیت
- 10 دسمبر 36/120E (امریکہ، اسرائیل) 2-139
تعلیم، صحت، بہتر پرورش، قومی ترقی وغیرہ کے انسانی حقوق ہونے کا اعلان۔
- 14 دسمبر 36/133 (امریکہ) 1-135
غزہ کی پٹی پر فلسطینی مہاجرین
- 16 دسمبر 36/146B (امریکہ، اسرائیل، کینیڈا) 3-121
بے دخل فلسطینیوں کیلئے ان کے گھروں کو واپسی کا حق
- 16 دسمبر 36/146C (امریکہ، اسرائیل) 2-117
فلسطینی مہاجرین کی جائیدادوں سے حاصل ہونے والے ٹیکس
- 16 دسمبر 36/146G (امریکہ، اسرائیل) 2-119
فلسطینی مہاجرین کے لیے یروشلم یونیورسٹی کا قیام
- 16 دسمبر 36/147C (امریکہ، اسرائیل) 2-111
مقبوضہ علاقوں میں اسرائیل کی جانب سے انسانی حقوق کی خلاف ورزیاں
- 16 دسمبر 36/149B (امریکہ، اسرائیل) 2-147
عالمی ابلاغ اور اطلاعات کے جدید نظام کا قیام

- 16 دسمبر 36/150 2-139 (امریکہ، اسرائیل)
بحیرہ روم کو بحر مدار سے ملانے کے لیے ایک نہر کی تعمیر کے اسرائیلی فیصلہ کی مخالفت
- 17 دسمبر 36/172C 1-136 (امریکہ)
انگولا اور دیگر افریقی ریاستوں کے خلاف جنوبی افریقہ کی جارحیت کی مذمت
- 17 دسمبر 36/172H 2-129 (امریکہ، برطانیہ)
جنوبی افریقہ کے خلاف پابندیوں کے بارے میں تجارتی تنظیموں کی بین الاقوامی کانفرنس کا انعقاد۔
- 17 دسمبر 36/172 2-126 (امریکہ، برطانیہ)
جنوبی افریقہ کے خلاف بہت سے بین الاقوامی اقدامات کی حوصلہ افزائی۔
- 17 دسمبر 36/172N 1-139 (امریکہ)
جنوبی افریقہ کے خلاف پابندیوں اور دیگر کارروائیوں کی حمایت
- 17 دسمبر 36/172O 1-138 (امریکہ)
جنوبی افریقہ کے لیے مزید بیرونی سرمایہ کاری اور قرضوں کا خاتمہ
- 17 دسمبر 36/173 2-115 (امریکہ، اسرائیل)
مقبوضہ فلسطین اور دیگر عرب علاقوں کے قومی وسائل پر مستقل اختیار
- 17 دسمبر 36/226B 2-121 (امریکہ، اسرائیل)
گولان کی پہاڑیوں کیلئے اسرائیلی قانون کی غیر موزونیت
- 18 دسمبر 36/234B 1-127 (امریکہ)
1980-1 کے لیے اقوام متحدہ کے تخمینوں کی تہدیلی
1982ء (جن قراردادوں کی صرف امریکہ نے مخالفت کی)
- 28 اکتوبر 37/7 1-111
ایکولوجی کے تحفظ کے لیے عالمی چارٹر
- 15 نومبر 37/11 1-136
ریاستی جائیدادوں، آثار قدیمہ اور قرضوں کے حوالے سے ریاستوں کے حق جانشینی

پراقوام متحدہ کی کانفرنس کا انعقاد۔

3 دسمبر 37/47 1-124
نسل پرستوں کے خلاف پابندیوں اور سزاؤں کے کنونشن کی عالمی سطح پر منظوری کی اپیل

9 دسمبر 37/69E 1-141
نسل پرستوں کے خلاف بین الاقوامی فوجی تیاریوں کی حوصلہ افزائی

9 دسمبر 37/69G 1-138
نسل پرستوں کی کھیلوں میں شمولیت کے خلاف بین الاقوامی اجلاس کی تیاری۔

9 دسمبر 37/69H 1-134
جنوبی افریقہ کے لیے مزید بیرونی سرمایہ کاری اور قرضوں کا خاتمہ

9 دسمبر 37/73 1-111
ایٹمی تجربات پر پابندی کے معاہدہ (سی ٹی بی ٹی) کی ضرورت

9 دسمبر 37/78A 1-114
امریکہ اور روس کے درمیان ایٹمی ہتھیاروں کے حوالے سے ہونے والی گفت و شنید کی مکمل رپورٹ کی فراہمی کی ان دونوں ممالک سے درخواست (روس نے اس قرارداد سے مکمل علیحدگی اختیار کیے رکھی)

9 دسمبر 37/83 1-138
خلاء میں ایٹمی ہتھیاروں کی دوڑ پر پابندی

10 دسمبر 37/94B 1-131
عالمی ابلاغ اور اطلاعات کے جدید نظام کے سلسلہ میں یونیسکو کی کوششوں کی حمایت

13 دسمبر 37/98A 1095
کیمیادی و جراثیمی ہتھیاروں پر پابندی کے لیے اجلاس کی ضرورت

16 دسمبر 37/103 1-113
نئے اقتصادی نظام کے حوالے سے بین الاقوامی قانون کے اصول و قواعد کی بہتری

17 دسمبر 37/131 1-129

اتوام متحدہ کے جوائنٹ سٹاف پٹشن بورڈ سے متعلقہ اقدامات بشمول اتوام متحدہ کے بعض ملازمین کی برطانیہ کی روک تھام۔

17 دسمبر 37/137 1-146

صحت اور ماحولیات کے لیے ضرر رساں مصنوعات کے خلاف تحفظ

18 دسمبر 37/199 1-131

تعلیم، صحت، روزگار، مناسب دیکھ بھال، قومی ترقی وغیرہ کے انسانی حقوق ہونے کا

اعلان

20 دسمبر 37/204 1-141

اقتصادی حقوق کے چارٹر اور ریاستی ذمہ داریوں کے نفاذ پر نظر ثانی کی ہدایت

21 دسمبر 37/237X1 1-132

ادیبا بابا کے مقام پر افریقہ کے لیے اقتصادی کمیشن کی مشاورت کے لیے سہولیات

21 دسمبر 37/251 1-146

پسماندہ ممالک کے توانائی کے وسائل کی ترقی

21 دسمبر 37/252 1-124

نئے بین الاقوامی اقتصادی نظام کے قیام کیلئے بین الاقوامی اقتصادی تعلقات کی

تعمیر نو

1983ء

22 نومبر 38/19 1-110

نسل پرستی کے جرم کے خلاف پابندیوں اور سزاؤں کے حوالے سے بین الاقوامی

اجلاس

22 نومبر 38/25 1-131

کسی بھی صورت میں بیرونی مداخلت کے بغیر ہر حکومت کو اپنی عوام کی مرضی کے

مطابق اقتصادی و سماجی نظام کے انتخاب کا حق ہے۔

5 دسمبر 38/39E 1-149

نسل پرستی کے خلاف مہم کے سلسلہ میں کانفرنسوں کا انعقاد اور مواد کی تشہیر

1-140

38/39I

5 دسمبر

نسل پرستی کے خلاف بطور احتجاج جنوبی افریقہ پر پابندیاں عائد کرنے کے لیے سلامتی کونسل سے اصرار

1-145

38/39K

5 دسمبر

کھیلوں میں نسل پرستوں کی شمولیت کے خلاف بین الاقوامی کنونشن کو صلاح مشورہ جاری رکھنے کا اختیار۔

1-147

38/70

15 دسمبر

پرامن مقاصد کے لیے خلاء کا استعمال ہونا چاہیے خلاء میں ہتھیاروں کی دوڑ پر پابندی۔

1-132

38/124

16 دسمبر

تعلیم، روزگار، صحت، مناسب دیکھ بھال، قومی ترقی وغیرہ کے انسانی حقوق ہونے کا اعلان

1-110

38/128

19 دسمبر

نئے عالمی معاشی نظام کے حوالے سے بین الاقوامی قانون کے اصول و قواعد کی بہتری۔

1-137

38/150

19 دسمبر

افریقہ میں ذرائع ابلاغ و آمدورفت کی دہائی

1-116

38/182

20 دسمبر

انسانیت کو تباہ کر دینے والے جدید اقسام اور نظام کے ہتھیاروں کی تیاری اور ترقی پر پابندی

1-133

38/183M

20 دسمبر

ایشی ہتھیار رکھنے والی ریاستوں کو ایشی جنگ کی روک تھام اور ہتھیاروں کی دوڑ میں کمی کے حوالے سے کیے جانے والے اقدامات کی سالانہ رپورٹیں جزل اسمبلی کو بھیجنے کی درخواست۔

20 دسمبر 38/187A 1-98
کیمیادی و جراثیمی ہتھیاروں پر پابندی کے معاہدہ کو حتمی شکل دینے کے لیے گفت و شنید کو نتیجہ خیز بنانے پر زور

20 دسمبر 38/188G 1-113
بحری ہتھیاروں کی دوڑ کے مطالعہ کی درخواست

20 دسمبر 38/188H 1-132
ہتھیاروں میں کمی اور سلامتی کے معاملات پر خود مختار کمیشن

20 دسمبر 38/202 1-126
قدرتی اور دیگر تباہ کاریوں سے مقابلہ کے لیے اقوام متحدہ کی استعداد میں اضافہ

1984ء (منتخب قراردادیں)

8 نومبر 39/9 2-134 (امریکہ، اسرائیل)

اقوام متحدہ اور عرب ریاستوں کی تنظیم میں باہمی تعاون

16 نومبر 39/14 2-106 (امریکہ، اسرائیل)

عراقی ایٹمی تخصیبات پر اسرائیلی حملے کی مذمت

23 نومبر 39/21 1-145

نسلی تعصب کے خاتمے کی کمیٹی کی رپورٹ

5 دسمبر 39/411 2-119 (امریکہ، برطانیہ)

سینٹ ہیلینا کی آزادی کے حق کا دوبارہ باضابطہ اعلان

11 دسمبر 39/49A 2-127 (امریکہ، اسرائیل)

فلسطینی عوام کے حقوق

11 دسمبر 39/49D 3-121 (امریکہ، اسرائیل، کینیڈا)

مشرقی وسطی امن کانفرنس کا انعقاد

12 دسمبر 39/62 1-125

انسانیت کیلئے تباہ کن جدید ہتھیاروں کی تیاری اور ترقی کی ممانعت

1-84	39/65B	12 دسمبر	کیسادی و جراثیمی ہتھیاروں پر پابندی
2-146 (امریکہ، برطانیہ)	39/72G	13 دسمبر	نسل پرستی کے خاتمہ کے لیے بین الاقوامی اقدامات
2-138 (امریکہ، ترکی)	39/73	13 دسمبر	سمندر کا قانون
2-120 (امریکہ، اسرائیل)	39/95A	14 دسمبر	مقبوضہ علاقوں میں اسرائیل کی جانب سے انسانی حقوق کی خلاف ورزیاں
2-143 (امریکہ، اسرائیل)	39/95H	14 دسمبر	فلسطینی میٹرز پر قاتلانہ حملوں کی مذمت اور ملزموں کے خلاف کارروائی کی ہدایت
2-94 (امریکہ، اسرائیل)	39/147	17 دسمبر	اسرائیل کی جانب سے اپنا ایٹمی مواد انٹرنیشنل ایٹمک انرجی ایجنسی کی نگرانی میں دینے سے انکار کی مذمت
1-123	39/148N	17 دسمبر	ایٹمی تجربات پر پابندی، ایٹمی ہتھیاروں کی دوڑ کا خاتمہ، ایٹمی ہتھیاروں میں تخفیف
1-141	39/151F	17 دسمبر	اقوام متحدہ کی فوجی تحقیق و ترویج کے مطالعہ کو جاری رکھنے کی درخواست
1-143	39/161B	17 دسمبر	نوآبادیاتی ممالک اور عوام کی آزادی کے اعلامیہ کی پچیسویں سالگرہ
2-146 (امریکہ، اسرائیل)	39/224	18 دسمبر	فلسطینی عوام کے لیے اقتصادی و سماجی معاونت
2-118 (امریکہ، اسرائیل)	39/232	18 دسمبر	اقوام متحدہ کی صنعتی ترقی کی تنظیم کی حمایت
1-120	39/233	18 دسمبر	افریقہ کے لیے صنعتی ترقی کی دہائی

- 18 دسمبر 39/243 2-123 (امریکہ، اسرائیل)
مغربی ایشیاء کے لیے اقتصادی کمیشن کے حوالے سے عملہ اور انتظامی امور کے بارے میں سوالات

1985ء

- 13 دسمبر 40/114 1-134
اقتصادی، سماجی، ثقافتی، شہری اور سیاسی حقوق کی سالمیت اور باہمی انحصار
- 13 دسمبر 40/124 1-130
انسانی حقوق اور بنیادی آزادیوں سے مزید بہتر طور پر لطف اندوز ہونے کے لیے اقوام متحدہ کے نظام میں متبادل طریقے
- 13 دسمبر 40/148 2-121 (امریکہ، اسرائیل)
نازی فاشٹ اور نئے فاشسٹوں کی سرگرمیوں کے خلاف اقدامات
- 17 دسمبر 40/445 1-133
رقم، سرمایہ کاری، قرضہ، وسائل کی رفتار، تجارت اور ترقی کے ایک دوسرے سے متعلقہ معاملات میں بین الاقوامی تعاون

1986ء

- 27 اکتوبر 41/11 1-124
بحر اوقیانوس میں امن اور تعاون کا علاقہ
- 3 دسمبر 41/68A 1-148
یونیسکو کی سرکردگی میں ابلاغ اور اطلاعات کے شعبوں میں موجودہ ناہمواریوں کا خاتمہ کرتے ہوئے ایک نیا عالمی اطلاعاتی نظام۔
- 4 دسمبر 41/90 1-126
بین الاقوامی سلامتی کے استحکام کے اعلامیہ کے نفاذ پر نظر ثانی
- 4 دسمبر 41/91 1-117
بین الاقوامی صورتحال کو بہتر بنانے کے لیے نتیجہ خیز سیاسی مذاکرات کی ضرورت

4 دسمبر	41/92	2-102 (امریکہ، فرانس)
		بین الاقوامی امن اور سلامتی کے لیے ہمہ جہتی نظام کا قیام
4 دسمبر	41/128	1-146
		ترقی کے حق کا اعلامیہ
4 دسمبر	41/151	1-148
		مہاجر کارکنوں کے وقار اور انسانی حقوق کا تحفظ اور صورتحال کی بہتری کیلئے اقدامات
8 دسمبر	41/450	1-146
		ماحولیات اور صحت کے لیے ضرر رساں مصنوعات کے خلاف تحفظ

1987ء

15 اکتوبر	42/5	2-153 (امریکہ، اسرائیل)
		اقوام متحدہ اور عرب ممالک کی تنظیم کے مابین تعاون
12 نومبر	42/18	2-94 (امریکہ، اسرائیل)
		نکارگوا کے خلاف فوجی اور پیرامٹری کارروائیوں کے حوالے سے بین الاقوامی عدالت انصاف کے احکامات پر عملدرآمد کی ضرورت۔
2 دسمبر	42/69J	2-145 (امریکہ، اسرائیل)
		مغربی کنارے کے فلسطینی پناہ گزینوں کو ان کے گھروں اور جائیدادوں سے بے دخل کرنے کے منصوبے کو ختم کرنے کی اسرائیل کو ہدایت۔
7 دسمبر	42/101	1-0-150 (امریکہ نے علیحدگی اختیار کی)

بچوں کے حقوق کے حوالے سے اجلاس کا انعقاد

7 دسمبر	42/159	2-153 (امریکہ، اسرائیل)
		بین الاقوامی دہشت گردی کی روک تھام دہشت گردی کے سیاسی اور اقتصادی اسباب کا مطالعہ دہشت گردی کی واضح اور مکمل تعریف دہشت گردی اور آزادی کی تحریکوں میں تیز کرنے اور ان کے درمیان فرق واضح کرنے کے لیے ایک اجلاس کا انعقاد۔

- 8 دسمبر 42/162B 1-140
ترقی پذیر ممالک میں صحافیوں کی تربیت اور ابلاغ کے نظام کو مستحکم بنانے کے لیے
سرمایہ کی فراہمی
- 11 دسمبر 42/176 2-94 (امریکہ، اسرائیل)
ٹکارا گوا کے خلاف تجارتی پابندیوں کا خاتمہ
- 11 دسمبر 42/198 1-154
بیرونی قرضوں کے مسائل کے حوالے سے بین الاقوامی ذمہ داریوں میں اضافہ
- 11 دسمبر 42/441 1-131
تجارت اور ترقی کے حوالے سے اقوام متحدہ کے اجلاس کے لیے جامع اور مکمل
ریکارڈ کی تیاری

کیوبا کے خلاف امریکی پابندیوں کے خاتمے کی ضرورت

(امریکہ، اسرائیل)	2-59	1992
(امریکہ، اسرائیل، البانیہ، پیراگوئے)	4-88	1993
(امریکہ، اسرائیل)	2-101	1994
(امریکہ، اسرائیل، ازبکستان)	3-117	1995
(امریکہ، اسرائیل، ازبکستان) ☆☆	3-138	1996
(امریکہ، اسرائیل، ازبکستان)	3-143	1997
(امریکہ، اسرائیل)	2-157	1998
(امریکہ، اسرائیل)	2-155	1999

☆ رومانیہ نے غلطی سے مخالفت میں ووٹ دے دیا تھا۔

☆☆ تاریخ میں پہلی بار یورپی یونین کے تمام 15 ممالک نے حمایت میں ووٹ

دیا۔

یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ امریکی سیاسی رہنما اور ذرائع ابلاغ برسہا برس تک
کیوبا پر ”بین الاقوامی اچھوت“ کا لیبل چسپاں کرنے کے جنون میں مبتلا رہے۔

خوراک انسانی حق نہیں ہے

جیسا کہ آپ نے اوپر ملاحظہ فرمایا کہ 1982ء اور 1983ء میں صرف امریکہ ہی تھا جس نے اس اعلامیہ کی مخالفت میں ووٹ دیا کہ تعلیم، روزگار، صحت، مناسب دیکھ بھال اور قومی ترقی انسانی حقوق ہیں۔ اور پھر 13 سال بعد بھی امریکہ کے سرکاری رویہ میں کسی قسم کی نرمی نہیں آئی جس کا انداز 1996ء میں اقوام متحدہ کی جانب سے منعقد ہونے والی عالمی خوراک کانفرنس سے ہوتا ہے۔ اس میں امریکہ نے کانفرنس کے اس اعلامیہ پر کہ ”غذائیت سے بھرپور اور صحت بخش خوراک تک رسائی ہر ایک کا حق ہے۔“ نکتہ اعتراض اٹھاتے ہوئے اعلان کیا کہ وہ ”خوراک کا حق“ تسلیم نہیں کرتا۔ اس کے بجائے امریکہ نے بھوک کی بنیادی وجہ غربت کے خاتمے کے لیے آزاد تجارت کے فروغ پر زور دیا اور اسے تمام مسائل کے حل کی کنجی قرار دیا اور ساتھ ہی ساتھ اس خوف کا اظہار کیا کہ ”خوراک کا حق“ تسلیم کئے جانے کی صورت میں غریب اقوام کی جانب سے امداد اور خصوصی تجارتی مراعات کے حصول کے لیے مقدمہ بازی کا سلسلہ بھی شروع ہو جائے گا۔

اقوام متحدہ میں امریکی کردار کے چند مزید رُخ

1949ء میں امریکہ نے اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل ٹرا ہیگ لی کو امریکی محکمہ خارجہ کے ساتھ مل کر ایک خفیہ تحریری معاہدہ کرنے کے لیے آمادہ کیا جس کی رُو سے بنیادی آزادیوں اور اقوام متحدہ کے چارٹر کی خلاف ورزی کی صورت میں درخواست گزار اور اقوام متحدہ سیکرٹریٹ کے اہم عہدیداروں کی ان کے علم میں لائے بغیر امریکی ایجنٹوں کے ذریعہ کڑی نگرانی کی جائے گی۔ اگرچہ اس سلسلہ میں پہلی ہدایات 12000 امریکی شہریوں کے بارے میں جاری کی گئیں، پھر اقوام متحدہ کے ہیڈ کوارٹر میں خدمات سرانجام دینے والے تقریباً آدھے ملازمین اس کا نشانہ بنے، اس کے بعد اس خفیہ معاہدہ کے اثرات دیگر اقوام سے تعلق رکھنے والے اقوام متحدہ کے دیگر شعبوں کے ملازمین تک پھیلتے چلے گئے اور پھر مختلف ممالک میں قائم اقوام متحدہ کی خصوصی ایجنسیاں بھی اس کی زد میں آ گئیں۔ اس معاہدہ کے ذریعہ ایک ایسی پالیسی کو رائج کرنے کی کوشش کی گئی تھی جو پہلے سے موجود تھی حقیقت یہ ہے کہ اس معاہدہ کے ذریعہ محکمہ خارجہ کا مقصد بین الاقوامی سول سروس سے بین الاقوامی سوچ رکھنے والوں کو نکالنا

اور اس سر دس کو امریکی خواہشات کے مطابق چلاتا تھا۔

1952ء میں لی نے امریکی حکومت کی جانب سے فراہم کردہ خفیہ معلومات کی بنیاد پر امریکی سیکرٹریٹ کے تین ملازمین کو سینٹ کی اندرونی سلامتی کی ذیلی کمیٹی کے سامنے پانچویں ترمیم پیش کرنے کی وجہ سے برخاست کر دیا۔ سات دیگر امریکی ملازمین کو جنہوں نے یہی کام کیا تھا تنخواہ کے ساتھ جبری چھٹی پر بھیج دیا گیا۔

1983ء میں اقوام متحدہ میں امریکہ کے نائب سفیر چارلس لیکسنٹین نے اقوام متحدہ کے اراکین کو کہا کہ ”اگر آپ اقوام متحدہ کے ہیڈ کوارٹر کو امریکہ سے کہیں اور منتقل کرنے کے خواہشمند ہیں تو ریگن انتظامیہ اس سلسلہ میں آپ کو روکنے کی ہرگز کوشش نہیں کرے گی۔ ہم آپ کے راستے میں کوئی رکاوٹ کھڑی نہیں کریں گے۔ امریکی مشن کے ارکان آپ کو زوال کی طرف رواں دواگی کے اس سفر میں خوشدلی سے خدا حافظ کہنے کے لیے موجود ہوں گے۔“

سیارہ کے ذریعہ جاسوسی

نیشن کی ہر آواز خواہ وہ سرکوشی سے بھی ہلکی کیوں نہ ہو اس کی پکڑ میں آ جاتی..... یقیناً ایسا کوئی ذریعہ نہیں تھا جس سے پتہ چلا کہ آپ کی ہر لمحہ نگرانی ہو رہی ہے..... آپ کو زندہ رہنا تھا..... زندہ رہنا ایک عادت جو جبلت بن گئی تھی۔ یہ اس مفروضہ کے عین مطابق ہے کہ آپ جو بھی آواز نکالتے ہیں وہ کہیں سنی جا رہی ہے اور سوائے اندھیرے کے آپ کی ہر حرکت پر نظر رکھی جا رہی ہے۔ (جارج اورول 1984ء)

اندھیرے کے حوالے سے جارج کا اندازہ درست نہیں ہے۔ اندھیرے میں دیکھنے کی ٹیکنالوجی اب سائنسی افسانہ نہیں رہی۔ اس نے ایک ملک کے بارے میں لکھا ہے جو یقیناً ایک بڑا ملک ہو گا مگر پھر بھی پوری دنیا نہیں تھا۔ کیا وہ اندازہ کر سکتا تھا کہ 16 سال گزرنے کے بعد مستقبل میں وہ ملک کیسا ہو گا؟

کیا لوگ تصور کر سکتے ہیں کہ 2000ء میں ان کی فحشی زندگیاں اس کرہ ارض کے تاریخ کے کتنے بڑے حملے سے دوچار ہیں؟

آسمان ہر ایک عظیم الجثہ ویکیم کلیز کی طرح نیشٹل سکیورٹی ایجنسی (این ایس اے)، فیکس، گھریلو ٹیلی فون، موبائل فون، ای میل، ٹیلیکس..... سیٹلائٹ ٹرانسمیشن، فابریک آپٹک کیوبیکیشن ٹریک، مائیکرو ویولٹس..... آواز، تحریر، تصویر..... غرضیکہ برقی مقناطیسی توانائی کے ذریعہ ہونے والی ہر قسم کی پیغام رسانی کو جدید ترین ٹیکنالوجی کے ذریعہ اپنی جانب کھینچنے میں مصروف ہے۔ ہفتے کے ساتوں دنوں میں اور دنوں کے ہر 24 گھنٹے کے ایک ایک لمحہ کے دوران یہ مصروف عمل رہتی ہے۔ ہر روز کروڑوں، اربوں پیغامات یہ اپنی جانب کھینچتی ہے۔ ان پیغامات کی صحیح تعداد کا کوئی اندازہ نہیں کر سکتا۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ کسی کے لیے بھی

اس سے بچ کر کھانا ممکن نہیں ہے۔ صدر، وزیر اعظم، اقوام متحدہ کا سیکرٹری جنرل، پوپ، ملکہ برطانیہ بین الاقوامی کمپنیوں کے سربراہ، دوست، دشمن، آپ کی آنٹی لینا..... کوئی بھی اس سے نہیں بچ سکتا..... اگر اللہ میاں کے پاس فون ہے تو یقیناً وہ بھی مانیٹر کیا جا رہا ہوگا..... البتہ یہ ہو سکتا ہے آپ کے کتے کی آواز نہ محفوظ کی جا رہی ہو..... سمندر بھی آپ کو اس سے محفوظ نہیں رکھ سکتے۔ امریکی آبدویں کئی دہائیوں سے سمندروں کی گہرائیوں میں اس مقصد کے لیے بچھائی گئی تاروں کے ساتھ آوازیں محفوظ کرنے والے آلات منسلک کرنے میں مصروف ہیں۔

70ء کی دہائی میں سوویت مواصلاتی سیاروں کی جاسوسی کے لیے ایکیلون (ECHELON) کے خفیہ نام سے متعارف ہونے والے نظام کے تحت این ایس اے اور برطانیہ، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ اور کینیڈا میں موجود اس کے انتہائی جوئیر پارٹنرز نہایت بڑے پیمانے پر پیغامات اپنی جانب کھینچ لینے والے انتہائی خود کار سٹیشنوں کا میٹ ورک چلا رہے ہیں جس نے پوری دنیا کو اپنے قبضہ میں لے رکھا ہے۔ اس کام میں شریک ممالک نہ صرف اپنے ملکی قوانین توڑنے کا جرم کر رہے ہیں بلکہ دوسرے ممالک کا بھی اور پھر سب سے بڑھ کر بین الاقوامی قانون کی خلاف ورزی کرنے کے مجرم ہیں۔ عدالت کے جاری کردہ وارنٹس کی غیر موجودگی میں ان کی کڑی نگرانی کا تصور تو کیا جا سکتا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ کوئی انہیں روکنے والا نہیں ہے۔

1999ء میں امریکی کانگریس کی خفیہ کمیٹی کے ایوان نے این ایس اے کی داخلی دستاویزات طلب کیں کہ وہ کس حد تک اس قانون کی بجا آوری کر رہی ہے جس کی رو سے امریکہ میں یا امریکہ سے باہر مقیم امریکیوں کی شعوری جاسوسی اس وقت تک ممنوع ہے جب تک انجینی یہ ثابت نہیں کر دیتی کہ وہ لوگ کسی بیرونی حکومت کے خیر ہیں یا جاسوسی اور دیگر جرائم میں ملوث ہیں۔ این ایس اے نے کمیٹی کی کارروائی رکوا دی۔

انفرادی شخصیات اور اداروں کو نشانہ بنانے کے علاوہ ایکیلون (ECHELON) نظام کے تحت بہت وسیع پیمانے پر نظام مواصلات میں مداخلت کی جاتی ہے اور پھر کمپیوٹرز کی مدد سے غیر ضروری پیغامات کے جھوم میں سے مطلوبہ پیغامات تلاش کئے جاتے ہیں۔ سفارتی مذاکرات، تجارتی گفت و شنید، جنسی گفتگو، سالگرہ کے پیغامات..... کسی بھی پیغام میں تلاش کرنے والوں کے لیے مطلب کی کوئی خفیہ بات پوشیدہ ہو سکتی ہے۔ کمپیوٹرز ٹیلی فون کے

ذریعہ ہونے والی گفتگو ”سننے“ ہیں اور ان میں پوشیدہ خفیہ پیغام کی فوری طور پر نشاندہی کر دیتے ہیں۔ ان ٹیلیفون کالز کو علیحدہ علیحدہ کر کے ریکارڈ کیا جاتا ہے تاکہ بعد میں جب انسان انہیں سنیں تو سمجھنے میں کسی قسم کی مشکل پیش نہ آئے۔

تاہم ایکیلون (ECHELON) کو چلانے والے کوئی مافوق الفطرت نہیں ہیں بلکہ عام انسان ہی ہیں اور یہ تسلیم کرتے ہیں کہ انہیں خطرناک فنی مسائل سے سابقہ پڑتا رہتا ہے۔ وہ اپنی مرضی کے مطابق جب چاہیں انٹرنیٹ میں رکاوٹیں نہیں پیدا کر سکتے۔ فابریک آؤٹک ٹراسمیٹرز (جو ڈیجیٹل ڈیٹا کی بڑی تعداد کی روشنی کے بہاؤ کی صورت میں ترسیل کرتی ہے) کو بھی انتہائی مشکلات کا سامنا ہوتا ہے اور ڈیٹا حاصل کرنے سے لے کر اس تمام کو پڑھنا، چھاننی کرنا، منتخب مواد کا تجزیہ کرنا اس میں سے معنی خیز کارآمد مواد اکٹھا کرنا اور پھر فوری پیغام رسانی ایک نہایت ہی حیرت انگیز چیلنج ہے۔

دوسری جانب سن مائیکروسسٹرو کے ایک ماہر ڈیٹا فیلڈ ڈیٹا کے تجزیہ کے مطابق ”این ایس اے کی جانب سے خبردار کیے جانے کی اور آنے والے وقت سے ڈرانے کی یہ حکمت عملی ہو سکتا ہے اس کے اپنے مفاد میں ہو۔ انجینیئرس ہمیں کیا یقین دلانا چاہتی ہے۔ یہی کہ ہم لوگ مشکل میں ہیں۔ کسی کے پاس اخبار پڑھنے کے لیے وقت نہیں، کسی کے لیے انٹرنیٹ نہایت پیچیدہ ہے، سڑکوں پر ٹریفک کا جھوم ہے، کام بہت زیادہ ہے اور وقت بہت کم کہ سمجھ میں ہی نہیں آتا کہ کیا کیا جائے، کسی کو یہ علم نہیں کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ یہ درست ہے کہ یہ سب مسائل ہیں مگر یہ کوئی نئی بات تو نہیں یہ تو برسہا برس سے لوگوں کی زبان پر ہیں۔ وہ مستقل یہ ہی شکایت کرتے نظر آتے ہیں اور اسی وجہ سے شاید این ایس اے کے لیے اپنے اہداف کو یہ یقین دلانا آسان ہے کہ وہ مشکل میں ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ مسائل و مشکلات ہیں ہی نہیں مگر یہ وہ وجہ ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ اطلاع دینے والے کا اصل مقصد کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کے خطرات سے آگاہ کرنا خوف میں مبتلا کرنا، مشکلات کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنے کا اصل مقصد اپنے بچٹ میں اضافہ کرنا ہے۔“

ایکیلون (ECHELON) کا قیام کسی قسم کی سرکاری منظوری کے بغیر ہوا اور یہ اسی طرح کام بھی کر رہا ہے کسی بھی قسم کی جمہوری صورت، عوامی یا قانونی بحث کے بغیر جس سے اندازہ ہو کہ یہ انسانی مقامہ کے لیے کام کر رہے ہیں۔ کوئی نہیں جو یہ پوچھے کہ امریکہ کو

ایسا کرنے کا حق کس نے دیا؟ برطانیہ میں جب پارلیمنٹ کے اراکین نے این ایس اے کی سرگرمیوں اور مین ودھ مل، نارتھ یارک شائر میں اس کے بڑھتے ہوئے اڈوں کے حوالے سے سوالات اٹھائے تھے تو حکومت اس بارے میں کسی بھی قسم کی معلومات کی فراہمی سے انکار کرتی رہی۔

انگلستان میں قائم یہ اڈہ دنیا بھر میں این ایس اے کا پیغامات کھینچنے کا سب سے بڑا مرکز ہے۔ یہ 1560 ایکڑ پر پھیلا ہوا ہے جس میں کارروائیوں کے مراکز اور رہائشی بستی موجود ہے۔ اس جدید بستی میں مکانات، دکانیں، گرجا گھر، سپورٹس سینٹر اور اس کا اپنا بجلی کا نظام ہے۔ ایکیلون کا عالمی نیٹ ورک کئی دہائیوں پر مشتمل سرد جنگ کی پیداوار ہے مگر اس کی سرگرمیاں دن بدن انتہائی شکل اختیار کرتی جا رہی ہیں یہی وجہ ہے کہ سرد جنگ کے خاتمے کے بعد اس کا بجٹ بجائے کم ہونے کے مزید بڑھ گیا ہے اور اس نیٹ ورک کی طاقت اور رسائی دونوں میں خطرناک حد تک اضافہ ہو گیا ہے۔ تاہم ایک اور شہادت یہ ہے کہ سرد جنگ اس چیز کے خلاف لڑائی نہیں تھی جو ”اشتراکیت“ کہلاتی ہے۔

گزشتہ چند سالوں سے یورپی پارلیمنٹ براعظم کے معاملات میں مستقل مداخلت کے واقعات کے سبب بار بار اس جانب توجہ دے رہی ہے۔ پارلیمنٹ کی شہری آزادیوں کی کمیٹی کی تیار کردہ ایک رپورٹ 1998ء میں منظر عام پر آئی جس میں تکنیکی طریقوں کے ذریعہ ہونے والی مستقل نگرانی کی بڑھتی ہوئی طاقت کو روکنے کے لیے کئی تجاویز پیش کی گئیں۔ اس میں واضح انداز میں مشورہ دیا گیا کہ ”یورپی پارلیمنٹ کو امریکہ کی جانب سے انٹرنیٹ کے ذریعہ پیغام رسانی کی تمام تجاویز کو جو کہ امریکی خفیہ ایجنسیوں کی رسائی میں ہیں فوری طور پر مسترد کر دینا چاہیے۔“

رپورٹ میں این ایس اے کی یورپ میں دخل اندازیوں کے بارے میں جامع تجویز کرتے ہوئے تجویز پیش کی گئی کہ ایجنسی کی کارروائیوں کی کوئی حدود مقرر کی جائیں اور انہیں جانچنے کا اصول وضع کیا جائے اس کے ساتھ ساتھ ایجنسی کو اپنی تمام کارروائیوں کے لیے جواب دہی کا پابند بنایا جائے۔ اس رپورٹ میں برطانیہ کے دوہرے کردار کو بھی بے نقاب کیا گیا جو اپنے یورپی ساتھیوں کی ہی خبری میں معروف ہے۔

اس حوالے سے بات کرتے ہوئے کمپیوٹر جرائم کے ماہر فرانسیسی قانون دان جین

پائیرے مابکٹ نے فرانسیسی اخباری نگار کو بیان دیا کہ ”یہ نہایت ہی افسوسناک بات ہے جو عوامی غم و غصہ کو بیدار کر سکتی ہے۔ برطانیہ کے یورپی ساتھیوں کو اس پر غضبناک ہونے کا پورا حق ہے مگر اس کے باوجود برطانیہ امریکہ کے ساتھ اپنا معاہدہ ختم نہیں کرے گا۔“

سرد جنگ کے خاتمے کے بعد سے یورپی پارلیمنٹ کے اراکین اور حکومتوں کی جانب سے ایسے تحفظات کا اظہار نجی طور پر مستقل کیا جا رہا ہے مگر امریکہ یورپ میں ایکیلون کی کارروائیوں میں مستقل اضافہ کر رہا ہے جس کی وجہ اس کے بڑھتے ہوئے مفادات ہیں۔ تجارتی مجبزی کے ذریعہ صنعتی معلومات حاصل کی جاتی ہیں جو امریکی کارپوریشنوں کو ان کے غیر ملکی دشمنوں پر برتری دلانے میں بے حد مدد و معاون ثابت ہوتی ہیں۔

جرمن ماہرین سلامتی کے مطابق ایکیلون (ECHELON) یورپ میں نہایت وسیع پیمانے پر تجارتی جاسوسی میں ملوث ہے۔ اس کا نشانہ بننے والوں میں معروف جرمن کمپنیاں بھی شامل ہیں جن میں سرفہرست ہوا کی طاقت سے بجلی پیدا کرنے والی کمپنی ایزکون ہے۔ 1988ء میں ایزکون نے اپنے خیال میں خفیہ ایجاد کی۔ یہ ایجاد ہوا کی طاقت کے ذریعہ بجلی پیدا کرنے کی صلاحیت کا حصول تھی۔ یہ بجلی پہلے کے مقابلہ میں نہایت سستی تھی۔ تاہم جب کمپنی اپنی ایجاد کو فروخت کے لیے امریکن منڈی میں لائی تو اس کا سابقہ اپنے امریکی حریف کینیڈا سے ہی سب سے پہلے پڑ گیا جس نے اعلان کیا کہ وہ اس سے پہلے ہی اس سے ملتی جلتی قوت ایجاد کر چکا ہے۔ اس کے ساتھ ہی کینیڈا ایزکون کے نام عدالتی حکمنامہ لے آئی جس کی رو سے ایزکون پر اپنی ایجاد کی امریکہ میں فروخت پر پابندی عائد کر دی گئی۔ این ایس اے کے ایک کارکن نے اپنا نام صیغہ راز میں رکھنے کی درخواست کرتے ہوئے جرمن ٹیلی وژن کے ایک رنجی پروگرام میں اس بارے میں انکشاف کیا کہ اس نے کس طرح سے ایزکون کے راز چرائے۔ اس نے بتایا کہ اس نے ایزکون کی ریسرچ لیبارٹری اور اور 12 میل کے فاصلہ پر واقع اس کے پیداواری یونٹ کے درمیان ٹیلیفون اور کمپیوٹر کے ذریعہ ہونے والی تمام پیغام رسانی سیٹلائٹ انفارمیشن کے ذریعہ حاصل اور ریکارڈ کی اور کمپنی کی ایجاد کی تمام تر تفصیلات کینیڈا کو فراہم کیں۔

1994ء میں فرانس کے شہروں پیرس اور بیلجیک میں واقع ماسن ایس اے اور

ایئر بیس انڈسٹری کو اس وقت نقصان عظیم سے دوچار ہونا پڑا۔ جب ان کے امریکی حریفوں نے

این ایس اے اور سی آئی اے سے حاصل کردہ خفیہ معلومات کے ذریعہ ان کے تمام معاہدے چھین لیے۔ سی آئی اے اور این ایس اے نے 1995ء میں امریکہ اور جاپانی نمائندوں کے مابین آٹوپارٹس تجارت کے موضوع پر ہونے والے مذاکرات کی بھی خفیہ نگرانی کی۔

جرمن انڈسٹری کو شکایت ہے کہ ان کے لیے صورتحال اس لیے زیادہ نقصان دہ ہے کہ ان کی حکومت نے اپنے سلامتی کے حکموں پر اس قسم کی تجارتی جاسوسی پر پابندی عائد کر رکھی ہے۔ یورپ میں صنعتی جاسوسی میں مہارت رکھنے والے صحافی یوڈو الفلوٹ کے مطابق ”جرمن سیاستدان آج بھی نہایت ایمانداری سے اس نظریہ پر یقین رکھتے ہیں کہ سیاسی حریفوں کو ایک دوسرے کے تجارتی معاملات کی جاسوسی نہیں کرنی چاہیے جبکہ امریکہ اور برطانیہ کو اس قسم کی کوئی مجبوری نہیں۔“

1999ء میں جرمنی نے امریکہ سے مطالبہ کیا کہ وہ سی آئی اے کے ان تین کارکنوں کو واپس بلائے جو جرمنی میں معاشی جاسوسی کی سرگرمیوں میں ملوث تھے۔ اخباری خبر کے مطابق ”جرمن امریکی راڈار اور میونخ کے نزدیک بیڈلہبلنگ میں واقع مواصلاتی کمپلیکس کی خفیہ کارروائیوں‘ جاسوسی اور خفیہ نگرانی کے حوالے سے کافی عرصہ سے مشکوک تھے جو کہ دراصل این ایس اے کا پیغامات کھینچنے والا سٹیشن ہے۔“ جرمنی کے ایک سینئر اہلکار نے سوال کیا کہ ”امریکی ہمیں کہتے ہیں کہ یہ صرف دشمنوں کے پیغامات جمع کرنے کے لیے ہے مگر ہم یہ کیسے مان لیں کہ یہ ہماری وہ معلومات اکٹھی نہیں کر رہا ہو گا جس کے بارے میں ہم چاہتے ہیں کہ یہ مکمل طور پر ہر ایک سے خفیہ رہیں؟“

امریکہ کی طرف سے اسی قسم کی کہانی جاپانی افسروں کو بھی درجن بھر سے زائد جاسوسی کے ان اڈوں کے بارے میں کئی بار سنائی گئی جو جاپانی حکومت کی اجازت سے یہاں قائم کئے گئے تھے۔

یورپی یونین اور ایف بی آئی

مندرجہ بالا تمام غلط کاریوں کے بلوجود یورپی یونین کونسل (یا وزراء کی کونسل) 90ء کی دہائی سے ایف بی آئی کے ساتھ مل کر اپنے رکن ممالک کے درمیان پیغامات کھینچنے والا نظام قائم کرنے کے لیے کوشاں ہے تاکہ اس کے ذریعہ قانون نافذ کرنے والے اداروں

(پولیس، امیگریشن، کسٹم اور داخلی سلامتی کے ادارے) کی معاونت کی جاسکے۔ اس کے مقابلہ میں ایکیلون (ECHELON) ”فوج کے خفیہ اداروں“ کی معاونت کر رہی ہے۔

یورپی یونین اور ایف بی آئی کا یہ مشترکہ نظام جو ای یو۔ ایف بی آئی (EU-FBI) مواصلاتی نگرانی کا نظام (بعض اوقات ENFOPOL کے نام سے بھی جانا جاتا ہے) کہلاتا ہے اس کے ذریعہ انٹرنیٹ سے ایک نئے طریقہ سے پیغامات کھینچے جائیں گے۔ انٹرنیٹ سروس پروڈائیڈرز (آئی ایس پی) میں ماہر سافٹ ویئر نصب کیے جائیں گے جن کا نظام قانون نافذ کرنے والے اداروں کے ہاتھ میں ہوگا۔ نتیجہ میں تمام پیغامات خود بخود حاصل ہو جائیں گے اور پھر ان کی چھاننی اور انتخاب کے مراحل بھی خود بخود طے ہو جائیں گے۔ دیکھتے ہیں کہ تکنیکی طور پر یہ کتنا فائدہ مند ہوگا۔

مزید برآں اگر آئی ایس پی اپنے کسی گاہک کو خفیہ اشارے یا مختصرات فراہم کرتی ہے تو اسے قانون نافذ کرنے والے اداروں کو بھی ان سے آگاہ کرنا ہوگا۔ آئی ایس پی اور نیٹ ورک آپریٹرز (سیٹلائٹ کمیونیکیشن نیٹ ورک) کو اس وقت تک نیٹ ورک چلانے کے لیے قومی لائسنس نہیں جاری کئے جائیں گے نہ ہی پہلے سے موجود لائسنسوں کی مدت میں توسیع کی جائے گی جب تک کہ وہ اس حکم کی تعمیل نہیں کریں گے۔

ای یو۔ ایف بی آئی (EU-FBI) معاہدہ میں زیادہ تر شرائط ایف بی آئی کی طرف سے لاگو کی گئی ہیں۔ یہ وہ شرائط ہیں جو وہ اپنے ملک میں نہیں منوا سکتی۔ یورپ میں کچھ مواصلاتی کمپنیوں کی جانب سے احتجاج کیا گیا مگر منصوبہ پر بغیر کسی رکاوٹ کے عملدرآمد ہوتا رہا یہاں تک کہ اس یقین دہانی کے حصول کے لیے کہ نئے نظام کے تحت کڑی نگرانی بھی ممکن ہوگی قانون میں ترامیم کی تجاویز بھی پیش کر دیں۔ یورپی یونین کے علاوہ بھی دیگر ممالک تک اس نظام کا دائرہ کار بڑھانا اس منصوبہ کا حصہ ہے۔

1999ء کے اختتام تک اس معاہدہ کا حتمی مسودہ تیار نہیں ہوا تھا کہ اسے منظوری کے لیے یورپی ریاستوں کو پیش کیا جاتا تاخیر کی ایک وجہ یہ تھی سلامتی کے کئی محکمے خفیہ نگرانی کا دائرہ کار زیادہ سے زیادہ بڑھانے اور احتساب اور کنٹرول کم سے کم کرنے کی سرٹوڈ کوششوں میں مصروف تھے۔

خفیہ پیغام رسائی

این ایس اے ایف بی آئی اور امریکہ کی قومی سلامتی کی انتظامیہ کے دیگر عناصر زیادہ سے زیادہ نجی معلومات کی جستجو میں سالہا سال سے امریکن ٹیلی کمیونیکیشنز مینوفیکچررز اور ان کے آلات اور نیٹ ورک کے حصول کی مہم میں مصروف ہیں تاکہ ان کے ذریعہ حکام کو خوش امیدوں میں مبتلا کیا جاسکے اور قومی سطح پر خفیہ تحریر کا ایک ایسا مقررہ ڈیزائن ترتیب دینا بھی اس مہم کا حصہ ہے کہ جس کے ذریعہ حکومت جب چاہے خفیہ پیغامات کے اشارے ختم کر سکے۔ کسی کمپنی کی برآمدات کی حمایت کرنا یا انہیں روک دینا بھی ان کی منظوری یا نا منظوری کا فیصلہ کرنے کا اختیار سلامتی کی انتظامیہ کا ایک بے حد طاقتور ہتھیار ہے۔ صنعتی شعبہ کے اندر کے آدمیوں کا کہنا ہے کہ ہمیں یقین ہے کہ بعض امریکی مشینوں کی صرف اور صرف این ایس اے کی پشت پناہی حاصل ہونے کی وجہ سے برآمدات کے لیے منظوری ملی ہے۔

امریکہ یورپی یونین کے رکن ممالک پر دباؤ ڈالتا رہا ہے کہ وہ اسے اس کے ”بیک ڈور“ کے ذریعہ اپنے خفیہ نگرانی کے پروگرام تک رسائی کی اجازت دے دیں اس سلسلہ میں اس کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ قانون نافذ کرنے والے اداروں کی مدد کے لیے ایسا کرنا چاہتا ہے۔ تاہم مئی 1999ء میں جاری ہونے والی یورپین پارلیمنٹ کی رپورٹ کے مطابق امریکہ کا یورپ میں سافٹ ویئر نگرانی کے پروگرام پر قبضہ کرنے کے منصوبہ کا مقصد قانون کا نفاذ نہیں بلکہ صنعتی شعبہ کی جاسوسی ہے۔

ماہر انٹیلی جنس افسروں کے مطابق این ایس اے نے ایف بی آئی کے کارکنوں کو چھین جھپٹ کی کارروائیوں میں غیر ملکی خفیہ کتابیں اڑالانے کی ذمہ داری سونپی جبکہ سی آئی اے کے افسروں کو غیر ملکی مواصلاتی کلرکوں کی حیثیت سے مختلف ممالک روانہ کیا تاکہ وہ ان کے خفیہ راز خرید سکیں۔

اور ابھی مزید انس؟

امریکی محکمہ انصاف کا نگرانی پر اس بات کے لیے دباؤ ڈالتا رہا ہے کہ قانون نافذ کرنے والے حکام کے لیے تلاشی کے وارنٹس کا حصول آسان سے آسان تر بنایا جائے تاکہ گمروں یا دفتروں میں خفیہ طور پر داخل ہو سکیں اور نجی کمپیوٹرز کی سیکیورٹی کی ناکارہ بناتے

ہوئے ان کے پاس ورڈز (Pass words) معلوم کرنے ان میں ایسی ڈیوائس نصب کر دیں
 خفیہ پیغام رسانی کے پروگرام پر کنٹرول حاصل کر لے۔ یہ وائرل نیٹ یا مزید تحقیق کا آغاز ہوگا۔
 اسی دوران ایجنسیاں انٹرنیٹ کے ذریعہ گمنام میل کرنے کا پروگرام چلا رہی ہیں
 جس کے ذریعہ لوگ اپنا درست ای میل ایڈریس ظاہر کیے بغیر میل کر سکتے ہیں۔ دنیا بھر میں
 اس مخصوص ری میلنگ سروس کا استعمال کرنے والے اس بات سے قطعی بے خبر ہیں کہ ان کی
 پرائیویسی کی حفاظت کرنے والا ان کا یہ ہمدرد امریکی حکومت کا ایک کارندہ یا اسی قسم کی کوئی چیز
 ہے۔ یہ پروگرام ان استعمال کرنے والوں کے لیے مشکلات کا باعث بن سکتا ہے۔ جو انٹرنیٹ
 پر یہ سوچ کر کہ وہ تو گمنام حیثیت سے بات چیت کر رہے ہیں ہلاکسی خوف و خطر کے جابر
 حکومت اور انسانی حقوق کی خلاف ورزی کرنے والوں کی مخالفت پرائیویٹ کمپنیوں یا سرکاری
 ایجنسیوں کی زیادتیوں کا رونا روتے ہیں اور جرائم کے خلاف آواز اٹھانے کی خواہش کا اظہار
 کرتے ہیں۔ مزید برآں این ایس اے نے کئی سال قبل لوٹن مائیکروسافٹ اور نیٹ سکیپ
 کے ساتھ معاہدے کئے جن کا مقصد دیگر کمپنیوں کی گمنام ای میل سروس کو روکنا تھا کیونکہ ان
 میں سے کئی این ایس اے کے دائرے عمل سے باہر تھے اور ان پر این ایس اے کا کنٹرول نہیں
 تھا۔ این ایس اے کے ساتھ معاہدہ میں شریک کمپنیوں پر حکومت کی جانب سے شدید دباؤ تھا
 کہ وہ بیرون ملک فروخت کئے جانے والے اپنے سافٹ ویئر میں ”بیک ڈور“ کو خفیہ طور پر
 داخل کر دیا جائے تاکہ ان کے ذریعہ خفیہ پیغامات کے طریقہ کو کھست دی جاسکے۔ لوٹن کمپنی
 نے تسلیم کیا کہ اس نے حکومتی دباؤ پر ایسا ہی کیا۔

ایف بی آئی اب اپنے جدید ترین کھلونے سے لطف اندوز ہو رہا ہے جس کا نام
 ہے ”رودنگ وائرلپس“ اور جس کا کام ہے کہ وہ ہدف کے فون پر ابھرنے والی تمام آوازیں
 ریکارڈ کرے خواہ یہ دوستوں کی، پڑوسیوں کی، کاروباری شریک کاروں کی یا اجنبیوں کی
 آوازیں ہوں خواہ یہ عام فون، موبائل فون یا ادھار لیا ہوا فون ہو۔ یہ دیکھے بغیر کہ کون بول رہا
 ہے اس وقت تک ریکارڈنگ کرتا ہے جب تک کہ ہدف کے زیر استعمال رہتا ہے۔

جدید بزدل دنیا

یہ سب کچھ ایسے ہی ہے کہ جیسے قومی سلامتی کی انتظامیہ محسوس کرتی ہے کہ سننا اس کا

فطری حق ہے اور اگر اس حوالے سے کوئی ایسی آئینی ترمیم کی جائے جو پوری دنیا پر لاگو ہو تو وہ کچھ یوں ہوں گی کہ ”کانگریس کوئی ایسا قانون نہیں بنائے گی جس سے حکومت کی شہریوں کے ذاتی پیغامات سننے کی آزادی متاثر ہو۔“ اور تبدیل شدہ چوتھی ترمیم یوں ہوگی: ”افراد اپنے گھروں، ذاتی معاملات، کاغذات، تاثرات میں کسی قسم کی بلا جواز تلاشیوں اور گرفتاریوں سے محفوظ ہوں گے ماسوائے قومی سلامتی کے معاملات کے خواہ وہ حقیقی ہوں یا الزامات پر مبنی ہوں۔“

ممکنہ بدترین مناظر

اگر اخلاقی، قانونی، نجی یا دیگر بیانیوں کو سامنے رکھتے ہوئے انہیں اپنے دن بدن بڑھتے ہوئے اخراجات کا جواز فراہم کرنے کو کہا جائے تو نجی زندگی کی دشمن پولیس کا نہایت ڈھنساؤ سے یہ موقف ہوتا ہے کہ ”اگر دہشت گردوں (ای میل فیکس) کے ذریعہ کسی خطرناک منصوبہ کے بارے میں ایک دوسرے کو پیغامات دیتے ہیں تب کیا ہوتا ہے؟ ہم خفیہ ٹینک کی انہی کارروائیوں کے ذریعہ منصوبہ کو قبل از وقت بے نقاب کر کے روک سکتے ہیں۔“

انہوں نے ایسے ممکنہ بدترین مناظر از خود تخلیق کر لیے ہیں کہ جو اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئے اور نہ ہی ہوں گے ہاں البتہ اگر دہشت گرد مریخ پر پیدا ہوئے ہوں اور حکام انتہا سے زیادہ خوش قسمت ہوں تو اس قسم کے بدترین مناظر کا تخلیق کیا جانا کوئی اجنبی کی بات نہیں۔ مثال کے طور پر جاسوسی کے ذریعہ حاصل ہونے والی بے شمار معلومات میں سے وہ منتخب کر لی جائے جو ان لوگوں کے بارے میں ہے جو اپنے شریک حیات کو دھوکہ دے رہے ہیں۔ تصور کریں کہ کسی وقت یہ معلومات منظر عام پر آ جاتی ہیں تو نتیجہ کیا ہوگا گھر میں لڑائی جھگڑا، ڈپریشن، کالم گلوچ، طلاق، قتل، خودکشی..... سوچیں کہ بچوں کا کیا ہوگا؟ یہاں بلیک ملیک یا لوگوں کو مجبوری کے لیے مجبور کرنے کا ذکر نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کے پیغامات کے حصول کا مقصد ایکیلون (ECHELON) کی لعنت میں خفیہ الفاظ کا اضافہ کرنا اور کسی بھی پارٹی کو پیغامات دینے کے لیے کسی جوڑے کو کوڈ ورڈ کی حیثیت سے استعمال کرنا ہے۔

صدی کا عظیم ترین آلہ جاسوسی

50ء کی دہائی کے آغاز میں سوئس کمپنی کرائچو اے جی نے دنیا بھر میں خفیہ پیغام رسانی کی سب سے محفوظ، موثر اور مدلل ٹیکنالوجی فروخت کی۔ کمپنی نے سرد جنگ یا کسی بھی

جنگ میں اپنی غیر جانبداری کو قائم رکھنے کے لیے اپنی ساکھ اور اپنے کلائس کی سلامتی تک کو داؤ پر لگا دیا۔ اس ٹیکنالوجی کے خریدار 120 ممالک میں ایران، عراق، لیبیا اور یوگوسلاویہ بھی شامل تھے جو امریکی جاسوسی کا سب سے بڑا نشانہ تھے۔ یہ ممالک مطمئن تھے کہ ان کے پیغامات محفوظ ہیں۔ وہ نہایت اطمینان سے دارالحکومت سے دنیا بھر میں قائم اپنے سفارتخانوں، فوجی اڈوں، تجارتی دفاتر اور جاسوسی کے مراکز کو ٹیلیکس، ریڈیو اور فیکس کے ذریعہ پیغامات بھیجتے رہے اور یہ تمام پیغامات کمپنی اور این ایس اے کے درمیان طے شدہ خفیہ معاہدہ کے تحت براہ راست امریکہ پہنچتے رہے کیونکہ کراپچو اے جی کی مشینوں میں فروخت کرنے سے قبل ہی خفیہ طور پر گزربز کردی گئی تھی یہی وجہ ہے کہ جب وہ انہیں استعمال کرتے خفیہ پیغامات خود بخود عام فہم پیغامات میں تبدیل ہو جاتے اور اپنے اصل مفہوم کے ساتھ این ایس اے کے تجربہ نگاروں کے پاس پہنچ جاتے۔ وہ ان کا اتنی ہی روانی سے مطالعہ کرتے جیسے صبح کے اخبار کا کیا جاتا ہے۔ جرمنی کی خفیہ تنظیم بھی اس میں ملوث تھی اور ہو سکتا ہے کہ وہ ہی کراپچو اے جی کی اصل مالک ہو۔

1986ء میں مغربی برلن لابیڈوسکو میں ہونے والی بم دھماکہ کے حوالے سے امریکہ کی جانب سے جاری ہونے والے عالمی بیانات نے لیبیا کو شک و شبہ میں مبتلا کر دیا کہ کراپچو اے جی کی مشینوں میں کوئی گزربز ہے یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اسے چھوڑ کر ایک اور سوئس کمپنی گریٹیک ڈیٹا سسٹم اے جی کی مشینوں کا استعمال کیا مگر جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ یہ بھی مکمل طور پر این ایس اے کے اختیار میں ہے۔ پچھلے چند سالوں میں یکے بعد دیگرے وقوع پذیر ہونے والے مشکوک واقعات کے بعد 1992ء میں لیبیا کی طرح ایران نے بھی اسی نتیجہ پر پہنچتے ہوئے کراپچو اے جی کے ایک ملازم کو گرفتار کر لیا جو کاروباری دورہ پر ایران آیا ہوا تھا۔ گو کہ اسے بعد میں رہا کر دیا گیا مگر یہ واقعہ منظر عام پر آنے سے ساری حقیقت خود بخود واضح ہو گئی۔

مائیکروسافٹ ونڈوز

این ایس اے نے کچھ اسی قسم کا معاملہ کمپیوٹرز کے ساتھ بھی کیا۔ ستمبر 1999ء میں معروف یورپی تحقیقاتی رپورٹر ڈیکس کیمبل نے انکشاف کیا کہ ”این ایس اے نے مائیکروسافٹ کی OS-2 95 سے آج تک کی تمام ونڈوز سافٹ ویئرز میں تمام زبانوں میں خصوصی

خفیہ اشارے (Keys) داخل کر رکھی ہیں۔“ ایک امریکی کمپیوٹر سائنسدان اینڈریو فرینڈز نے جس کا تعلق نارتھ کیرولینا سے ہے وندوز کی ہدایات کے کوڈ کے علیحدہ علیحدہ حصے کیے۔ تو آخر کار اسے دھوئیں والی بندوق حاصل ہوئی۔

مائیکروسافٹ بنانے والے ان اشاروں کو ختم کرنے میں ناکام رہے جو کہ اس سوفٹ ویئر کے اجراء سے قبل جانچ پڑتال کے لیے استعمال کئے جاتے ہیں۔ اس کوڈ کے اندر دو چابیوں کے نشان تھے جن میں سے ایک "KEY" جبکہ دوسری "NSAKEY" کہلاتی تھی۔ فرینڈز نے اپنی یہ تحقیق ایک کانفرنس کے دوران منکشف کی جب وندوز بنانے والے بھی موجود تھے۔ وندوز بنانے والوں نے اس سافٹ ویئر میں این ایس اے کی (NSA KEY) کی موجودگی سے انکار نہیں کیا مگر انہوں نے یہ بتانے سے انکار کر دیا کہ یہ کیا کام کرتی ہے اور استعمال کرنے والے کے علم میں لائے بغیر اسے وہاں رکھے گا کیا مستعد ہے؟ فرینڈز کے مطابق این ایس اے کا ”بیک ڈور“ دنیا میں سب سے زیادہ استعمال ہونے والا آپریننگ سسٹم ہے جو امریکی حکومت کے لیے آپ کے کمپیوٹر تک با آسانی پہنچنے اور انہیں کھگانے میں مدد و معاون ثابت ہوتا ہے۔“

فروری 2000ء میں یہ بات منظر عام پر آئی کہ اسٹریٹجک انفیر ڈیپلیکیشن (ڈی اے ایس) نے جو کہ فرانس کی وزارت دفاع کا خفیہ ہتھیار ہے 1999ء میں ایک رپورٹ تیار کی جس میں اس امر کی نشاندہی کی گئی تھی کہ مائیکروسافٹ ویئر میں این ایس اے نے خفیہ پروگرام داخل کر رکھے تھے۔“ ڈی اے ایس کی رپورٹ کے مطابق ”یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ مائیکروسافٹ کے قیام میں این ایس اے نے صرف مالی طور پر ہی نہیں بلکہ ہر طرح سے ہجر پور حمایت کی اور پھر آئی بی ایم نے اسی انتظامیہ کے ایم ایس۔ڈاں (MS-DOS) آپریننگ سسٹم کو قبول کر لیا۔“ رپورٹ کے مطابق ”مائیکروسافٹ کے جاسوسی کے پروگراموں کے حوالے سے ابھرنے والی افواہوں اور بل گیش کی ٹیم میں این ایس اے کے افسران کی موجودگی کے سبب اس کے غیر محفوظ ہونے کا تاثر مضبوط سے مضبوط تر ہوتا جا رہا ہے۔“ رپورٹ کے مطابق ”میںنا گون دنیا بھر میں مائیکروسافٹ کا سب سے بڑا کلائنٹ تھا۔“

اغواء اور لوٹ مار

1962ء میں امریکہ نے ڈومینکن ری پبلک سے 125 افراد اغواء کیے اور انہیں امریکہ یا دیگر مختلف مقامات پر پہنچا دیا گیا۔

منشیات کے ایک مشتبہ سمگلر کو ہونڈراس سے اغواء کر کے 1988ء میں امریکہ لایا گیا۔ اگرچہ ہونڈراس کے قانون میں ہونڈراس کے شہریوں کو مقدمہ بازی کے لیے دوسرے ممالک کے حوالے کرنے پر پابندی ہے مگر یہ سب شاید ہونڈراس کی حکومت کی مرضی سے ہوا تھا جو امریکہ کے زیر اثر تھی۔

دسمبر 1989ء میں امریکی فوج نے پانامہ میں ہیٹل نوریگا کو پکڑ کے فلوریڈا پہنچا دیا

تھا۔

اسی سال ڈرگ انفورسمنٹ ایڈمنسٹریشن (ڈی ای اے) نے ہاؤنٹی کے شکاریوں کے ذریعہ ڈاکٹر ہمبرٹو الویراز میشین کو گواڈالا جارا میں واقع اس کے کلینک سے اغواء کر کے ہوائی جہاز کے ذریعہ ایل پاسو پہنچایا جہاں اسے ڈی ای اے کے حوالے کر دیا گیا۔

سائپرس کے ایک تاجر حسین علی خانی کو لیبیا کے خلاف عائد امریکی پابندیوں کی خلاف ورزی کی پاداش میں 1992ء میں دھوکہ سے جہاز میں سوار کر دیا گیا اور بعد میں اغواء کر کے میامی پہنچا دیا گیا۔

دسمبر 1997ء میں جب سے امریکہ کولمبیا کی حکومت سے تحویل مجرمین پر پابندی کے قانون کا خاتمہ کرانے میں کامیاب ہوا ہے تب سے کولمبیا کے شہریوں کو منشیات کے الزامات کے تحت بحری جہازوں کے ذریعہ امریکہ بھیجنے کی شرح میں مستقل اضافہ ہو رہا ہے۔

1992ء میں امریکی سپریم کورٹ نے ایلویرا میشین کے کیس کا فیصلہ سناتے

ہوئے اعلان کیا کہ اگرچہ بین الاقوامی قانون کے بنیادی اصولوں کی خلاف ورزی ”افسوسناک“ ہے مگر غیر ملکوں کو ان کے اپنے ملک سے اس لیے اغواء کرنا کہ وہ خود پر عائد امریکی قوانین کی خلاف ورزی کے الزامات کے مقدمات کا امریکی عدالت میں سامنا کریں قانونی طور پر قابل قبول طریقہ ہے۔ چیف جسٹس ولیم ایچ ڈیٹکونٹ کی خواہش تھی کہ اس کی اس رائے کو تاریخی فیصلہ کی حیثیت دے دی جائے کہ امریکہ اور میکسیکو کے مابین تحویل بحرین کا معاہدہ نظر انداز کیا جاسکتا ہے کیونکہ یہ معاہدہ واضح طور پر یہ اعلان نہیں کرتا کہ ”اغواء کی اجازت نہیں ہے۔“

یورپ

دوسری جنگ عظیم کے آخری دنوں میں ہنگری کے فاشٹ رہنما جان پچا کر مغرب کی جانب بھاگنے کے لیے ایک ایسی ٹرین میں سوار ہوئے جو ہنگری کے یہودیوں سے لوٹنے سامان سے بھری ہوئی تھی۔ اس میں کھالیں، نادر و نایاب ڈاک کے گٹ، فون، فلیف سے معلق بے شمار نوادرات، بیش قیمت غالیچے اور شادی کی انگوٹھیوں سے بھرا ہوا کم از کم ایک تھال تھا۔ یہ تمام سامان ہولو کاسٹ کے متاثرین سے لوٹا گیا تھا۔ ٹرین جیسے ہی آسٹریا کی حدود میں داخل ہوئی امریکی فوجی دستوں نے اسے روک لیا اور پھر امریکی فوجی افسروں اور نچلے درجے کے فوجیوں نے جی بھر کر اس لوٹ کے مال کو اپنا حق سمجھ کر وصول کیا۔ جنگ کے بعد ہنگری کے یہودیوں کی جانب سے بار بار دائر کیے جانے والے مقدمات کے باوجود ان بیش قیمت اشیاء میں سے بہت کم ایسی تھیں جو اپنے اصل مالکان کو واپس ملیں۔

1949ء میں امریکہ نے ہنگری کے مال غنیمت میں سے مصوری کے 1,181

نمونے آسٹریا کو بھجوا دیئے جو کہ ان بین الاقوامی معاہدوں کی خلاف ورزی تھی جن کی رو سے دوسری جنگ عظیم کے دوران ”ثقافتی ورثہ“ پر مشتمل لوٹا ہوا تمام مال اس کے ”اصل ملک“ کو واپس پہنچا دیا جائے گا۔ ٹروین انتظامیہ کے خیال میں اس خزانہ کو مشرقی یورپ کی اشتراکی حکومتوں کے حوالے کرنے سے بہتر آسٹریا کو دے دینا تھا۔ آسٹریا جو ایڈولف ہٹلر کا دیرینہ رفیق جرم تھا۔

گوئے مالا

1954ء میں سی آئی اے کے لائے ہوئے انقلاب کے بعد امریکہ نے اس امید

پر بہت بڑی تعداد میں اہم دستاویزات گونے مالا کی حکومت سے چھین کر اپنے قبضہ میں کر لیں کہ شاید ان کے ذریعہ جیکب آرہیز کی حکومت بکے پیچھے کارفرما بین الاقوامی اشتراکی سازش کا پردہ چاک ہو جائے۔

آخر کو آرہیز حکومت کا تختہ الٹنے کے لیے امریکہ کی یہی تو سرکاری دلیل رہی ہے۔ مگر ان دستاویزات کے ذریعہ جو کچھ سامنے آیا اسے منظر عام پر نہیں لایا گیا۔

گریناڈا

اکتوبر 1983ء میں جزیرہ پر مکمل طور پر غیر قانونی اور تباہ کن جارحیت کے دوران امریکہ کو سرکاری فائلیں کھگانے کا وقت مل گیا اور بہت بڑی تعداد میں اہم دستاویزات اس نے اپنے قبضہ میں کر لیں۔ ان دستاویزات کو امریکہ لانے کے بعد سرکاری اہلکاروں نے ان میں سے منتخب دستاویزات اشاعت کے لیے پریس کے حوالے کر دیں۔ یہ وہ دستاویزات تھیں جن میں گریناڈا کی حکومت کے مختلف ممالک کے ساتھ فوجی تعاون کے معاہدے تھے۔ ان دستاویزات کو منظر عام پر لانے کا مقصد امریکی حکومت کی پوزیشن صاف کرنا اور یہ ثابت کرنا تھا کہ روس اور کیوبا جزیرہ پر قبضہ کا منصوبہ بنا رہے تھے تاکہ پورے خطے کو عدم استحکام سے دوچار کیا جائے۔ تاہم ان دستاویزات کے ذریعہ ایسی کوئی بات سامنے نہیں آئی۔ بعد ازاں سی آئی اے کے ڈائریکٹر ولیم کیسی کو یہ تسلیم کرنا پڑا کہ حقیقت میں ان دستاویزات سے ”کچھ نہیں ملا۔“

پانامہ

دسمبر 1989ء میں اپنی جارحیت کے دوران امریکہ نے ہزاروں سرکاری دستاویزات نہ صرف قبضہ میں لے لیں بلکہ انہیں واپس کرنے سے بھی انکار کر دیا۔ قابض امریکی فوج حکام بالائی جانب سے بغیر کسی خوف و خطر کے پورے ملک میں آزادانہ گشت کرتی تھی اور اس دوران میڈیا، سیاسی جماعتوں (خاص طور پر بائیں بازو سے تعلق رکھنے والی جماعتوں) مزدور تنظیموں وغیرہ کے دفاتر میں گھس کر اہم دستاویزات اور سرکاری فائلیں کھگالتے اور اپنے قبضہ میں لے لیتے۔ امریکہ نے 52,000 سے زائد ہتھیار جن میں ہر قسم کا فوجی ساز و سامان اور راکٹ لانچرز تھے اپنے قبضہ میں لے لیے۔ بعد ازاں پانامہ کی جانب سے اس سامان کی قیمت طلب کی گئی مگر نہ تو کوئی چیز واپس کی گئی نہ قیمت ادا کی گئی۔

جرمنی

1990ء میں مشرقی جرمنی کی حکومت کے خاتمے کے کچھ عرصہ بعد سی آئی اے نے ملک کی خفیہ ایجنسی سٹاس کی خفیہ دستاویزات اڑالیں۔ اگلے نو سالوں تک جرمن حکومت کی بار بار کی درخواستوں کے باوجود امریکہ نے سوائے چند ایک پرزوں کے یہ مواد واپس کرنے سے انکار کر دیا۔

صدر کلنٹن نے تو جرمن چانسلر کے ساتھ اس موضوع پر مذاکرات کرنے سے بھی کئی بار انکار کیا۔ بالآخر اکتوبر 1999ء میں سی آئی اے نے اعلان کیا کہ ان فائلوں کا ایک بڑا حصہ واپس کر دے گی مگر بڑی تعداد میں منتخب فائلیں بدستور ایجنسی کے پاس رہیں گی۔ سٹاس کی فائلوں میں بے شمار افراد کے بارے میں مکمل معلومات ہیں اور سی آئی اے نہیں چاہتی کہ ان کی شناخت ہو کیونکہ ان میں بہت سے اس کے اپنے ایجنٹ ہیں جو مغربی جرمنی میں جاسوسی کرتے رہے تھے اور سٹاس اس بات سے آگاہ تھی۔ دیگر بہت سی فائلیں ہو سکتا ہے کہ سی آئی اے کے لیے اس لیے اہمیت کی حامل ہوں گی کہ ان میں ان اہم شخصیات کے بارے میں معلومات ہیں جنہیں سی آئی اے بلیک میل کر سکتی ہے۔ خواہ کسی بھی مقصد کے لیے مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ فائلیں سی آئی اے کے لیے بے حد قیمتی ہیں اور وہ انہیں استعمال کر سکتی ہے۔

عراق

1991ء میں خلیج فارس کی جنگ کے دوران کردوں نے عراقی حکومت کی 18 ٹن کی دستاویزات قبضہ میں لے لیں جن پر بعد ازاں امریکہ نے قبضہ کر لیا۔ یہ کاغذات اب باؤلڈر میں کولوراڈو یونیورسٹی میں موجود ہیں جنہیں عوام دیکھ سکتے ہیں۔ عراق نے ان دستاویزات کی واپسی کا مطالبہ نہیں کیا شاید یہ جانتے ہوئے کہ اس قسم کی درخواستوں کے جواب میں سوائے ذلت کے کچھ ہاتھ نہیں آتا۔

مینی

1994ء میں جین برٹریڈ اریسائیڈ کے اقتدار میں واپس آنے تک امریکی فوج نے مینی کی فوج اور پیرالمٹری تنظیموں سے متعلق اندازاً 160,000 دستاویزات، آڈیو اور ویڈیو ٹیپ (جن میں تشدد آمیز واقعات فلمبند تھے) اور مسخ شدہ الاشوں اور معذور کئے جانے والے

متاثرین کی تصاویر اپنے قبضہ میں لے لی تھیں۔ امریکہ نے اس وقت تک اس لوٹ کے مال کو واپس کرنے سے انکار کر دیا جب تک کہ اس میں سے چھائی نہ کر لی جائے کہ کونسا رکھنا ہے اور کونسا واپس کرنا ہے اپنی مرضی کے مطابق اس کو سنسر نہ کر لیا جائے اور جب تک بیٹی کی حکومت امریکی پابندیوں کے مطابق اس کے استعمال پر رضامند نہ ہو جائے۔

بیٹی کی آمرانہ حکومت 'مسلح افواج' ڈیجھ سکواڈز تشدد پسند عناصر، منشیات کے تاجروں اور بے شمار دیگر جرائم پیشہ اور بدعنوان عناصر کے ساتھ مل کر سی آئی اے اتنے برسوں تک جو کچھ کرتی رہی امریکہ کے لیے اس مواد کو روکنے کی سب سے بڑی وجہ ہی یہ تھی۔ تاہم بیٹی کے صدر رینے پر یویل نے بیان دیا کہ "ہم کسی قسم کی کاٹ چھانٹ کے بغیر مکمل دستاویزات واپس لینا چاہتے ہیں۔"

1995ء سے بیٹی کی حکومت کھلے خطوط ذاتی خط و کتابت، پریس کانفرنسوں اور بین الاقوامی ذرائع کے توسط سے ان دستاویزات کی واپسی کا مطالبہ کر رہی ہے۔ اس سلسلہ میں اس کی حمایت کرنے والوں میں اقوام متحدہ اور اے ایس بیٹی کے لیے انسانی حقوق کا مشن امریکی کانگریس کے موجودہ اور سابق اراکین کی کثیر تعداد امریکہ اور بیرون ملک مذہبی اور قومی گروپ تین نوبل انعام یافتگان، ایمنسٹی انٹرنیشنل اور ہیومن رائٹس واچ شامل ہیں۔ اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کمیشن نے دستاویزات کی واپسی کا مطالبہ کیا تا کہ حقیقت حال واضح ہو سکے کہ "کس معاملہ کا کون کس حد تک ذمہ دار ہے" اور انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کے بارے میں صحیح اندازہ لگایا جاسکے۔ یہاں تک کہ برطانوی دفتر خارجہ نے بھی امریکی حکمہ خارجہ کے سامنے یہ مسئلہ اٹھایا۔ دستاویزات کی واپسی کے دلاء کا اس حوالے سے کہنا ہے کہ شہادت کی غیر موجودگی ان لوگوں کے حق میں ہے جو 1991ء کے انقلاب میں جس میں آریڈرائیڈ کی منتخب جمہوری حکومت کا تختہ الٹا گیا تھا شریک تھے اور آج بیٹی عدم تحفظ اور ناانصافی کی جس صورتحال سے دوچار ہے وہ اس کے ذمہ دار ہیں۔

بیٹی 'اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کمیشن میں اس کیے حامی اور جنرل اسمبلی کئی سالوں سے اس قرارداد کو کہ امریکہ بیٹی کی دستاویزات واپس کر دے منظور کرانے کی کوششوں میں مصروف ہیں مگر امریکہ ان کی تمام تر کوششوں کو بڑے آرام سے ناکامی سے دوچار کر دیتا ہے۔

سی آئی اے نے نیلسن منڈیلا کو 28 برس کے لیے جیل کیسے بھیجا؟

جب فروری 1990ء میں نیلسن منڈیلا جیل سے رہا ہوا تو صدر جارج بش نے اس
سیاہ کام افریقی رہنما کو بذات خود فون کر کے بتایا کہ تمام امریکی اس کی ”رہائی پر خوشیاں منا
رہے ہیں۔“

یہ وہی نیلسن منڈیلا تھا جو 28 برس تک اس لیے قید میں رہا کہ سی آئی اے نے
جنوبی افریقہ کے حکام کو یہ اطلاع فراہم کی تھی کہ وہ کہاں روپوش ہے۔

اور یہ وہی جارج بش تھا جو سی آئی اے کا سربراہ رہا تھا، جو آٹھ برس تک امریکہ کا
نائب صدر رہا، جس کی سی آئی اے اور نیشنل سکیورٹی ایجنسی کے جنوبی افریقہ کی خفیہ ایجنسی کے
ساتھ نہایت قریبی روابط تھے اور وہ اسے منڈیلا کی افریقن نیشنل کانگریس کے بارے میں تمام
اطلاعات فراہم کرتی تھیں۔ افریقن نیشنل کانگریس ایک ترقی پسند قومی تحریک تھی جس کے
افریقہ کے دیگر ممالک پر بھی اثرات محسوس کیے جاتے تھے۔ جس کی وجہ سے امریکہ نے یہ نتیجہ
اخذ کیا کہ وہ بین الاقوامی اشتراکی سازش کا ایک اہم حصہ ہے۔ مزید برآں جنوبی افریقہ
امریکہ لیے یورینیم کے اہم ذریعہ کی حیثیت سے کام کر رہا تھا اور امریکہ اقوام متحدہ میں جنوبی
افریقہ کا سب سے بڑا حمایتی تھا۔ گویا دونوں کے ایک دوسرے کے ساتھ مفادات وابستہ
تھے۔

15 اگست 1962ء کو 17 ماہ سے روپوش نیلسن منڈیلا کو مسلح پولیس نے اس وقت

حراست میں لیا جب وہ شو فر کے بہروپ میں ایک گاڑی چلا رہا تھا جس کی عقبی نشست پر سفید

فاہ مسافر کی حیثیت سے بیٹھا تھا۔ پولیس نے ہاوک کے بیرونی راستوں پر رکاوٹیں کھڑی کی ہوئی تھیں جب وہ وہاں پہنچا تو اسے گرفتار کر لیا گیا۔ آج تک اس بات کی کھل کر وضاحت نہیں کی گئی کہ پولیس وہاں تک کیسے پہنچی۔ تاہم جولائی 1986ء میں جنوبی افریقہ کے تین اخبارات کے ذریعہ جو خبریں منظر عام پر آئیں (جنہیں بعد میں لندن کے اخبارات اور سی بی ایس ٹی وی نے ہو بہو شائع کیا) ان سے اس سوال کا جواب بہت حد تک سامنے آ گیا۔ ان خبروں میں بتایا گیا تھا کہ کیسے ڈونلڈ سی رکارڈ نامی سی آئی نے ایک افسر نے جو ڈربن میں سفارتخانے کے افسر کی حیثیت سے کام کرتا تھا سیشل براؤن کو اطلاع دی کہ منڈیلا شوفر کے بھیس میں ایک گاڑی میں سفر کر رہا ہے جس کا رخ ڈربن کی جانب ہے۔ رکارڈ کو یہ اطلاع افریقن نیشنل کانگریس میں اپنے ایک ممبر کے ذریعہ ملی تھی۔

اس کے ایک سال بعد جنوبی افریقہ میں سی آئی اے کے ایک زر خرید بدنام کرنل ”جنونی مایک“ ہور کے گھر اپنی الوداعی تقریب کے موقع پر شراب کے نشہ میں دھت رکارڈ کی زبان پھسل گئی اور اس نے خود اپنی زبان سے اعتراف کیا کہ اس بد قسمت رات اس کی منڈیلا کے ساتھ ملاقات طے تھی مگر اس سے قبل اس کی بجائے پولیس وہاں پہنچ گئی۔ وہاں موجود سب نے اس کا یہ اقبال بیان سنا اور جب سی بی ایس ٹی وی کے نمائندہ نے اس سے رابطہ کیا تو رکارڈ نے اس موضوع پر گفتگو کرنے سے انکار کر دیا۔

سی بی ایس ٹی وی کے خبر نگار ایلن پیز نے 1986ء میں یہ خبر منظر عام پر آنے کے بعد صحافی جمیر ٹاملز کا ٹیلی وژن پر انٹرویو کیا۔ ٹاملز نے جو 1962ء میں جنوبی افریقہ میں تھا انکشاف کیا کہ رکارڈ نے خود نے اسے بتایا تھا کہ منڈیلا کی گرفتاری میں اس نے اہم کردار ادا کیا تھا۔

10 جون 1990ء کو ”الٹاننا جنرل اینڈ کونسلٹیوٹن“ میں خبر شائع ہوئی کہ امریکی انٹیلیجنس کے ایک ریٹائرڈ افسر نے جس کی شناخت نہیں ہو سکی انکشاف کیا کہ منڈیلا کی گرفتاری کے چند گھنٹوں بعد سی آئی اے کے ایک سینئر افسر پاؤل ایگل نے اسے بتایا کہ ”ہم نے منڈیلا کو جنوبی افریقہ کے سلامتی کے محکمہ کے حوالے کیا ہے۔ ہم نے انہیں مکمل تفصیل فراہم کی تھی کہ اس نے کیا پہن رکھا ہوگا، کس دن، کس وقت وہ کس جگہ پایا جائے گا اور پھر وہ اس تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ یہ ہمارے بہترین اور کامیاب ترین چھاپوں میں سے ایک

تھا۔

منڈیلا کی رہائی کے بعد جب ہش اور منڈیلا کے مابین ملاقات ہونے والی تھی تو ہر جانب سے یہ سوال کیا جا رہا تھا کیا ہش اس بات پر جنوبی افریقہ کے رہنما سے معافی مانگیں گے اس کی رفقاری میں امریکہ نے اہم کردار ادا کیا تھا؟ اس صورتحال میں امریکہ کی جانب سے اس رفقاری میں اپنے کردار سے انکار کسی نئے تنازعہ کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتا تھا اس لیے وہاں ہاؤس کی ترجمان مارلین فیئر وائر نے اس سوال کے جواب میں یہ بیان جاری کیا کہ ”یہ واقعہ کینیڈی انتظامیہ کے دوران ہوا تھا..... کینیڈی کی کارروائیوں کا ہمیں ذمہ دار نہ ٹھہرائیں۔“

سی آئی اے کے بیان کے مطابق ”اس قسم کے الزامات پر کسی قسم کا تبصرہ کرنا ہماری پالیسی کے خلاف ہے۔“ یہ بیان انجنسی اس وقت جاری کرتی ہے جب وہ محسوس کرتی ہے کہ اس صورتحال میں کوئی بھی بیان جاری کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ بے شمار دیگر مواقع پر سی آئی اے نے ہر قسم کے الزامات کے حوالے سے اپنے بیانات جاری کئے ہیں کیونکہ اسے پتہ تھا کہ یہ بیانات اس کے مقاصد کے لیے فائدہ مند ثابت ہوں گے۔

جب منڈیلا کی صحت اور جوانی جیل کی سلاخوں کے پیچھے ڈھل رہی تھی تو ڈونالڈ ریکارڈ یگوسا سپرنگ کولور اڈو میں بہت سکون اور آزادی کے ساتھ اپنی ریٹائرمنٹ کے بعد کی زندگی سے لطف اندوز ہو رہا تھا وہ آج بھی وہیں رہائش پذیر ہے۔

سی آئی اے اور منشیات صرف اتنا کہو ”کیوں نہیں؟“

”ڈرگ انفورسمنٹ ایڈمنسٹریشن اور متعلقہ ایجنسیوں میں میرے تیس سالوں کے دوران وہ اہم نام جو میری تحقیقات کا نشانہ بنے تقریباً سب ہی مستقل طور پر سی آئی اے کے لیے کام کر رہے تھے۔“
(ڈینس ڈیل، سابق چیف ڈی ای ای یونٹ)

فرانس 1947-51ء

مارسیلز، سسلی اور کورسیکا میں جرائم پیشہ گروہوں کے مافیا اور کورسیکا کنکریٹ پارٹی کی مزدور یونینوں پر قابو پانے اور بڑے پیمانے پر سی آئی اے کی جانب سے ہتھیار اور سرمایہ فراہم کیا جاتا تھا اس کے ساتھ ساتھ نفسیاتی جنگ بھی جاری تھی۔ وہ سی آئی اے کے لیے کام کر رہے تھے اور سی آئی اے نے جواب میں ان بد معاشوں کے راستے میں حائل تمام مشکلات کا خاتمہ کر دیا۔ نہ تو انہیں جرائم سے روکا جاتا تھا نہ کسی جرم میں گرفتار کیا جاتا اس کے علاوہ جنگ کے دوران ختم کر دیے جانے والے اس ہیروئن ریکٹ کو از سر نو زندہ کر دیا گیا جو کہ دودھائیوں تک ہیروئن کے کاروبار کا بے تاج بادشاہ رہا تھا اور امریکہ میں ہیروئن کو متعارف کرانے کا ذمہ دار تھا۔

جنوب مشرقی ایشیاء 50ء سے 70ء کی دہائی کے آغاز تک

چین کی قوم پرست فوج جسے 1949ء میں اشتراکیوں سے شکست کھانے کے بعد

زبردستی جلاوطن کر دیا گیا تھا اس فوج کا حصہ بن گئی جسے کمیونٹ چین کے خلاف جنگ لڑنے کے لیے سی آئی اے نے برما میں منظم کیا تھا۔ انجینی نے اس حقیقت سے بھی نظریں چرا لیں کہ ان کے نئے ساتھی سنہری نگون (برما تھائی لینڈ اور لاؤس کے حصے) میں جو دنیا بھر میں افیم اور ہیروئن کی پیداوار کا سب سے بڑا ذریعہ ہے ہیروئن کے ٹھیکیدار بن رہے تھے۔ ایئر امریکہ سی آئی اے کی قابل اعتماد ایئر لائن پورے جنوبی مشرقی ایشیاء میں منشیات کی ترسیل کا فرض ادا کرتی تھی۔ وہ منشیات لے کر ان مقامات پر پہنچاتی جہاں افیم سے ہیروئن بنائی جاتی تھی اور پھر اسے بحری جہازوں پر لے کر لانے کے لیے مخصوص مقامات پر لے جایا جاتا جہاں سے یہ مغربی خریداروں کو پہنچائی جاتیں۔

جن دنوں امریکی فوج ویتنام اور لاؤس میں کارروائیوں میں مصروف تھی سی آئی اے ان قبائلیوں اور ماہرین جنگ کے ساتھ مل کر کام کر رہی تھی جو کہ افیم کی کاشت میں ملوث تھے۔ ان عناصر سے جنگی جاہلانہوں اور خفیہ معلومات کے حصول کے بدلے میں انجینی نے منشیات کے کاروبار میں انہیں مکمل تحفظ فراہم کیا۔ ایئر امریکہ کے پائلٹ ایک بار پھر پورے علاقہ میں افیم اور ہیروئن کی ترسیل میں مصروف ہو گئے۔ اس سے ایک تو سی آئی اے کے فوجی اور سیاسی حلیفوں کی ذاتی اور دیگر ضروریات بھی پوری ہو جاتی تھیں اور خود سی آئی اے کی جیبیں بھی بھر جاتی تھیں۔ اس طرح انجینی کی خفیہ کارروائیوں کے لیے بجٹ کے علاوہ اضافی سرمایہ مل جاتا تھا۔ بلاخر اس کام نے ویتنام میں بے شمار GIS کو ہیروئن کا عادی بنا دیا۔

یہ کارروائی کسی دور اندیشی کا کمال نہیں تھی۔ ہیروئن کو شمالی لاؤس میں سی آئی اے ہینڈ کوآرڈرز میں واقع ایک لیبارٹری میں خالص بنایا جاتا تھا۔ امریکی فوجی جارحیت کے 20 سال بعد جنوب مشرقی ایشیا دنیا کی 70 فیصد غیر قانونی افیم کی پیداوار کا ذریعہ اور امریکی منڈی میں ہیروئن کی بڑھتی ہوئی مانگ کو پورا کرنے والا سب سے بڑا سپلائر بن گیا۔

آسٹریلیا 1973-80ء

سڈنی کے نوگان ہینڈ بینک کے سی آئی اے کے ساتھ دیرینہ نہیں تو قریبی تعلقات ضرور تھے۔ بینک کے افسران میں امریکی جرنیل ایڈمرل اور سی آئی اے کے ”سابقہ“ کارکن بھی تھے۔ ان میں ولیم کو لے بھی جو کچھ عرصہ قبل انجینی کا ڈائریکٹر رہا تھا اس بینک کے وکلاء

میں شامل تھا۔ بینک کا ایک حصہ دار بانی مائیکل ہینڈ گرین ہیٹ رہا تھا اور لاؤس میں سی آئی اے کا کنٹریکٹ ایجنٹ تھا جو ایئر امریکہ کے ساتھ کام کرتا رہا تھا۔ بہت سے کھاتے دار جن کے سرمایہ سے بینک نے کام کا آغاز کیا ایئر امریکہ کے ملازم تھے۔

بینک بہت تیزی سے ترقی کرتے ہوئے اس حد تک پھیل گیا کہ سعودی عرب، یورپ، جنوب مشرقی ایشیاء، جنوبی امریکہ اور امریکہ میں اس کی شاخیں قائم ہو گئیں۔ بہت جلد اس کا شمار ان بینکوں میں ہونے لگا جو منشیات کے بین الاقوامی سودا گروں (جن سے لوگان ہینڈ از خود درخواست کرتا تھا) سیاہ دھن کو سفید بنانے والوں، اسلحہ کے بیوپاریوں اور سی آئی اے (جو بینک کو خفیہ کارروائیوں سے حاصل ہونے والی رقم محفوظ کرنے کے لیے استعمال کرتا تھا) کے منظور نظر تھے۔ 1980ء میں یکے بعد دیگرے کئی پراسرار اموات کے باعث بینک ڈوب گیا اور 50 ملین ڈالر کا قرضدار بن گیا۔

پانامہ 70ء اور 80ء کی دہائی

پانامہ کا سربراہ جنرل مینول نوریکا کئی دہائیوں تک سی آئی اے کا مخدومہ دار ساتھی اور خفیہ کارروائیوں میں اس کا نہایت قریبی معاون رہا تھا۔ حالانکہ 1971ء کے آغاز میں ہی امریکہ کے منشیات سے متعلقہ حکام کے علم میں یہ بات آچکی تھی کہ نوریکا منشیات کے کاروبار اور سیاہ دھن کو سفید بنانے کی کارروائیوں میں بری طرح سے ملوث ہے۔ نوریکا نے نکارا گوا کوئٹرا اس میں منشیات کے خلاف جنگ کی کارروائی کے سلسلہ میں مدد کرتے ہوئے متعلقہ افسران کو دہاں پہنچانے کے لیے پائلٹ مہیا کیے، اسکے ساتھ ساتھ مکمل تحفظ منشیات کے افسروں کے لیے محفوظ فضا اور ان سب کے لیے بینک سے متعلقہ ضروری سہولیات فراہم کیں۔ امریکی افسران نے جن میں سی آئی اے کا ڈائریکٹر ولیم ویسٹر اور ڈرگ انفورسمنٹ ایڈمنسٹریشن کے کئی افسران شامل تھے نوریکا کو منشیات کی روک تھام کی اس کوششوں کو سراہتے ہوئے تعریفی خطوط لکھے۔ (حالانکہ یہ سب کچھ نوریکا نے منشیات کے خلاف نہیں بلکہ اپنے مقابل آنے والے منشیات کے سودا گروں کے خلاف کیا تھا۔)

1981ء میں سی آئی اے کے ڈائریکٹر بننے والے ولیم کسی نے اعلان کیا کہ

”میں نوریکا کے منشیات کے تاجروں کے ساتھ تعلقات پر اس لیے ملامت نہیں کرتا کہ پانامہ

والے وسطی امریکہ خصوصاً نکاراگوا میں ہماری پالیسیوں کی مکمل طور پر حمایت اور بھرپور مدد فراہم کر رہے ہیں۔“

پھر حالات نوریکا کو اس پنج پر لے گئے کہ امریکہ نے اس کی سیاسی حمایت ترک کر دی اور بش انتظامیہ نے کافی پس و پیش کے بعد اس کے خلاف اقدامات اٹھانے کا فیصلہ کر لیا۔ 1989ء میں امریکہ نے پانامہ پر حملہ کر دیا اور جنرل کو انخواء کر کے جیل میں ڈال دیا۔ پھر دروغ گوئی کا سہارا لیتے ہوئے اس جارحیت کو منشیات کے خلاف جنگ قرار دے دیا حالانکہ اس حملے کے پس پردہ خارجہ پالیسی سے متعلق بے شمار معاملات تھے۔ منشیات کا کاروبار امریکہ کی لالائی ہوئی نئی حکومت کے تحت بھی اسی طرح جاری و ساری رہا۔ اگر نوریکا منشیات کی دولت کے لالچ میں مبتلا ہونے کی بجائے اشتراکیت کی حمایت کرتا تو امریکی بحری بیڑے بہت پہلے پانامہ میں داخل ہو چکے ہوتے۔

بظاہر امریکی افسر منشیات کے کاروبار کے حوالے سے اپنی پریشانی کا اظہار نہیں کرتے مگر حقیقت کچھ مختلف ہے جس کا ثبوت امریکہ میں تعینات پانامہ کے سفیر رکارڈو بلونک کا کیس ہے۔ اس نے 80ء کی دہائی میں 40 ہزار پاؤنڈ کوکین کولمبیا سے امریکہ سگل کی مگر چونکہ اس نے نوریکا کے خلاف ریاست کا گواہ بن کر عظیم خدمت انجام دی اس لیے نوریکا کی چالیس سالہ قید کے مقابلہ میں صرف تین سال کی قید ہوئی۔ اپنے مقدمہ کی کارروائی کے دوران اسے سابق صدر جیمی کارٹر، سابق انڈر سیکرٹری آف سٹیٹ ولیم ڈی روجرز اور ایک سابق سفیر برائے پانامہ کی جانب سے ہمدردی کے خطوط موصول ہوئے۔ امریکی جیلوں میں ہزاروں مرد اور عورتیں منشیات کے جرائم میں سزا کاٹ رہے ہیں مگر ان سب نے مل کر بھی منشیات کی اتنی سہولت نہیں کی جتنی کہ اکیلا بلونک کر چکا ہے۔

وسطی امریکہ 80ء کی دہائی

امریکہ کا قلعہ ہوا اصولی ہے۔ انہیں منشیات کی سہولت کرنے دو قتل، زنا، انخواء، تشدد کرنے، دوسکول اور ہسپتال جلانے دو جب تک وہ ہماری جنگ لڑ رہے ہیں وہ ہمارے آدمی ہیں ہمارے نہایت ہی پیارے اور دیرینہ ساتھی۔

نکاراگوا میں بائیں بازو کی مینڈیٹا حکومت کا تختہ الٹنے کے مقصد کو مد نظر رکھتے

ہوئے ریگن انتظامیہ کے افسران نے منشیات کے کاروبار میں اس وقت بھرپور معاونت کی جب تک منشیات کے سوداگر کوئٹرا میں امریکہ کی حمایت کرتے رہے۔ 1989ء میں دہشت گردی، نارکوٹکس اور بین الاقوامی کارروائیوں کے حوالے سے سینٹ کی ذیلی کمیٹی (دی کیری کمیٹی) تین سالہ تحقیقات کے بعد اس نتیجہ پر پہنچی کہ

”کوئٹرا اس کوئٹرا پائلٹوں، کوئٹرا سپلائرز کوئٹرا اس کے لیے کام کرنے والے زر خرید و اور پورے علاقہ میں کوئٹرا کے حامیوں کے خلاف جنگی علاقوں میں منشیات کی سہولت کے بے شمار ثبوت تھے..... وسطی امریکہ میں موجود امریکی اہلکار نکاراگوا کے خلاف جاری جنگی کارروائیوں کے بگڑ جانے کے خدشہ کی وجہ سے منشیات کے مسئلہ کو حل کرنے میں ناکام رہے..... ہر معاملہ میں امریکی حکومت کی ہر دوسری ایجنسی کے پاس سہولت کے بارے میں مکمل معلومات تھیں..... امریکہ کے سینئر پالیسی ساز اس خیال سے متفق نہیں تھے کہ منشیات سے حاصل ہونے والی رقم کوئٹرا اس کے مالی مسائل کا حتمی حل ہے۔“

کوسٹاریکا میں جو کہ کوئٹرا اس کی ”جنوبی سرحد“ کی حیثیت سے کام کرتا تھا (جبکہ ہونڈوراس شمالی سرحد کی حیثیت سے) کئی سی آئی اے۔ کوئٹرا نیٹ ورک منشیات کے کاروبار میں ملوث تھے۔ ان میں سی آئی اے کا نہایت قریبی ساتھی جان ہل بھی تھا۔ اس امریکی کے نکاراگوا کے ساتھ کوسٹاریکا کی سرحد پر واقع فارمز کوئٹرا اس کی کارروائیوں کے لیے اہم ترین مرکزی مقام کی حیثیت رکھتے تھے۔ ہل اور سی آئی اے سے تعلق رکھنے والے کوئٹرا کے دیگر حامی اور پائلٹ میامی کے رہائشی کوئٹرا اس کے ساتھ مل گئے جو منشیات کا بہت بڑا تاجر تھا اور جس نے بعد میں یہ تسلیم کیا کہ اس نے 4 ملین ڈالر سے زائد رقم کوئٹرا اس کو فراہم کی تھی۔ موویلز کے ہوائی جہاز فلوریڈا سے ہتھیار لاد کر وسطی امریکہ جاتے جہاں سے کوئٹرا لے کر واپس آتے۔

1989ء میں کوسٹاریکا حکومت کی جانب سے ہل کو منشیات کے کاروبار میں ملوث قرار دیے جانے کے بعد ڈرگ انفورسمنٹ ایڈمنسٹریشن نے زبردستی اور غیر قانونی طور پر اسے کرائے کے ہوائی جہاز میں سوار کرایا اور میامی پہنچا دیا۔ بعد میں امریکہ نے کوسٹاریکا کی

جانب سے ہل کو واپس لے جا کر اس پر مقدمہ چلانے کی تمام کوششیں ناکام بنا دیں۔ اسی طرح کوئٹہ کے منشیات کے ایک گروہ کو جو کہ کاسٹرو مخالف سرگرمیوں میں ملوث تھا سی آئی اے نے کوئٹہ کی فوج کی تربیت کے لیے کرایہ پر حاصل کر رکھا تھا۔ کیوبا کے بہت سے باشندے عرصے سے سی آئی اے کے ساتھ منشیات کے کاروبار میں ملوث تھے۔ وہ کوئٹہ کے ہوائی جہاز اور کوئٹہ کی ایک شرمپ کمپنی جو کہ سی آئی اے کے کالے دھن کو سفید کرتی تھی کے ذریعہ منشیات امریکہ پہنچاتے تھے۔

ہونڈراس کی جانب سے امریکہ کو اس بات کی اجازت دے دی گئی کہ وہ اس کے ملک کو ایک بہت بڑے فوجی اڈے میں تبدیل کر سکتا ہے تو بدلے میں سی آئی اے اور ڈرگ انفر سمٹ ایڈمنسٹریشن نے ہونڈراس کے ان فوجی افسروں، سرکاری اہلکاروں اور دیگر اہم شخصیات کو کھلی چھٹی دے دی جو منشیات کے کاروبار میں ملوث تھے۔ سی آئی اے نے خود ہونڈراس کے ایک بہت بڑے منشیات کے تاجر ایلن ہائیڈ کو تمام مجرمانہ سرگرمیوں کا ”گاڈ فادر“ قرار دے رکھا تھا۔ امریکہ کی سرکاری رپورٹوں کے مطابق کوئٹہ کو سپلائی کرنے کے لیے اس کی کشتیاں استعمال ہوتی تھیں بدلے میں انجینی نے ہائیڈ کے منشیات کے کاروبار کے خلاف ہونے والی ہر قسم کی کارروائی کو ناکام بنا دیا۔ سی آئی اے کی ایک رپورٹ کے مطابق ہائیڈ کے سی آئی اے سے تعلقات کو نہایت سمجھداری سے دستاویزی شکل دی گئی ہے کہ کسی بھی قانونی کارروائی کی صورت میں انہیں ثابت کرنا مشکل ہوگا۔

منشیات کے حوالے سے سی آئی اے کے اور بھی بہت سے مددگار اور ساتھی تھے۔ جیسے کہ گوئے مالا کی فوج کی خفیہ سروس کے سی آئی اے کے ساتھ نہایت دیرینہ تعلقات تھے۔ اس نے منشیات کے بہت سے تاجروں کو پناہ دے رکھی تھی۔ اور ایل سیلوڈور میں قائم الو پانگو فضائی اڈہ جس کے بغیر ملک کے گوریلوں کے خلاف امریکہ کے لیے فوجی مداخلت کرنا بے حد مشکل تھا۔ امریکی فوجی مداخلت کے لیے یہ اہم ترین عنصر کی حیثیت رکھتا تھا۔ ڈی ای اے کے ایک سابق اہلکار کیلیر نو کیسیلیو نے جو کہ ایل سیلوڈور میں تعینات تھا اس بارے میں لکھا ہے کہ کس طرح کوئٹہ سے بھرے ہوئے کوئٹہ کے ہوائی جہاز شمالی کی جانب روانہ ہوتے تھے اور بغیر کسی خوف و خطر کے امریکہ کے مختلف مقامات پر جن میں ٹیکساس کا فضائی اڈہ بھی شامل تھا رکتے اور پھر جنگ کے لیے کیش کی صورت میں سرمایہ لے کر واپس روانہ ہو جاتے۔

”یہ سب کچھ امریکی حکومت کی حفاظتی چھتری تلے ہو رہا تھا۔“
 الوپانگو میں تمام تر کارروائیاں فیلکس روڈریگوز (ایکامیکس گومیز) کی سربراہی میں ہوئیں جو نائب صدر جارج بش (ریگن انتظامیہ میں منشیات کا بادشاہ) کو اور ریگن کی قومی سلامتی کونسل کے رکن اولیور ناتھ کو رپورٹ پیش کرتا۔ اولیور ناتھ کوئٹرا کی کارروائیوں کی بھی نگرانی کر رہا تھا 9 اگست 1985ء کو ناتھ نے اپنی ڈائری میں درج کیا کہ ”ہونڈراس کا ڈی سی۔6 جو نیو آریز سے باہر جانے کے لیے استعمال ہوتا ہے شاید امریکہ میں منشیات پہنچانے کے لیے استعمال ہو رہا ہے۔“

الوپانگو ایئر پورٹ کے بینگنز میں سے ایک سی آئی اے کی ملکیت تھا جبکہ ایک اور قومی سلامتی کونسل کے پاس تھا۔ جب کاسٹیلو نے ڈی ای اے ہیڈ کوارٹر کو ایل سیلوڈور سے امریکہ جانے والی منشیات سے لدی ہوئی پروازوں کی تفصیلات سے آگاہ کیا تو حکام نے اس کی رپورٹوں کو مکمل طور پر نظر انداز کرتے ہوئے اسے ایجنسی کی ملازمت سے فارغ کر دیا۔
 جب محکمہ کے ایک با اختیار افسر نے جو کہ منشیات کی ان پروازوں سے آگاہ نہیں تھا اور اس نے تمام مال حراست میں لے لیا تو نادیدہ طاقتور ہاتھوں نے یہ کیس ختم کر دیا اور اسے دس نکالا دے دیا۔ کہا جاتا ہے کہ ایک امریکی کسٹم ایجنٹ کو ٹیکساس سے واپس واشنگٹن بلا لیا گیا کیونکہ وہ کسٹم میں منشیات کے کاروبار کی نہایت سرگرمی سے تحقیقات کر رہا تھا۔

ایک اور معاملہ ہونڈراس کے جزل جو سے بونسوروسا کا بھی ہے جس پر ہونڈراس کے صدر کے قتل کی سازش کا الزام عائد کیا گیا تھا اس منصوبہ کے لیے مالی امداد منشیات کے بہت بڑے سودے کے ذریعہ ملی تھی۔ ریگن انتظامیہ کے سینئر افسران نے اس میں مداخلت کرتے ہوئے وفاقی جج کو بونسو کی کونٹراس کے لیے خدمات کا لحاظ کرتے ہوئے اس کے ساتھ نرمی برتنے کو کہا تب اسے 5 سال کی قید ہوئی جبکہ دیگر مدعا علیہان کو 40 برس کے لیے جیل بھیج دیا گیا۔

رابطے ہر طرف نظر آتے ہیں: وہ چار کمپنیاں جنہوں نے کونٹراس میں انسانی ہمدردی کے طور پر امداد فراہم کی منشیات کے بیوپاریوں کی ملکیت تھیں اور وہ ہی انہیں چلا رہے تھے اور امریکہ میں منشیات کے کاروبار کے حوالے سے زیر تفتیش ہونے کے باوجود ان کمپنیوں کو محکمہ خارجہ سے 800,000 ڈالرز کے ٹھیکے ملے تھے۔ ”جنوبی فضائی ٹرانسپورٹ“

(Southern Air Transport) جو کہ پہلے سی آئی اے کی ملکیت تھی پھر بینا گون کے ساتھ اس کا معاہدہ ہو گیا تھا مکمل طور پر منشیات کے کاروبار میں ملوث تھی منشیات ادھر سے ادھر پہنچانا اسی کی ذمہ داری تھی۔

میامی کے ایک سابق اٹارنی نے کیری کمیٹی کو بتایا کہ ”محکمہ انصاف کے افسروں نے مجھے بتایا کہ ان کے محکمے کے نمائندوں نے ڈی ای اے اور ایف بی آئی کے ساتھ 1986ء میں اس معاملہ پر غور کرنے کے لیے ملاقات کی تھی کہ عدالتی کارروائی کو آگے بڑھانے کیلئے سینٹر کیری کی کوششوں کو کس طرح ناکامی سے دوچار کیا جائے۔“

سی آئی اے کے کام کو آسان بنانے اور ایسی صورت میں جب کہ منشیات کا کاروبار ہر لحاظ سے سودمند ہو سی آئی اے کو قانونی تحقیقات کے جھنجٹ سے آزاد کرنے کے لیے 1982ء میں ایجنسی کے ڈائریکٹر ولیم کیسی نے اٹارنی جنرل ولیم فرنج سمٹھ کے ساتھ نہایت ہی خفیہ ”میمو آف انڈر سٹینڈنگ“ پر مذاکرات کیے جس کا مقصد یہ تھا کہ سی آئی اے کو منشیات کے کاروبار سے متعلق ہونے والی کارروائیوں اور اس حوالے سے جو کوئی بھی اس کے لیے کام کرتا ہے اس کی رپورٹ پیش کرنے کی کسی بھی قانونی ذمہ داری سے مستثنیٰ کر دیا جائے۔ 1995ء تک اس معاہدہ کو مکمل طور پر منسوخ نہیں کیا گیا تھا۔

جنوبی امریکہ 90ء کی دہائی

1996ء میں میامی کی وفاقی جیوری نے ویزویلا کے جنرل روس گیلن ڈویلا پر 1987ء اور 1991ء کے دوران 22 ٹن کوکین امریکہ سمگل کرنے کا الزام عائد کیا۔ اس وقت جب وہ اس کارروائی میں مصروف تھا وہ ویزویلا نیشنل گارڈ اینٹی ڈرگ بیورو کا سربراہ تھا اور میامی ہیرالڈ نے اسے ”ویزویلا میں سی آئی اے کا سب سے قابل اعتماد آدمی“ کا خطاب دے رکھا تھا۔

اس حوالے سے ڈی ای اے کے اعتراضات کے جواب میں سی آئی اے نے اس قدر مبہم اور غیر واضح کارروائی کی اور اس معاملہ کو اتنا الجھا دیا کہ کچھ معلوم نہیں ہو سکا کہ اس کا نتیجہ کیا نکلا یہ کارروائی کامیاب ہوئی یا نہیں۔ البتہ ایک موقع پر یہ بات منظر عام پر آئی کہ گیلن کی ایک ٹن کوکین 1990ء میں امریکہ پہنچا دی گئی تھی۔ سی آئی اے نے اسے تسلیم کیا اور پھر

اسے ”سی آئی اے کے کئی افسروں کے اندازے کی غلطی اور انتظامی تاخیر“ قرار دے کر بری الذمہ ہو گئی۔

یہ جاننے کے لیے کہ امریکہ نے 90ء کی دہائی میں ہیرو کولمبیا اور میکسیکو کے فوجی اور سرکاری اہلکاروں کے منشیات کے کاروبار میں ملوث ہونے کو کیونکر نظر انداز کیے رکھا، امریکہ کی بد معاشریاں والا باب ملاحظہ فرمائیے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ بائیں بازو کے خلاف وہ مہم تھی جو امریکہ ان کی حمایت سے چلا رہا تھا۔

افغانستان 80ء سے 90ء کی دہائی

سی آئی اے کے حمایت یافتہ باغی مجاہدین سویت یونین کی حمایت یافتہ حکومت سے لڑائی کے دوران افیون کی کاشت میں بری طرح سے ملوث تھے۔ انجینی کے سیاسی تحفظ اور فوجی انتظامی امداد نے ان کی پیداوار میں نمایاں طور پر اضافہ کیا تھا۔ سی آئی اے ٹرک اور فخر فراہم کرتی جو افغانستان میں ہتھیار لاتے اور یہی افغان پاکستان بارڈر پر واقع لیبارٹریز تک افیون پہنچانے کے لیے استعمال ہوتے جہاں افیون سے ہیروئن بنائی جاتی۔ ایک اندازہ کے مطابق اس ہیروئن کا نصف حصہ ہر سال امریکہ میں اور تین چوتھائی حصہ مغربی یورپ میں استعمال ہوتا۔ امریکی اہلکاروں نے 1990ء میں تسلیم کیا کہ وہ چونکہ پاکستانی اور افغانی حلیفوں کو ناراض نہیں کرنا چاہتے تھے اس لیے انہوں نے منشیات کی ان کارروائیوں کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھایا نہ ہی کسی قسم کی تحقیقات کیں۔ ہمیشہ کی طرح منشیات سے متعلقہ کارروائیوں میں سی آئی اے کے افسروں نے یہاں بھی۔ اس کمائی میں اپنا حصہ مخصوص کر رکھا ہوگا اور اس سے اپنی خفیہ کارروائیوں کی مالی ضروریات پوری کرتے ہوں گے اور خود اپنی بھی جیسیں بھرتے ہوں گے۔ 1993ء میں ڈی ای اے کے ایک افسر نے ”افغانستان کو منشیات کی دنیا کا نیا کولمبیا“ قرار دیا۔

ہٹی 94-1986ء

سی آئی اے نے ہٹی کی دائیں بازو کی فوج اور سیاسی رہنماؤں کے اقتدار کو قائم رکھنے کے لیے ان کے منشیات کے کاروبار کو بالکل نظر انداز کیے رکھا۔

94-1991ء کے دوران فوجی حکومت میں اختیارات کے حوالے سے تیسری اہم

ترین شخصیت جوزف مائیکل فرینکوس کو باقاعدگی سے ڈی ای ای سے ہدایات ملتی تھیں جو کہ اس کے ساتھ مل کر بیٹی میں منشیات کی مشترکہ کارروائیوں کے حوالے سے خفیہ معلومات جمع کرتی تھی۔ حالانکہ فرینکوس خود منشیات کا نمایاں تاجر تھا اور کومین میڈلین کارٹل کے ساتھ کام کرتا تھا۔ 1986ء میں جوسی آئی اے نے نیشنل انٹیلیجنس سروس کے نام سے جوئی تنظیم بنائی تھی فرینکوس کو اس میں بھی اہم حیثیت حاصل تھی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس تنظیم کے قیام کا مقصد کومین کی تجارت کے خلاف جنگ لڑنا تھا جبکہ فرینکوس سمیت اس کے دیگر افران خود اسی کاروبار میں ملوث تھے۔

امریکہ اور کومین درآمد کرنے والی ایجنسی

80, (Cocain Import Agency) کی دہائی

حکام کی جانب سے کسی قسم کی تفتیش یا پوچھ گچھ کے خطرہ کے بغیر امریکہ اترنے والے منشیات سے لدے ہوئے جہازوں کے کیسوں میں سے ایک نمایاں کیس آسکر ڈنیلو بلائڈون اور جوآن نادون مینیس کا بھی ہے۔ نکاراگوا سے تعلق رکھنے والے یہ دونوں افراد کیلیفورنیا میں رہائش پذیر تھے۔ کونٹراس کی مدد (خصوصاً اس دور میں جب کانگریس نے ان کی مالی امداد پر پابندی عائد کر رکھی تھی) اور اپنی جیبیں بھرنے کے لیے ان دونوں نے سی آئی اے کی حفاظت میں امریکہ کومین سگنل کرنا شروع کر دی جس سے لاس اینجلس کے اندرون شہر میں اس کی نہایت بھاری مقدار میں ترسیل ہوئی۔ یہ وہ وقت تھا جب منشیات کے عادی اور منشیات فروش مہنگے سفید پاؤڈر کو طاقتور چھوٹے چھوٹے کلزوں میں تبدیل کر کے مزید قابل حصول بنانے کی کوششوں میں مصروف تھے۔ نکاراگوا کے ان باشندوں نے منشیات کے کاروبار سے حاصل ہونے والے منافع کا ایک حصہ کونٹراس کی امداد کے لیے فراہم کیا جبکہ باقی رقم سے لاس اینجلس اور دیگر شہروں میں منشیات کے کاروبار کو مزید بڑھا کر جرائم پیشہ گروہوں کو اس قابل بنایا کہ وہ خود کار ہتھیار خریدیں۔

نکاراگوا کے ان دونوں باشندوں اور سی آئی اے کے مابین تعلقات کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی جیسا کہ مندرجہ ذیل واقعات سے ظاہر ہوتا ہے۔

اکتوبر 1986ء میں جب آخر کار بلڈون کو گرفتار کیا گیا (کیونکہ کانگریس نے

کونٹراس کی امداد بحال کر دی تھی اور اب بلندوں کی خدمات کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی) تو اس نے ان جرائم کو تسلیم کر لیا جنہوں نے نجانے کتنی جانیں لی تھیں۔ محکمہ انصاف سے 28 ماہ کی قید کے بعد اسے عارضی طور پر رہا کر دیا اور پھر اسے منجر کی حیثیت دیتے ہوئے۔ 166,000 ڈالرز سے زائد رقم ادا کر کے آزاد کر دیا۔

1990ء میں پولیس کی بدعنوانی کے حوالے سے لاس اینجلس میں دائر ہونے والے ایک مقدمے کے مطابق 1986ء میں بلائڈن کے خلاف چھاپے میں پولیس کو بے شمار ایسی دستاویزات ملی تھیں جن کے ذریعہ یہ ثابت ہو رہا تھا کہ کونٹراس کی آڑ میں امریکی حکومت منشیات اور کالے دھن کو سفید بنانے کے کاروبار میں ملوث تھی۔ سی آئی اے کے اہلکار چھاپے کے 48 گھنٹوں کے اندر اندر شریف کے دفتر پہنچ گئے اور گواہی کے کمرہ سے وہ تمام فائلیں غائب کر دیں۔ محکمہ انصاف کی درخواست پر ایک وفاقی جج نے اس معاملہ پر کسی بھی قسم کی بحث پر پابندی کا حکمنامہ جاری کر دیا۔

1996ء میں جب منشیات کے مقدمہ میں بلائڈن کی بطور سرکاری گواہ شہادت قلمبند ہوئی تو اس سے قبل وفاقی وکیل نے عدالت سے حکمنامہ حاصل کر لیا جس کے ذریعہ وکیل صفائی کو اس معاملہ میں سی آئی اے کے روابط کے حوالے سے کسی قسم کی چھان بین کرنے سے روک دیا گیا۔

اگرچہ ڈرگ انفورسمنٹ ایڈمنسٹریشن کے کمپیوٹر ریکارڈ پر مینس ایک نمایاں بین الاقوامی سمگلر کی حیثیت سے موجود تھا اور 1974ء کے بعد سے ہونے والی وفاقی تحقیقات 45 مختلف کیسوں میں اسے ملزم قرار دے چکی تھیں اس کے باوجود 1989ء تک کیلیفورنیا میں نہایت آزادی کے ساتھ پرسکون زندگی بسر کرتا رہا اور ایک دن بھی امریکہ کی کسی جیل میں نہیں گذارا۔

ڈرگ انفورسمنٹ ایڈمنسٹریشن امریکی سٹیز لاس اینجلس کے شریف ڈیپارٹمنٹ اور کیلیفورنیا یورو آف نارکوٹکس انفورسمنٹ سب ہی نے شکایت کی کہ مینس کے خلاف بے شمار تحقیقات کو سی آئی اے اور نام نہاد ”قومی سلامتی“ کے مفادات کے تحت روک دیا گیا۔ آخر میں سی آئی اے کو کونٹراس کے مشترکہ منشیات کے کاروبار کے حوالے جو کیس ہمارے سامنے آتا ہے وہ سان فرانسکو میں ایک امریکی اتارنی کے بارے میں ہے جس نے

نکارا گوا کے ایک زیر حراست منشیات کے سوداگر کو 36,800 ڈالر واپس کئے جو اس کے قبضہ میں پائے گئے تھے۔ یہ رقم اس وقت واپس کی گئی جب کونٹرا کے دو رہنماؤں نے عدالت کو خط لکھے اور قسمیں کھا کر یقین دلایا کہ منشیات کے سوداگر نے نکارا گوا میں جمہوریت کے احیاء کے لیے سپلائز خریدنے کی غرض سے یہ رقم دی تھی۔ ان خطوط کو ہنگامی طور پر کلاسیفائیڈ انفارمیشن پروسیجر ایکٹ وہ قانون جو مقدمے کے دوران قومی سلامتی کے رازوں کو افشاء کرنے سے روکتا ہے کے تحت سر بمبر کر دیا گیا۔ بعد میں جب سینٹ کی ایک ذیلی کمیٹی نے محکمہ انصاف سے واقعات کی غیر معمولی تبدیلی کے بارے میں سوال کیا تو انہوں نے رازداری کو آڑ بنالیا۔

سینٹ کی ذیلی ”گیری کمیٹی“ جو کہ کونٹرا میں منشیات کے کاروبار کے الزامات کی تحقیقات کر رہی تھی کے سابق چیف کونسل جیک بلیم نے اس حوالے سے یادیں تازہ کرتے ہوئے بتایا کہ ”محکمہ انصاف نے ہمیں اس حوالے سے تحقیقات کرنے متعلقہ لوگوں تک رسائی حاصل کرنے اور ریکارڈ کی چھان بین کرنے سے روک دیا یہ میری زندگی کا سب سے پریشان کن تجربہ تھا۔“

”میں اس بارے میں جتنا زیادہ غور کروں اس نتیجہ پر پہنچتا ہوں کہ یہ ویسے ہی ہے جو فرق قتل اور قتل عام میں ہوتا ہے۔ اس کا ایک مقصد تھا۔ امریکہ کو زبردین مقصد نہیں تھا بلکہ کونٹرا اس کے لیے رقم اکٹھی کرنی تھی اور انہیں (سی آئی اے کو) اس بات سے کوئی مطلب نہیں تھا کہ اس کا کیا نتیجہ نکلے گا۔ اگر وہ سیاہ فاموں میں منشیات فروخت کرنے میں ملوث تھے تو وہ اعتراف کی قیمت تھی۔“

(گیری ویب)

واحد عالمی طاقت

”واحد عالمی طاقت ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اپنے کئے پر کبھی معذرت نہ کرو“

”میں ریاستہائے متحدہ امریکہ کے لیے کبھی بھی معافی نہیں مانگوں گا
مجھے اس کی قطعی کوئی پرواہ نہیں کہ حقائق کیا ہیں۔“

(جارج بش)

کیوبا

امریکی ڈسٹرکٹ جج جیمز لارنس کنگ نے 17 دسمبر 1997ء کو کہا کہ ”کیوبا نے بین الاقوامی قانون اور بنیادی انسانی حقوق کی خلاف ورزی کرتے ہوئے بین الاقوامی فضائی حدود میں چار انسانوں کو قتل کیا۔“ اس کے بعد اس نے فلوریڈا کے رہنے والے کیوبا کے ان پائلٹوں کے جو کہ فروری 1986ء میں کیوبا کے خلاف ایک فضائی مشن کے دوران کیوبا کے جیٹ طیاروں کے ہاتھوں مارے گئے تھے خاندانوں میں 187.6 ملین ڈالر کی رقم تقسیم کی۔ (حقیقت یہ ہے کہ کیوبا کی حکومت نے اس سے زیادہ کچھ نہیں کیا جو ان حالات میں کوئی بھی حکومت کرتی۔ ہوانا نے یہ سمجھتے ہوئے کہ یہ جہاں مذموم مقاصد کے تحت کیوبا کی فضائی حدود میں داخل ہوئے ہیں پائلٹوں کو واضح طور پر خبردار کیا تھا کہ ”تم خطرہ مول لے رہے ہو۔“ اسی تنظیم کے جہاز پہلے بھی کئی بار کیوبا کی حدود میں کافی اندر تک جا چکے تھے اور انہیں کیوبا کی طرف سے انتہاء کیا جا چکا تھا کہ اب آئے تو واپس نہیں جاسکیں گے)

نومبر 1996ء میں وفاقی حکومت نے ان میں سے ہر خاندان کو 300,000 ڈالر ادا کیے۔ یہ رقم کیوبا کے مجرمہ اثاثوں سے حاصل کی گئی تھی۔

یہ انصاف کا اشتراکیت مخالف انداز تھا۔

امریکہ نے کیوبا کے دعویٰ پر کسی قسم کی توجہ دیئے بغیر نہایت حقارت سے نظر انداز کر دیا جو 31 مئی 1991ء کو ہوانا کی عدالت میں دائر کیا گیا تھا۔ اس میں کیوبا کے خلاف امریکہ کی چار دہائیوں پر محیط ”جنگ“ کے نتیجے میں ہونے والی کیوبا کے شہریوں کی ہلاکتوں اور معذوریوں کے معاوضے کے طور پر امریکہ سے 181.1 بلین ڈالر طلب کیے گئے تھے۔ امریکی ”جارجیٹ“ کے عنوان کے تحت اس دستاویز میں 1961ء میں کیوبا پر جارحیت کا ارتکاب کرنے والے مسلح باغی گروہوں کی امریکہ کی جانب سے مکمل پشت پناہی، امریکی بحری اڈہ گوانٹانامو کی جانب سے جارحانہ حملے اور جزیرہ میں متعدد امراض کے پھیلاؤ کی کارروائیوں کا احاطہ کیا گیا تھا۔

کیوبا کا دعویٰ یہ تھا کہ امریکی کارروائیوں کے دوران ہلاک ہونے والے 3,478 شہریوں میں سے ہر ایک کے لیے براہ راست ہرجانہ کے طور پر 30 ملین ڈالر اور 2,099 زخمیوں میں سے ہر ایک کو 15 ملین ڈالر ادا کیے جائیں۔ اس کے علاوہ ہر مرنے والے کے 10 ملین ڈالر اور ہر زخمی کے 5 ملین ڈالر کیوبن سوسائٹی کو واپس کیے جائیں جو اس نے امریکی حکومت کی ذمہ داری پر انہیں ادا کئے تھے۔ یہ مطلوبہ رقم اس رقم سے پھر بھی کم تھی جو امریکی جج کنگ نے پائلٹوں کے کیس میں ہر ایک کو انفرادی طور پر ادا کی تھی۔

کیوبا کے افسران نے مقدمہ دائر کرنے کے لیے یہ کاغذات ہوانا میں امریکہ کے انٹرسٹیکشن کے حوالے کر دیئے۔ امریکہ نے انہیں قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ بعد ازاں کیوبا کی حکومت نے اعلان کیا کہ وہ اس مقدمہ کو بین الاقوامی عدالت میں پیش کرے گی۔

ویتنام

27 جنوری 1973ء کو امریکہ نے پیرس میں ”ویتنام میں جنگ کے خاتمے اور امن کی بحالی کے معاہدہ“ پر دستخط کیے۔ امریکہ نے جن اصولوں پر رضامندی ظاہر کی تھی ان میں سے ایک آرٹیکل 21 کی صورت میں یہ تھا ”اپنی روایتی پالیسی کے عین مطابق امریکہ جنگ کے زخموں کو بھرنے کی کوششوں میں معاونت کرتے ہوئے عوامی جمہوری ویتنام (شمالی ویتنام) اور پورے انڈوچائینہ کی بعد از جنگ تعمیر نو میں ہر طرح سے حصہ لے گا۔“

پانچ روز بعد صدر کنسن نے شمالی ویتنام کے وزیر اعظم کو ایک پیغام بھیجا جس میں انہوں نے مندرجہ ذیل وعدے کیے۔

1۔ امریکی حکومت بغیر کسی سیاسی شرط کے جنوبی ویتنام کی بعد از جنگ تعمیر نو میں حصہ لے گی۔

2۔ ابتدائی مطالعہ کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ بعد از جنگ تعمیر نو کے لیے امریکہ کی جانب سے 3.25 بلین ڈالر کی امدادی رقم فراہم کی جائے گی۔

وعدہ کے باوجود تعمیر نو کی امدادی رقم میں سے ایک پیسہ بھی ادا نہیں کیا گیا اور نہ ہی کبھی کیا جائے گا۔

تاہم..... یہاں ٹھنڈی سانس بھریں..... ویتنام امریکہ کو ہر جانہ ادا کر رہا ہے۔ جی ہاں 1997ء سے اس نے جنوبی ویتنام کی شکست خوردہ حکومت کے 145 ملین ڈالر کے قرضوں کی ادائیگی شروع کر دی ہے جو خوراک اور انفراسٹرکچر کی مد میں امریکہ سے لیے گئے تھے گویا ہنونی اپنے خلاف ٹھوٹی جانے والی جنگ کا امریکہ کو ہر جانہ ادا کر رہا ہے۔

یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ اس کیلئے مناسب ترین قانونی اصطلاح ہے ”استحصال“۔ اور اس پر عملدرآمد کرانے والے امریکی ملازمین میں عالمی بینک، بین الاقوامی مالیاتی فنڈ (آئی ایم ایف)، ایکسپورٹ۔ امپورٹ بینک (ای آئی بی)، پیرس کلب اور دیگر بین الاقوامی مالیاتی مافیا شامل ہے۔ انہوں نے ویتنام کو ایسی پیشکش کی کہ اسے مسترد کرنا اس کے لیے ممکن نہیں تھا پیشکش یہ تھی کہ: ”یا تو ادائیگی کرو یا پھر بدترین معاشی تشدد کے لیے تیار ہو جاؤ۔ یہ اس معاشی تشدد سے کہیں زیادہ سنگین ہو گا جس کا تم پہلے ہی ہمارے ناخداؤں کے ہاتھوں شکار بن چکے ہو۔“

واشنگٹن میں ویتنام کے سفارتخانے (ایک دفتری عمارت میں چھوٹا سا آفس) میں فرسٹ سیکرٹری برائے اطلاعات نے 1997ء میں مصنف کو بتایا کہ یہ معاملہ اور کنسن کے واجب الادا بلین ڈالر ویتنامیوں کے لیے نہایت حساس اور جذباتی مسائل ہیں مگر حکومت کے پاس دنیا کے طریقہ کار کو تبدیل کرنے کا اختیار نہیں ہے۔

نکارا گوا

امریکہ اور اس کی حمایت یافتہ کونٹرافوج کی کئی سالوں پر مشتمل جارحیت کے خلاف نکارا گوا نے 1984ء میں اقوام متحدہ کے قانونی عضو عالمی عدالت (بین الاقوامی عدالت انصاف) میں جو کہ ہیک، نیدرلینڈز میں واقع ہے لگاتار حملوں اور ساحلوں پر بارودی سرنگیں بچھانے کے خلاف دعویٰ دائر کیا۔ 1986ء میں عدالت نے فیصلہ سنایا کہ امریکہ بے شمار وجوہات کی بناء پر بین الاقوامی قانون کی خلاف ورزی کا مرتکب قرار پایا ہے۔ عدالت نے یہ بھی کہا کہ امریکہ کی ذمہ داری ہے کہ فوری طور پر ان جارحانہ کارروائیوں کو روک دے اور جمہوریہ نکارا گوا کی تمام پریشانیوں کا ازالہ کرے۔“

ریگن انتظامیہ اس دعویٰ کی پیش بندی کے طور پر اپنی جانب سے نہایت موزوں اور بر محل کارروائی کر چکی تھی۔ نکارا گوا کی جانب سے دعویٰ دائر کرنے سے تین روز قبل 6 اپریل 1984ء کو اعلان کر دیا گیا کہ امریکہ دو سال تک وسطی امریکہ کے متعلق عالمی عدالت انصاف کا کوئی فیصلہ تسلیم نہیں کرے گا۔

اس اعلان کی آمریت و استبدادیت سے قطع نظر عالمی عدالت کا 27 جون 1986ء کا حکم دو سال کی مدت گزرنے کے بعد لاگو ہو گیا مگر امریکہ نے اسے مکمل طور پر نظر انداز کر دیا۔ امریکہ نے نہ تو نکارا گوا کے خلاف اپنی جارحانہ کارروائیوں میں کوئی کمی کی نہ ہی اس کی پریشانیوں کے ازالہ کے لیے ایک پائی بھی ادا کی۔

لیبیا

اپریل 1986ء میں لیبیا پر ہونے والی امریکی بمباری میں بہت سے لوگ ہلاک جبکہ سینکڑوں زخمی ہوئے۔ ہلاک ہونے والوں میں کرنل قذافی کی چھوٹی بیٹی بھی شامل تھی جبکہ قذافی کے باقی سات بچوں اور بیوی کو شدید زخمی حالت میں ہسپتال میں داخل کرایا گیا۔ اس کے ایک سال بعد فیزل ٹارٹ کلیمز، ایکٹ اور فارن کلیمز، ایکٹ کے تحت دہائٹ ہاؤس اور محکمہ دفاع میں ہلاک ہونے والوں اور زخمیوں کی جانب سے 65 دعوے دائر کیے گئے۔ دعوؤں میں یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ ہر مرنے والے کو جن میں لیبیا، یونان، مصر، یوگوسلاویہ اور لبنان کے باشندے شامل تھے 5 ملین ڈالر ادا کئے جائیں۔ وقت کے ساتھ دعوؤں کی تعداد 340 ہو گئی

مگر امریکی قانونی نظام میں ان کے لیے کہیں انصاف نہیں تھا۔ سپریم کورٹ نے بھی اس مقدمہ کی سماعت سے انکار کر دیا تھا۔

پانامہ

1989ء کی امریکی جارحیت کے کئی سال بعد تک تباہ کن بمباری اور زمینی حملوں کے متاثرین پانامیوں کی جانب سے ہلاکتوں، معذوریوں اور گھروں و کاروبار کی بربادی کے ہر جانے کے حصول کی بے شمار کوششیں کی گئیں مگر ان کے قانونی دعوؤں اور مقدموں کا سامنا سنگدل امریکی حکومت سے تھا۔ ایک امریکی قانونی فرم نے 200 پانامیوں (سب غیر جنگجو تھے) کی جانب سے نہر پانامہ معاہدہ کی شکلوں کے تحت دعوے دائر کئے جو سب کے سب مسترد کر دیئے گئے پھر امریکی عدالتوں میں دائر ہونے والے دو مقدمے سپریم کورٹ تک لے جائے جاتے رہے مگر ہر عدالت ان کی سماعت سے انکار کرتی رہی۔

1990ء سے 1993ء کے دوران امریکن سٹینس آرگنائزیشن (اواے ایس) کے انسانی حقوق کے انٹر امریکن کمیشن میں 300 پانامیوں نے دعوے دائر کئے جن کا موقف یہ تھا کہ امریکہ نے ان بے شمار حقوق پامال کیے ہیں جن کے بدلے میں اسے ”ہرجانہ“ کی ادائیگی کا ذمہ دار ٹھہرایا جائے۔

1993ء میں کمیشن نے اس درخواست کو قابل سماعت قرار دیا مگر 1999ء تک بھی یہ میرٹس کے مطالعہ کے بہانے زیر غور ہی تھی۔ یہ ذہن میں رکھنا چاہیے کہ ان سالوں میں امریکہ نے کسی اور رکن ملک کے مقابلہ میں اواے ایس میں بے حد بااثر حیثیت حاصل کر لی ہے۔ اس کا ثبوت 1962ء میں کیوبا کی رکنیت معطل کرانے میں امریکی کوششوں کی کامیابی ہے۔ جو کہ اواے ایس کے دیگر ممبران کی جانب سے کیوبا کی رکنیت کی بحالی کے مستقل مطالبوں کے باوجود ابھی تک باہر بیٹھا ہے۔

کچھ برس پہلے کی ایک رپورٹ کے مطابق امریکی اہلکاروں کی جانب سے پانامہ میں پانامیوں کو کچھ معمولی ادائیگیاں کی گئی ہیں مگر دسمبر 1999ء میں محکمہ خارجہ کے پانامہ کے امور سے متعلق پریس آفس کی جانب سے بیان جاری کیا گیا کہ ”امریکہ نے حملوں کے دوران ہونے والی ہلاکتوں یا زخمیوں یا جائیداد کی بربادی کے ہرجانہ کے طور پر کوئی رقم ادا نہیں

کی کیونکہ یہ کارروائی ایک مشن کے تحت کی گئی تھی۔ 1989ء سے امریکہ جو پانامہ کو لاندہ فرام کر رہا ہے اسے وہ انہی مقاصد کے لیے استعمال کر رہا ہے۔“

محکمہ خارجہ کی اس وضاحت کا مقصد دنیا کے سامنے یہ واضح کرنا تھا کہ امریکہ نے پانامہ کے لوگوں کے ساتھ جو کچھ کیا اسے اس پر قطعی کوئی شرمندگی نہیں نہ وہ اس سلسلہ میں خود کو قصور وار سمجھتا ہے اور نہ ہی اس سلسلہ میں وہ کسی قسم کا ہرجانہ ادا کرنے کا ذمہ دار ہے۔

20 دسمبر 1999ء کو امریکی جارحیت کے دس سال پورے ہونے پر سینکڑوں پانامی سڑکوں پر نکل آئے اور انہوں نے ایک بار پھر امریکہ سے مطالبہ کیا کہ وہ بمباری سے متاثر ہونے والوں کو ہرجانہ ادا کرے۔

سوڈان

الشفاء ادویات ساز ادارہ نے سوڈان کی طبی استعداد کو 5 فیصد سے بڑھا کر 50 فیصد تک پہنچا دیا تھا۔ انتہائی خطرناک بیماریوں میں استعمال ہونے والی 90 فیصد ادویات اس نہایت غریب ملک کے ادارہ میں تیار کی جاتی تھیں۔ مگر امریکہ اس غریب ملک کی کامیابی کو برداشت نہیں کر پا رہا تھا تبھی اس ادویات ساز ادارہ کو تباہ و برباد کرنے کے لیے ایک درجن سے زائد ٹوماہاک کروزمینائل روانہ کر دیئے۔ اور اس کی بنیاد خفیہ طور پر حاصل کردہ اس آلودہ نمونہ کو بنایا جس کی بناء پر امریکہ کا دعویٰ تھا کہ ادویات کی اس فیکٹری میں کیمیائی ہتھیار تیار کئے جا رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ امریکہ نے دنیا کو یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ اس فیکٹری کا مالک صالح ادریس نہ صرف دہشت گردوں کا انتہائی قریبی ساتھی تھا بلکہ سیاہ دھن کو سفید بنانے کا کاروبار بھی کرتا تھا۔ امریکہ نے صالح ادریس کے لندن بینک میں 24 ملین ڈالرز کے اثاثے منجمد کر دیئے۔ مگر امریکہ اپنا کوئی بھی دعویٰ ثابت کرنے میں ناکام رہا کیونکہ اس حوالے سے جو بھی شہادتیں اور گواہیاں سامنے آئیں سب نے اس دعویٰ کو باطل قرار دے دیا۔ یہ کیس جمہوریت ثابت ہونے کے بعد ادریس نے اپنے اثاثوں کی واپسی کے دعویٰ کے ساتھ ساتھ تباہ ہو جانے والی اپنی فیکٹری کے ہرجانہ کے لیے بھی مقدمہ دائر کر دیا۔

مئی 1999ء میں آخر کار امریکہ نے مقدمہ لڑنے کی بجائے ادریس کے اثاثوں پر سے پابندی اٹھالی کیونکہ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اسے ہزیمت اٹھانا پڑے گی۔ مگر اس سال

کے آخر تک بھی امریکہ نے فیکٹری کی تباہی پر سوڈان یا ادریس سے معافی نہیں مانگی نہ اس کی ساکھ تباہ کرنے پر کسی قسم کی معذرت کی نہ اس نے اب تک پلانٹ کی تباہی کا روبار کی بربادی ملازمین کی بیروزگاری کے عوض ہرجانہ کی رقم ادا کی ہے اور نہ ہی زخمی ہونے والے دس افراد کو ایک بھی پیسہ بھی دیا ہے۔ اس سارے معاملہ میں امریکہ کی بربریت اور تکبر عروج پر تھا۔

سی آئی اے کے سابق اہلکار ملٹ بیرڈن کے مطابق ”آج تک کبھی ایسا نہیں ہوا کہ محض ایک آلودہ نمونہ کی بنیاد پر کسی خود مختار ملک کے خلاف جنگی کارروائی کا ارکھاب کیا گیا ہو۔“

عراق

امریکی حکومت اور ذرائع ابلاغ عراق کے بارے میں پراپیگنڈہ کر کے بہت لطف محسوس کرتے ہیں۔ 1991ء میں خلیج کی جنگ کے دوران جسے حیاتیاتی ہتھیاروں کی فیکٹری قرار دے کر بمباری کا نشانہ بنایا گیا تھا وہ دراصل بچوں کی خوراک تیار کرنے والی فیکٹری تھی۔ لیکن یہ اس وقت ثابت ہوا جب نیوزی لینڈ کے ماہرین اور کاروباری افراد نے جن کے اس فیکٹری کے ساتھ نہایت قریبی روابط تھے بار بار اس جگہ کا معائنہ کیا اور نیوزی لینڈ کی حکومت نے اس بات کی تصدیق کی کہ اس فیکٹری میں صرف بچوں کی خوراک ہی تیار کی جاتی تھی۔ اس فرانسیسی ٹھیکیدار نے بھی یہی کچھ کہا جس نے یہ فیکٹری تعمیر کی تھی۔ مگر چیئرمین جوائنٹ چیف آف سٹاف اس پر ہی مقرر رہے کہ ”یہاں حیاتیاتی ہتھیار ہی تیار ہو رہے تھے۔ اور اس کا ہمیں یقین ہے۔“

امریکہ سے ہرجانہ کی توقع رکھنا ایسا ہی تھا جیسے سردیوں میں روس میں زمینی جنگ

لڑنا۔

چین

ایک انتہائی غیر معمولی بات؟ مئی 1999ء میں بلنراد میں چینی سفارتخانے پر امریکی بمباری کے بعد امریکہ نے چین سے ضرورت سے زیادہ معافیاں مانگیں۔ اور سارا الزام پرانے اور فرسودہ نقشوں پر دھردیا۔ مگر یہ تو اس حقیقت کو چھپانے کے لیے کہ یہ بمباری کوئی حادثہ نہیں تھی ایک بہانہ تھا۔ لندن کے آبرور نے اکتوبر اور نومبر میں نیو امریکی فوج اور خفیہ

ذرائع کی بنیاد پر انکشاف کیا کہ سفارتخانہ کوینیو کی اس اطلاع پر نشانہ بنایا گیا کہ یہ یوگوسلاویہ کی فوج کی پیغام رسانی کا ذریعہ بنا ہوا تھا۔ چین نے یہ کام اس وقت شروع کیا تھا نیو کے جنگی جہازوں نے یوگوسلاویہ کے سرکاری پیغام رسانی کے ذرائع کو تباہ کر دیا تھا۔

چینی سفارتخانہ پر بمباری فوجی سے زیادہ سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے کی گئی تھی۔ چین واضح طور پر ایشیاء میں امریکہ کے راستہ کی سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ سفارتخانہ پر بمباری کے ذریعہ امریکہ نے بڑے خوبصورت انداز میں چین کو خبردار کرنے کی کوشش کی تھی کہ یہ تو صرف ایک چھوٹا سا نمونہ ہے اگر تم نے امریکہ کے راستہ میں رکاوٹ بننے کی کوشش کی تو تمہارا اس سے کہیں زیادہ برا حشر کیا جائے گا۔

یہ راستہ اختیار کرنا حسب معمول ”انکار“ کرنے سے کہیں بہتر تھا۔ کیونکہ دوسری صورت میں حالات امریکی اہلکاروں کے بس سے باہر ہو جاتے۔ اس قسم کا موقع دوبارہ کبھی نہ ملتا۔

امریکہ انیو کی یوگوسلاویہ میں ہونے والی بمباری کی ”غلطیوں“ کے بارے میں امریکی ترجمان نے دنیا سے کہا کہ ”ہمیں انسانی جانوں کے ضیاع پر افسوس ہے۔“ یہ وہی الفاظ ہیں جو شمالی آئرلینڈ میں گزشتہ سالوں میں کئی مواقع پر غلط نشانہ پر ہو جانے اور اپنی بمباری کے حوالے سے آئی آر اے نے دہرائے تھے مگر ان کی اس کارروائی کو ”دہشت گردی“ قرار دے دیا گیا تھا۔

گوئٹے مالا

10 مارچ 1999ء کو گوئٹے مالا شی میں ہونے والے مذاکرات کے دوران صدر کلنٹن نے کہا کہ امریکہ کی جانب سے گوئٹے مالا میں جابر قوتوں کی حمایت ایک غلطی تھی اور امریکہ اپنی یہ غلطی ہرگز نہیں دہرائے گا۔ ”مگر“ ”معذرت“۔ ”معافی“ اور ”ہر جانہ“ کے الفاظ صدر کے منہ سے نہیں نکلے۔ چالیس سال تک اس ظلم و جبر کا شکار ہونے والے لوگوں کو جس کا ذمہ دار صرف اور صرف امریکہ تھا معافی کے ایک صحیح لفظ اور ہر جانہ کی ایک پائی کے قابل بھی نہیں سمجھا گیا۔

1968ء کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ کسی امریکی صدر نے گوئٹے مالا کا دورہ کیا اس

سے قبل 1968ء میں صدر لنڈن جانسن نے اس وقت یہاں کا دورہ کیا تھا جب امریکی حمایت یافتہ حکومت کا ظلم و ستم عروج پر تھا۔

جانسن نے یقیناً اس وقت یہ نہیں کہا تھا کہ گوئے مالا میں جاری امریکی پالیسی غلط ہے اگر اس وقت یہ سب کچھ کہا جاتا جو 31 برس بعد صدر کلنٹن کہہ رہے ہیں تو اس کا فائدہ بھی ہوتا۔

یونان

نومبر 1999ء میں کلنٹن کے یونان کے دورے کے نتیجے میں وہاں بہت بڑے پیمانے پر امریکہ مخالف مظاہروں اور احتجاج کا سلسلہ شروع ہو گیا وہ یوگوسلاویہ پر امریکہ کی حالیہ بمباری اور 1967-74ء تک عوام پر ظلم و تشدد کے پہاڑ توڑنے والی یونانی جنتا کی حکومت کی امریکہ کی طرف سے بھرپور حمایت کے خلاف سراپا احتجاج بنے ہوئے تھے۔

اپنے ایک دن کے قیام میں صدر نے ایک پرائیویٹ گروپ سے خطاب کے لیے وقت نکال لیا۔

”جب 1967ء میں جنتا نے اقتدار سنبھالا تو امریکہ نے اس وقت سرد جنگ کے مفادات کو دیگر مفادات پر فوقیت دی۔ میں آج کہنا چاہوں گا کہ ہماری ذمہ داری یہ تھی کہ ہم جمہوریت کی حمایت کرتے کیونکہ یہی وہ وجہ تھی جس کے لیے ہم سرد جنگ لڑ رہے تھے۔ مگر اہم بات یہ ہے کہ ہم اسے تسلیم کرتے ہیں۔“

قومی سلامتی کونسل کے ترجمان ڈیوڈ لیوی نے فوری طور پر یہ بیان دیا کہ سابقہ جنتا کے بارے میں صدر کے بیان کو معذرت سے منسوب نہ کیا جائے۔

یہاں یہ سوال ابھرتے ہیں۔ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ امریکہ نے سرد جنگ جمہوریت کی بقاء کے لیے لڑی جبکہ اس نے نہ صرف یونانی آمروں بلکہ بے شمار جگہوں پر ظلم و تشدد کی بھرپور حمایت کی؟ کیا وہ سب کارروائیاں ”غلط“ تھیں کیا سب ”غلطیاں“ تھیں گوئے مالا کی طرح؟ اس سے ہم کیا نتیجہ اخذ کریں کہ یہ مستقل ”غلطیاں“ پالیسی کا حصہ تھیں؟ مزید برآں اگر سرد جنگ میں اپنے ”مفادات“ کو جمہوریت کی بقاء پر ”فوقیت“ دی گئی تو ہم یہ ضرور جاننا

چاہیں گے کہ وہ ”مفادات“ کو نئے ہیں جو جمہوریت سے ٹکرا رہے ہیں یا کم از کم اس کے موافق نہیں ہیں یہ ”مفادات“ وہی ہیں جو حسب معمول امریکی ماہرین سیاسیات کے پیدا کردہ ہیں اور جن کو کبھی بھی مناسب نام نہیں دیا گیا (اشارہ: پیسے کے پیچھے دوڑو)

آخر میں ہم ان الفاظ کا تجزیہ کرتے ہیں جو صدر کلنٹن نے مارچ 1998ء میں یوگنڈا میں ادا کیے۔

”سرد جنگ کے دوران جب ہم سوویت یونین کا مقابلہ کر رہے تھے تو اکثر ہمارا واسطہ افریقی اور دنیا کے دیگر ممالک سے یہ دیکھنے کے لیے پڑتا رہتا تھا کہ امریکہ اور سوویت یونین کی لڑائی میں وہ کہاں کھڑے ہیں؟ اور پھر اپنے لوگوں کی خدا کے بخشے ہوئے حقوق کے مطابق زندگی گزارنے کی تمنا کی جدوجہد میں کہاں کھڑے ہیں۔“

یہاں کیا ہو رہا ہے؟ گوئے مالا، یونان، افریقہ اور دنیا کے دیگر ممالک..... کیا جناب صدر امریکہ کی خارجہ پالیسی کے نصف صدی پر محیط ”کارناموں“ کو اپنانے سے انکاری ہیں؟ کیا ان کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ امریکہ نے بغیر کسی خاص وجہ کے دنیا کو ہلاکتوں، بربادیوں، ظلم و تشدد اور مصائب کے عذاب میں جھونک دیا؟

ہمیں جو ”اشتراکیت“ نامی چیز کے خلاف نیک مقصد کے لیے لڑی جانے والی جنگ کے بارے میں جو سبق پڑھایا جاتا رہا ہے کیا وہ محض دھوکہ تھا؟

ہم یہ کبھی بھی نہیں جان سکیں گے کہ دراصل ولیم کلنٹن ان چیزوں کے بارے میں کیا سوچتے ہیں؟ شاید وہ خود بھی نہیں جانتے۔ مگر ہمیں یہ علم ضرور ہے کہ وہ کیا کرتے ہیں۔ جیسا کہ ”تعارف“ اور ”امریکہ کی بد معاشیاں“ میں یہ بات ہمارے سامنے آ چکی ہے کہ انہوں نے بالکل اسی قسم کی پالیسیاں جاری رکھیں جنہیں اب وہ مسترد کر رہے ہیں اور مستقبل میں کسی دن ہو سکتا ہے کہ امریکی صدر تسلیم کرنا نظر آئے کہ صدر کلنٹن نے عراق، کولمبیا، میکسیکو، یوگوسلاویہ اور اسی طرح دیگر جگہوں پر جو کچھ کیا وہ غلط تھا۔ وہ بہت بڑی ”غلطی“ تھی۔ مگر مستقبل کا وہ صدر جب اپنے منہ سے یہ الفاظ ادا کر رہا ہوگا تو خود بھی دنیا کے کسی کونے میں یہی ”غلطی“ اسی قسم کے ”مفادات“ کے لیے کر رہا ہوگا۔

امریکہ اور آزاد معیشت

امریکہ اس کے لیے جارحیت، بمباری اور قتل و غارت کرتا ہے..... مگر کیا واقعی امریکی آزاد معیشت پر یقین رکھتے ہیں؟

سرد جنگ کے خاتمے کے بعد سے نمایاں امریکی ماہرین اقتصادیات و مالیات مشرقی یورپ اور سابقہ سوویت یونین کی حکومتوں کو آزاد معاشی نظام کے قیام کے مشورے دے رہے ہیں۔

امریکی حکومت کی مالی امداد سے چلنے والی قومی استعداد برائے جمہوریت بھی دنیا کے مختلف حصوں میں اسی کام میں مصروف ہے۔

امریکہ کے زیر اثر عالمی بینک اور بین الاقوامی مالیاتی فنڈ (آئی ایم ایف) بھی واضح کر چکے ہیں کہ وہ کسی ایسے ملک کو معاشی امداد فراہم نہیں کریں گے جو آزاد منڈی کی معیشت کی پر جوش حمایت نہیں کرتا۔

امریکہ نے کیوبا پر سے اس وقت تک تمام پابندیاں اٹھانے اور سزائیں ختم کرنے سے انکار کر دیا ہے جب تک کہ کیوبا ساجیت کے تجربات ترک کر کے سامراجیت کی راہ نہیں اپنالیگا۔

1994ء میں جو امریکہ نے ہیٹی کی مخالفت ترک کر کے اسے حلیفوں میں شامل کیا تو اس سے قبل ہیٹی کے صدر جین برٹریڈ ایریڈیٹھ نے امریکہ کو ضمانت دی تھی کہ وہ ساجیت کا راستہ ترک کر کے آزاد منڈی میں شامل ہو جائے گا۔

یہ بات دنیا کے بہت سے لوگوں کے لیے شدید حیرت کا باعث ہو گی کہ امریکیوں

کی اکثریت آزاد معاشی نظام پر یقین نہیں رکھتی۔ ہو سکتا ہے یہ بات بہت سے امریکیوں کے لیے دھچکا ہو۔

اس پر یقین کرنے کے لیے رائے شماری کی جائے جس میں اس قسم کا سوال پوچھا جائے:

”آپ کا کیا خیال ہے کہ ہمارے سامراجی نظام کو مزید سماجی بننا چاہیے؟ بظاہر جواب نفی میں ہوگا مگر ان میں چھپے ہوئے مطلب پر غور کریں اور اس جھنجھٹا ہٹ سے بالاتر ہو کر سوچیں کہ امریکی واقعی کیا چاہتے ہیں تو بالکل متضاد جواب سامنے آئے گا۔

رسد اور طلب

لاس اینجلس میں 1994ء میں آنے والے تباہ کن زلزلہ کے بعد بہت سے حلقوں کی جانب سے یہ آوازیں اٹھیں کہ بنیادی ضرورت کی اشیاء مثلاً پانی، بیٹری اور ڈائجسٹر کی قیمتوں میں اضافہ نہیں ہونا چاہیے۔ اس بات پر شدید اصرار کیا جاتا رہا کہ دکاندار اس صورتحال میں قیمتیں ہرگز نہیں بڑھائیں مگر سینٹر ڈائین فینشٹین نے کہا کہ نہ تو یہ کیلیفورنیا کا طریقہ اور نہ ہی یہ امریکی انداز ہے۔ زیادہ المناک صورتحال اس وقت پیدا ہوئی جب زلزلہ کی تباہ کاریوں کی وجہ سے شہر میں بہت سے مکانات ناقابل رہائش ہو گئے اور مالک مکانوں نے اپنے خالی مکانوں کے کرایوں میں فوری طور پر اضافہ کر دیا۔ لوگ چلا اٹھے کہ وہ ایسا کیسے کر سکتے ہیں؟ اس پر کیلیفورنیا اسمبلی نے یہ قانون بنا دیا کہ کسی قدرتی آفت کے بعد فروخت کنندگان کی جانب سے اشیاء ضرورت کی قیمتوں میں دس فیصد سے زائد اضافہ جرم قرار دیا جائے گا۔

یہ سب کچھ خاصی حیرت کا باعث ہے سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا ان لوگوں نے ہائی سکول کے نصاب میں معیشت کا مضمون نہیں پڑھا؟ کیا وہ رسد اور طلب کے قانون کو نہیں جانتے؟ کیا وہ سمجھتے ہیں یہ قانون منسوخ کر دیا گیا ہے یا پھر وہ سمجھتے ہیں کہ ایسا ہو جانا چاہیے؟ یہاں تک کے کانگریس کے اراکین بھی اس نظام کی کارکردگی سے مطمئن نظر نہیں آتے۔ وہ مستقل طور پر صحت کی سہولیات اور ادویات کی بڑھتی ہوئی قیمتوں کو قابو میں رکھنے اور قیمتیں بڑھانے والوں کے خلاف چارہ جوئی کرنے والے ادارہ کے کام کو ممکنہ حد تک درست رکھنے کی کوششوں میں مصروف رہتے ہیں۔ ہمارے قانون ساز منڈیوں کو اپنا جادو دکھانے کی

اجازت کیوں نہیں دے دیتے؟

منافع کا محرک

صدر کیلین کوئٹ کے یہ تاریخی الفاظ امریکیوں کے لیے ہمیشہ قابل غور رہیں گے کہ ”تہذیب اور منافع کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔“ البتہ خاتون اول ہلیری کلنٹن نے میڈیکل اور انشورنس انڈسٹری کے اس رویہ کے خلاف نہایت غم و غصہ کا اظہار کیا کہ وہ اپنے منافع کو عوام کی صحت سے زیادہ مقدم سمجھتے ہیں۔ انہوں نے اعلان کیا کہ ”منڈی ہر چیز کی قیمت تو جانتی ہے مگر ان کی قدر سے واقف نہیں ہے۔“

یونیوں کی جانب سے کمپنیوں کو اس بات پر مستقل لتاڑا جاتا ہے کہ وہ اپنے زیادہ سے زیادہ منافع کے حصول کے لیے کارکنوں کو صحت اور تحفظ کی سہولیات فراہم کرنے میں کنجوسی سے کام لے رہی ہیں۔

ماحولیات کے ماہرین اس صفت کی مذمت کرتے نہیں تھکتے کہ وہ ماحولیات کے نام پر زیادہ سے زیادہ منافع کما رہی ہے۔

قانون توڑنا امریکیوں کا پسندیدہ کھیل بن گیا ہے۔ بیج قانون توڑنے والوں پر اگر انہوں نے واقعی اپنے اقدام سے مالی فائدہ نہیں اٹھایا تو جگہ جگہ لگاتے ہیں اور دوسروں کو بھی کتابوں یا فلموں کے حقوق یا انٹرویو فروخت کرنے کے جرائم سے منافع کمانے سے منع کرتے ہیں۔ کیلیفورنیا سینٹ نے اس حوالہ سے 1994ء میں قانون بنایا تھا کہ جس کے مطابق ”اس قسم کے جرائم میں سزا پانے والے مجرموں کی کمائی ایک ٹرسٹ فنڈ کو دے دی جائے گی جس سے ان کے جرائم سے متاثر ہونے والوں کی امداد کی جائے گی۔“

صدر جارج بوش نے ایران۔ کوئٹرا سیکنڈل میں ملوث افراد کی معافی کے اعلان کے موقع پر کہا کہ ”پہلی بات تو یہ کہ خواہ ان کے اقدامات درست تھے یا غلط انہوں نے جو کچھ کیا اس کا محرک حب الوطنی تھا۔ دوسرے انہوں نے نہ تو اس کے ذریعہ کسی قسم کا منافع حاصل کیا نہ منافع کا سوچ کر انہوں نے ایسا کیا تھا۔“

آزاد معیشت کے بہت بڑے حامی سینٹر رابرٹ ڈول نے 1996ء میں اپنی صدارتی مہم میں فلمی صنعت کو نشانہ بناتے ہوئے کہا کہ ”میں اس صنعت کے کرتا دھرتاؤں کو

سمجھانا چاہتا ہوں کہ منافع کی بھی کوئی حد ہونی چاہیے..... ہمیں ہالی ووڈ میں منافع کی مناسب حدود مقرر کرنے کے لیے اس کو قابل احتساب بنانا ہوگا۔“

اسی سال فیلاڈلفیا کا میئر ایڈ ریٹزل کارپوریشنوں پر افسوس کرتے ہوئے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر مضافات کا رخ کر گیا۔ کیونکہ اس نے عقلی دلائل کو تسلیم کر لیا تھا۔ اس نے اعلان کیا ”اگر ہم آزاد منڈی کو بالکل بے لگام چھوڑ دیں گے تو شہر کے شہر مر جائیں گے۔“

آخر میں ہم مئی 1998ء میں ہونے والی کانگریس کی اس بحث پر بات کریں گے جو ان ممالک کے خلاف پابندیاں عائد کرنے کے حوالے سے تھی جو اپنے ہاں مذہبی انتہا پسندی کی اجازت دیتے ہیں۔ امریکہ میں کاروباری منافع کی ترغیب دینے والے نمائندہ ٹام کابرن (آراوکلہ) نے ان پابندیوں کی مخالفت کرتے ہوئے اعلان کیا کہ:

”ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ ہم اپنے ملک میں کس چیز پر یقین رکھتے ہیں؟“

کیا ہم سرمایہ داری اور دولت پر یقین رکھتے ہیں یا پھر انسانی حقوق پر؟“

مگر ایک ایسا نظام کس طرح کام کر سکتا ہے جو منافع کی کسی ترغیب کے بغیر قائم کیا گیا ہو؟ نہ صرف یہ کہ منافع نہیں بلکہ منافع کی کوئی اُمید بھی نہیں۔ سز کلنٹن جیسی ماہر قانون دان یقیناً اس بات سے واقف ہوں گی کہ شاک ہولڈرز اس قانونی نکتہ کو نظر انداز کرنے پر کارپوریٹ افسروں کے خلاف قانونی چارہ جوئی کر سکتے ہیں۔ اس کے باوجود وہ اور بہت سے دوسرے سرمایہ دارانہ نظام کے اس معبد کا ایک ستون گرانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

نجی ایجادات، فروخت کنندگان اور ذاتی ملکیت

اسی طرح امریکن میڈیکل ایسوسی ایشن اس معبد کا جو ایک اور قابل تعظیم ستون گرانے کی خواہشمند ہے وہ ہے موجد کو تحفظ اور حقوق کی سند دینا جو کہ موجد کو قابل تعظیم بناتی ہے۔ امریکن میڈیکل ایسوسی ایشن نے جدید طب اور جراحی کے طریقہ کار اور نجی ایجادات کی بڑھتی ہوئی مقبولیت اور پریکٹس کی شدید مذمت کرتے ہوئے کہا کہ یہ غیر اخلاقی ہے جو طب کی ترقی میں رکاوٹ بنے گا۔ یقیناً تھامس ایڈیسن اپنی قبر میں تڑپ رہا ہوگا۔

چند سال پہلے کلیولینڈ کے لوگوں کو اس وقت نہایت دکھ اور تکلیف کا سامنا کرنا پڑا جب ”براؤنز“ کے مالک نے انہیں دھوکہ دیتے ہوئے اپنی فٹ بال ٹیم کو ہالٹی مور منتقل کر دیا۔

مگر کیا یہ نجی ملکیت کا بنیادی اصول نہیں ہے کہ مالک زیادہ سے زیادہ منافع کے حصول کے لیے اپنی ملکیت کو اپنی مرضی کے مطابق استعمال کرنے میں آزاد ہو؟ سینئر جان گلین اور ادہائیو کے نمائندہ لوئی شکس نے فرنیچا زکوہ کو روکنے کے لیے قانون بنانے کے منصوبہ کا اعلان کیا۔

مقابلہ بازی اور انتخاب

امریکہ کے بہترین ”انتخاب“ کے فرضی نظریہ کے لیے داد و تحسین کہاں ہے؟ کتنے شہری ہیں جو اپنے ڈاک کے ڈبوں میں بے کار قسم کے ڈاک کے ڈھیر کو خوش آمدید کہتے ہوں گے یا ہر وقت اور ہر جگہ اشتہارات اور تجارتی مشہوریوں کے اڈا دھام میں اپنے اوسان برقرار رکھتے ہوں گے؟ ہر غنی آدمی پر لوگ کراہ اٹھتے ہیں۔ لوگ آخر وہ کیوں نہیں سمجھتے جو انہیں سکھایا گیا ہے۔ کہ مقابلہ بازی کا رجحان ہر ایک کے لیے فائدہ مند ہوتا ہے؟

جان کینتھ گالبرتھ کے مشاہدے کو ذہن میں رکھتے ہوئے کہ سوائے اقتصادی ماہرین اور فیڈرل ٹریڈ کمیشن کے کوئی منڈی کو نہیں مانتا اس نہایت افسوس کا مقام ہے کہ اس فرضی مقابلہ میں شامل دیگر بڑی بڑی کارپوریشنوں کے ساتھ ساتھ قومی ادارے بھی قیمتوں کے تعین اور اس حوالے سے دیگر سازشی اقدامات میں ملوث پائے جاتے ہیں۔

غیر منافع بخش نعم البدل

ہو سکتا ہے کہ شہری اس نظام سے اور بھی زیادہ بیزار ہوں جتنا کہ ہم نے بیان کیا۔ یہ حقیقت ہے کہ امریکی معاشرہ میں منافع بخش سیکموں کے مقابلہ میں غیر منافع بخش سیکموں کے لیے تعظیم اور بھروسہ بہت زیادہ ہے۔ کیا عوام ہلال احمر کا اتنا ہی احترام کرتے اگر یہ تنظیم منافع کے حصول کے لیے کام کر رہی ہوتی؟ کیا اس صورت میں انٹرئل ریونیو سروس اسے ٹیکس سے مستثنیٰ قرار دیتی؟

ڈاکخانہ غیر منافع بخش ہونے کی صورت میں سستے نرخ اور ان کتابوں اور جرائد کے لیے جو اشتہار شائع نہیں کرتے کم نرخ کیوں مقرر کرتا ہے؟ ایڈز کا ٹیسٹ کرانے کے لیے لوگ عوامی ہسپتالوں میں زیادہ بھروسہ اور اطمینان کے ساتھ جاتے ہیں یا تجارتی پیمائوں پر چلائی جانے والی کسی لیبارٹری میں؟ ”تعلیمی“ یا ”عوامی“ ٹیلی وژن پر اشتہارات کیوں نہیں دکھائے جاتے؟ ان اساتذہ پادریوں، نرسوں، سماجی کارکنوں اور رضا کاروں کے بارے میں امریکی کیا

سوچیں گے جو ایک لاکھ ڈالر سالانہ کے اضافہ کا مطالبہ کرتے ہیں؟ کیا لوگ یہ بات پسند کریں گے کہ چرچ آپس میں مقابلہ بازی کریں جس میں ایک نئے اور بہتر خدا کی فروخت کے لیے ہر لحاظ سے مکمل اشتہاری مہم بھی چلائی جائے؟

ان رویوں کا سراپت کر جانا اور پھر اس حوالے سے اکثر و بیشتر آواز اٹھانا لالچ اور خود غرضی کو نامنظور کرنے کا اظہار اور اس حقیقت سے اختلاف ہے کہ لالچ اور خود غرضی ہمارے سرکاری اور نظریاتی نظام کی بنیاد ہیں۔ یہ تقریباً ایسے ہی ہے کہ کسی کو یہ یاد نہ رہے کہ نظام نے مزید کس طرح کام کرنا ہے یا وہ اس پر انحصار نہ کرنے کا فیصلہ کر لیں۔ حالات کس رخ کو جا رہے ہیں؟ کیا روسی اصلاح پسند سامراجیت کے آخری اور سچے معتقد کی حیثیت سے سب کچھ سمیٹنے والے ہیں؟

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ امریکیوں نے فیصلہ کر رکھا ہے کہ وہ آخر وقت تک آزاد معیشت کے ساتھ رہیں گے۔ جو مثالیں اوپر دی جا چکی ہیں ذرائع ابلاغ انہیں بلاناغہ ہر روز دہراتے ہیں۔ اس تمام قصہ میں سب سے زیادہ افسوسناک بات یہ ہے کہ امریکی اس حقیقت سے واقف نہیں ہیں کہ ان کے مختلف رویے آزاد معیشت کے مخالف فلسفہ کو جنم دینے کا باعث بن رہے ہیں اور یہی وہ ہے کہ وہ مروجہ سوچ پر یقین کر لیتے ہیں کہ حکومت مسئلہ ہے بڑی حکومت سب سے بڑا مسئلہ ہے اور یہ کہ ان کی نجات پرائیویٹ سیکٹر میں ہے جہاں آزاد معیشت کا حامی نظریہ براہ راست پھلتا پھولتا ہے۔

پس یہ ہی وجہ ہے کہ سماجی تبدیلی کے لیے سرگرم عناصر جنہیں یقین ہے کہ امریکی معاشرہ کو مسائل کا سامنا ہے اس حوالے سے بالکل مایوسی اور بددلی کا شکار ہیں کہ کوئی بھی کارپوریشن یا نجی ادارہ منافع کے بل پر ان مسائل کو حل کرتے ہوئے امریکیوں کو یہ سمجھا سکے گا یہ حقیقت میں وہ اس پر یقین نہیں کرتے جس پر وہ سمجھتے ہیں کہ انہیں یقین ہے۔ اور جو لوگوں کے ذہن میں یہ بٹھا سکے کہ اہم اور بڑے بڑے کاموں کی انجام دہی کے حوالے سے حکومت کا پرائیویٹ سیکٹر سے کوئی مقابلہ نہیں ہے حالانکہ یہ غلط اور گمراہ کن ہے کیونکہ حکومت نے ایک ناقابل یقین فوج تیار کی ایک لمحہ کے لیے اسے نظر انداز کر دیں کہ اس کا مصرف کیا ہے؟ انسان کو چاند پر اتارنا بڑے بڑے ڈیم تعمیر کئے، عظیم الشان پارک، ریاستوں کو ملانے والا سڑکوں کا نظام، قیام امن کے ادارے، طلباء کے لیے قرضے، سماجی تحفظ، بینکوں میں جمع رقوم کی

انسورنس، پنشن کے فنڈز کے غلط استعمال کی روک تھام، ماحولیات کے تحفظ کے ادارے، سمجھوتہ، جی آئی ایل اور بے شمار ادارے قائم کئے۔ مختصر یہ کہ حکومت جو کچھ کرنا چاہتی تھی اس نے بہت اچھے طریقے سے کیا یا پھر مزدور اور دیگر تحریکوں نے اس سے بہت کچھ کرایا جیسے کارکنوں کی صحت اور تحفظ کے معیار کا تعین اور خوراک بنانے والوں کو خوراک کے اجزاء کی تفصیلات پر مبنی فہرست مہیا کرنے کا پابند بنانا وغیرہ۔

سرگرم عناصر کو امریکی عوام وہ سب کچھ یاد دلاتے ہیں جو وہ پہلے کچھ چکے ہیں مگر یوں محسوس ہوتا ہے کہ بھول گئے ہیں کہ نہ تو انہیں حکومت میں کمی یا زیادتی کی خواہش ہے نہ وہ بڑی یا چھوٹی حکومت چاہتے ہیں انہیں تو بس اپنی حکومت چاہیے۔

مندرجہ بالا باتوں میں سے کوئی بھی واحد عالمی طاقت کو دنیا پر سامراجی بنیاد پرستی کے نفاذ کے حوالے سے جاری ”جہاد“ سے باز نہیں رکھ سکتی۔

جہاد دن بدن سخت کیوں ہو رہا ہے؟..... چند حریص وجوہات۔

1987ء میں ہیرسٹ کارپوریشن کے ایک سروے کے مطابق نصف کے قریب بالغ امریکیوں کا خیال تھا کہ کارل مارکس کلمے کا یہ نظریہ ”ہر ایک سے اس کی صلاحیت کے مطابق“ ہر ایک کو اس کی ضرورت کے مطابق ”امریکی آئین میں ہونا چاہیے۔

مارک برزینسکی کے مطابق جو کہ زیمبیمو کا بیٹا تھا اور سرد جنگ کے بعد وارسا میں فل برائٹ سکالر تھا: ”میں نے اپنے طلباء سے کہا کہ وہ جمہوریت کی تعریف کریں۔ مجھے امید تھی کہ جواب میں انفرادی آزادیوں اور منتخب اداروں پر طویل بحث شروع ہو جائے گی مگر مجھے اس وقت شدید حیرت کا سامنا کرنا پڑا جب میرے طالب علموں نے کہا کہ ان کے نزدیک جمہوریت کا مطلب یہ ہے کہ عوام کو قابل احترام معیار زندگی، صحت کی سہولیات، تعلیم اور رہائش پوری ذمہ داری کے ساتھ فراہم کرنا حکومت کی اولین ذمہ داری ہے۔ گویا دوسرے الفاظ میں اسے سوشلزم کہہ لیں۔“

آزاد ملک میں ایک دن

یہ سخت ترین سوال تسلسل کے ساتھ ہم پراٹھتا ہے۔

اتنا سب کچھ کرنے کے باوجود وہ کس طرح بچ کر نکل سکتے ہیں؟

یہ کیسے ممکن ہے کہ امریکہ دنیا بھر کی اقتصادیات پر قابض ہو جائے، جمہوریوں کو تہہ و بالا کر کے رکھ دے، خود مختار حکومتوں کے تختے الٹ دے، ان پر وحشیانہ تشدد کرے، ان پر کیمیائی و حیاتیاتی حملے کرے، انہیں تابکاری کا نشانہ بنائے..... وہ تمام جرائم جن کی تفصیل اس کتاب میں موجود ہے، قول و فعل کے ششدر کر دینے والے تضاد کے ساتھ ذرائع ابلاغ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کرے..... اس کے باوجود نہ تو دنیا کی بے رحمانہ مذمت کا نشانہ بنے، نہ سماجی شعور رکھنے والے لوگ اسے ملامت کریں، نہ اسے کسی کوڑھی کی طرح علیحدہ کر کے ڈال دیا جائے اور نہ ہی امریکی رہنما کبھی بھی انسانیت سوز جرائم کے الزام میں بین الاقوامی ٹریبونلز کے سامنے پیش ہوں..... یہ کیسے ممکن ہے؟

اگر دنیا کی دیگر حکومتوں اور رہنماؤں کی تنظیم طوطا خاطر نہ ہو تو یہ سازش اور خاموشی کوئی معنی نہیں ہے۔ یہ صرف چند آدمیوں کی خریداری کا معاملہ ہے جو لڑاکا طیاروں، پائلٹوں، گندم کے بدلے قرضوں کی معافی، ورلڈ بینک آئی ایم ایف کی جانب سے دھمکیوں، رشوتوں، زور زبردستی، ذلت و خواری اور انا کا خاتمہ کر کے خریدے جاسکتے ہیں اور اگر یہ نہ کرنا ہو تو دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ان کی قوم پرستی کی حوصلہ افزائی کر کے یا انہیں نیو ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن اور یورپی یونین کی رکنیت پیش کر کے خرید لیا جاتا ہے۔

ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا ہے کہ فیدل کاسٹرو جیسے کسی سر پھرے سے واسطہ پڑ جائے جو نہایت ہی قابل احترام بین الاقوامی اعلیٰ سوسائٹی کے حلقہ میں شامل ہونے سے انکار کر دے۔

لیکن انسانوں کی اکثریت کو جن میں بے شمار متاثرین بھی شامل ہیں احتجاج کرنے سے کوئی چیز روکتی ہے۔ اگر وہ گولیاں نہ بھی چلائیں تو اس کی مذمت تو کر سکتے ہیں اس کی مخالفت تو کر سکتے ہیں اس پر لعنت تو بھیج سکتے ہیں۔

ایک سابقہ نوآبادی جس نے نئی زندگی کے لیے جدید دنیا کے وعدوں کو حیرت انگیز طریقوں سے پورا کیا کہ پورے طمرق سے انیسویں صدی میں داخل ہوئی۔ پھر دوسری جنگ عظیم میں فسطائیت پر کامیابی حاصل کر کے ہندوؤں کو چھو لیا اور پھر امریکی سائنسی افسانہ نگینی فوسوں کاری میں تبدیل ہوا اور اس نے چاند پر قدم رکھ کے خلا کو تسخیر کر لیا۔ سرد جنگ کے سوویت پر اپیگنڈہ انے اس کا کچھ نہیں بگاڑا نہ سرد جنگ کی سچائیوں نے اور نہ ہی دیگر سچائیوں نے کوئی نقصان پہنچایا۔

دوسری جنگ عظیم کے خاتمہ کے بعد کئی دہائیوں تک مغربی ممالک سے سوویت یونین اور مشرقی یورپ کے دورے کرنے والے واپسی میں ان ملکوں میں اپنے ہم پیشہ افراد یا عام لوگوں سے سنی ہوئی کہانیاں باقاعدگی سے ساتھ لاتے تھے جیسے کہ شہری یہ ماننے کے لیے تیار نہیں کہ امریکہ میں لوگ بے گھر ہیں یا وہاں قومی صحت کی انشورنس پالیسی نہیں۔ وہ اس بات پر متفق ہیں کہ وہ سب اشتراکی پر اپیگنڈہ تھا۔ انہیں یقین کہ امریکہ اور برطانیہ میں حکومتیں خفیہ فیصلے نہیں کرتیں اور اگر کوئی سیاسی رہنما ایک جھوٹ بھی بولتا ہے تو اسے فارغ کر دیا جاتا ہے کس کی مثال سامنے ہے..... ”ہمیں کبھی کبھار آپ کے سفارتخانہ سے ڈیلی میل (دی لندن ٹیلی ایڈ) مل جاتا ہے جس میں دنیا کی غیر متعصبانہ خبریں پڑھ کر خوشی ہوتی ہے۔“ سرد جنگ کے خاتمے کے بعد سوویت جنرل شاف کے سربراہ نے امریکی جوائنٹ چیفس آف شاف کے سربراہ کو بتایا کہ وہ یہ دیکھ کر بہت متاثر ہوا امریکی فوجی نہ تو بولنے سے ڈرتے تھے نہ اپنے افراد کی دھمکیوں سے خوفزدہ ہوتے تھے۔

ان برسوں میں تیسری دنیا کے کئی رہنماؤں نے امریکی فوج کے دباؤ یا امریکہ کی جانب سے سیاسی دھمکیوں سے خوفزدہ ہو کر امریکی سرکاری اہلکاروں یہاں تک کہ براہ راست صدر کو درخواستیں پیش کی ہیں کہ وہ سب کچھ محض غلط فہمی تھی امریکہ نے کبھی بھی انہیں یا ان کی سماجی تبدیلیوں کی تحریکوں کو تباہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ بہت سے دوسروں کے ساتھ ساتھ 1954ء میں گوسٹے مالا کے وزیر خارجہ 1961ء میں برطانوی گیانا کے چیری بگن اور 1983ء

میں گریناڈا کے مورس بشپ تک نے یہ درخواستیں پیش کیں۔ سب کو فٹا کر دیا گیا۔ ہمارے پاس اس سلسلہ میں 1994ء کا ایک تازہ کیس موجود ہے۔ جو میکسیکو میں زیپائٹا کے رہنما سب کمانڈر مارکوس کے حوالے سے ہے۔ مارکوس نے کہا کہ اسے امید تھی کہ ایک بار امریکہ کی خفیہ ایجنسیاں اس پر متفق ہو گئیں کہ یہ تحریک کیوبا یا روس کے زیر اثر نہیں تو امریکہ زیپائٹا کی بھرپور حمایت کرے گا۔ آخر کار وہ اس نتیجہ پر پہنچ گئے ہیں کہ یہ میکسیکو کا مسئلہ ہے جو انصاف اور سچے مقاصد پر مبنی ہے۔

جناب مارکوس کی جرأت کو سلام پیش کرتے ہوئے تاریخی حقائق کے حوالے سے ایک اہم سوال کرنا نہایت ضروری ہے کہ کئی سال تک امریکہ مارکوس کے حامیوں اور اس سے پہلے خود مارکوس کو ختم کرنے کے لیے میکسیکو کی فوج کو اسلحہ اور تربیت فراہم کرتا رہا ہے۔

جب 1999ء کے موسم بہار میں امریکہ نے سریلیا پر بمباری کی تو سریلیائی شہر رہ گئے ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ان کا محبوب امریکہ ان کا پیارا امریکہ ان کے ساتھ یہ سب کیسے کر سکتا تھا۔ اس حوالہ سے واشنگٹن پوسٹ نے بلغراد کے ایک خاندان سے انٹرویو کیا جو امریکہ کا بہت بڑا حامی اور پرستار تھا۔ شوہر نے اعلان کیا کہ ”ہمارے لیے امریکہ سے نفرت کرنا بے حد مشکل ہے۔ ہم نے ہمیشہ امریکی طرز زندگی کو اپنانے کی کوشش کی ہے۔ نہ کہ روسی طرز زندگی۔“ اخبار نے مزید لکھا کہ ”یہ حقیقت انہیں حواس باختہ کر رہی ہے اور ان کے لیے بہت بڑے صدمہ کا باعث ہے کہ امریکہ ان پر بمباری کر رہا ہے۔“

کوسووا کے دارالحکومت پر سربیا سے تعلق رکھنے والا ایک سربیلیائی شاعر الیگزینڈر سمووچ امریکی بمباری کی وجہ سے دکھ اور صدمہ کی کیفیت میں مبتلا تھا اسی بمباری جس نے اس کی زندگی اور اس کے شہر کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیا۔ ہمیں بتایا گیا کہ وہ باب ڈیلن کا پرستار جاز کا شیدائی اور مترنم شاعروں کا مداح ہے۔ اب بھی جب وہ جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھتا ہے اور یہ تصور کرتا ہے کہ وہ کسی اور ملک میں رہائش پذیر ہے تو وہ ملک امریکہ جیسا ہی ہوتا ہے۔“

روس میں اکثریت نے اس بمباری کی شدید مخالفت کی وہ بھی حیران پریشان تھے کہ اس بمباری کا اس تباہی کا ذمہ دار امریکہ ہے۔

امریکی ذرائع ابلاغ نے ہمیں بتایا کہ روس میں امریکہ کی مخالفت میں بے پناہ

اضافہ ہو گیا۔ بالکل یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے امریکہ کا یہ جنوبی روپ روس کے سامنے پہلی بار ظاہر ہوا ہو اس پر پہلی بار انکشاف ہوا ہو کہ امریکہ اس کا مخالف ہے اور اس سے نفرت کرتا ہے۔ اسے معصومیت کہیں یاد یو اگئی۔

جب امریکہ نے بلغراد میں چین کے سفارتخانہ کو میزائلوں سے نشانہ بنایا تو چینوں کا پہلا رد عمل غیر یقینی کا تھا کہ جیسے انہیں اس بات پر یقین ہی نہ ہو بیجنگ یونیورسٹی کے ایک طالب علم نے اس حوالے سے کہا کہ ”میرے ذہن میں پہلا خیال یہ ہی آیا تھا کہ امریکہ ایسا کر ہی نہیں سکتا یہ یقیناً کسی دہشت گرد کی کارروائی ہے اور اسے ہی مورد الزام ٹھہرانا چاہیے۔ مگر جب حقیقت سامنے آ گئی کہ یہ امریکہ نے ہی کیا ہے تو مجھے اس سے شدید دکھ اور تکلیف پہنچی۔ میں نے بے شمار امریکی فلمیں دیکھ رکھی ہیں مجھے یقین تھا کہ امریکہ انسان دوست اور انصاف پسند ہے۔“

ایک سینئر چینی اہلکار نے کہا ”تم ہم میں سے اکثر کے آئیڈیل تھے اور اب تمہارے بہوں نے ہمارے لوگوں کو مار دیا ہے۔“

یہ رویہ صرف ان چینوں تک محدود نہیں جنہوں نے کبھی امریکہ کی سرزمین پر قدم تک نہیں رکھا بلکہ امریکہ میں رہائش پذیر چینی بھی نہایت دکھ اور مایوسی کا شکار ہوئے ہیں۔ سٹانفورڈ یونیورسٹی کے ایک چینی طالب علم نے اپنے احساسات بیان کرتے ہوئے کہا کہ ”ہم نے امریکہ کو مثالی نمونہ بنایا ہوا تھا۔ ہم اس کی خوبیوں کے سوا کچھ سوچ ہی نہیں سکتے تھے مگر اب تم نے ہمارے لوگوں کو مار ڈالا ہے اور اس کے ساتھ ہی امریکہ کے ساتھ ہماری محبت ختم ہو گئی ہے۔“

اس سادگی پر کون نہ مر جائے..... امریکہ سے یہ محبت، یہ عاشقی یقیناً اس بوڑھی اور تھکی ہوئی دنیا نے امریکہ کے حوالے سے کبھی گناہ کا تصور تک نہیں کیا۔ امریکہ انڈر نائزنگ اور تعلقات عامہ کا موجد اور مصلح، دنیا بھر میں فلموں، ٹی وی پروگراموں، کتابوں، رسائل و جرائد اور موسیقی کا سب سے بڑا خالق اور تقسیم کار 100 سے زائد ممالک میں قائم اس کی لائبریریاں دنیا بھر میں امریکہ کے بارے میں معلومات کا اہم ترین ذریعہ اور پھر وائس آف امریکہ جس کے 90 ملین سامعین دنیا بھر میں پھیلے ہوئے ہیں..... امریکہ واحد انفارمیشن سپر پاور دنیا بھر کے لیے اطلاعات و معلومات کا واحد منبع جس نے ذرائع ابلاغ کے ذریعہ دنیا بھر کو اپنے سحر

میں جتلا کر رکھا ہے، لوگوں کے دلوں اور ذہنوں کو مکمل طور پر اپنے قبضہ میں لے رکھا ہے اور اب اسے نسلوں تک پہنچانے کے لیے اپنا پوری قوت صرف کر رہا ہے۔

مورخ کرسٹوفر سمپسن ”علم استبداد“ کے موضوع پر اپنی تحقیق میں لکھتا ہے کہ ”فوج“ خفیہ ایجنسیوں اور پراپیگنڈہ ایجنسیوں جیسے کہ محکمہ دفاع اور سی آئی اے نے جنگ عظیم دوم کے بعد نسلوں پر تحقیقات کے لیے ہر طرح سے مدد فراہم کی جس میں ترغیب کا فن، آراء کی پیمائش، تحقیق و تفتیش، سیاسی و فوجی تیاری، نظریہ کی ترویج اور متعلقہ سوالات وغیرہ شامل تھے۔“

امریکہ کو بیچنے میں تھوڑی سی ہی کسر رہ گئی ہے۔ 1999ء میں کلنٹن انتظامیہ نے اعلان کیا کہ وہ ”غیر ملکی حاضرین پر اثر قائم کرنے کے لیے“ بین الاقوامی معلومات عامہ کا ایک نیا گروپ تشکیل دے رہی ہے جس کا مقصد امریکہ کی خارجہ پالیسی کی حمایت کرنا اور امریکہ کے دشمنوں کے مذموم عزائم اور پراپیگنڈہ کو ناکام بنانا ہوگا۔ بین الاقوامی معلومات عامہ (انٹرنیشنل پبلک انفارمیشن) کے منشور کے مطابق ”بین الاقوامی فوجی معلومات پر قابو پانے کا مقصد جذبات، مقاصد، اداروں اور دلائل پر اثر انداز ہونا اور پھر بالآخر غیر ملکی حکومتوں، تنظیموں، گروہوں اور افراد کو مکمل طور پر اپنے دائرہ اثر میں لانا ہے۔“

”یہ ایک آزاد ملک ہے۔“

یہ تصور ماں کے دودھ کے ساتھ ہی پیدا ہوتا ہے۔

”یہ ایک آزاد ملک ہے۔“

امریکہ میں پرورش پانے والا اس وقت تک یہ الفاظ سنتا ہے جب تک کہ اس کے ذہن کے سچ سننے والے خانے میں یہ اچھی طرح نہ بیٹھ جائیں۔

”یہ ایک آزاد ملک ہے۔“

دنیا میں کتنے لوگ ہیں جنہوں نے امریکہ کے ساتھ اپنی محبت میں اس مقولہ کو بنیادی عنصر کی حیثیت دی؟

”یہ ایک آزاد ملک ہے۔“

بہت سے امریکیوں اور غیر ملکیوں کے ذہنوں میں شعوری یا لاشعوری طور پر یہ بات بیٹھ چکی ہے کہ یہ مقولہ امریکہ کو جو کچھ بھی وہ اپنے ملک میں یا دنیا بھر میں کر رہا ہے اس کا اخلاقی حق فراہم کرتا ہے۔

”یہ ایک آزاد ملک ہے۔“

مندرجہ ذیل تحریر کو صحیح کی حیثیت سے پڑھیے۔

کھلے عام یا خفیہ قانونی یا غیر قانونی طور پر فوجی صنعتی کمپلیکس نے قیدی صنعتی کمپلیکس کے ساتھ اپنی قوتیں مجتمع کر لیں اور پھر طاقت کو مزید بڑھانے کے لیے قومی سلامتی پولیس کمپلیکس کو بھی اپنے ساتھ شامل کر لیا اور اب یہ طاقت ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر منشیات کے اور امریکی عوام اور حقوق کے قانون کے دشمنوں کے خلاف جنگ میں مصروف ہے۔ یہ طاقت جو خود ہی اپنی بقاء، عظمت اور بڑائی کی شیدائی ہے نے عوام کو قائل کر لیا کہ اس کی مدد کے بغیر وہ تباہ ہو جائیں گے۔ اگر انہوں نے اس کی طوفانی قوتوں کی مدد حاصل نہ کی تو سب کچھ تہہ و بالا ہو جائے گا اور شہریوں کو تحفظ اور سلامتی مصنوعی طور پر زندہ رکھنے والی مشین کے رحم و کرم پر ہوگی۔ اس منصوبہ میں بے غیرت قانون سازوں، ناکارہ نظام عدل، فریادی ذرائع ابلاغ اور ایک صدر بل کلنٹن کی شمولیت ناگزیر تھی، جنہوں نے شہری آزادیوں کے حوالے سے کالم لکھنے والے ”نیٹ میغوف“ کے الفاظ میں ”اس صدی میں..... ہمارے آئینی حقوق اور آزادیوں کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا۔“

کسی بھی دن آج کے جیسا ہی کوئی دن یا گزشتہ ماہ کے دوران کسی دن یا پھر گزشتہ سال جو کچھ ہوا، جو بھی واقعات ہوئے، جو بھی کارروائیاں ہوئیں وہ امریکہ میں آج بھی کسی نہ کسی جگہ بالکل اسی طرح ہو رہی ہیں۔ بار بار یقین دلایا جاتا ہے کہ بہت سی بد اعمالیاں، بری عادتیں ترک کر دی گئی ہیں مگر پھر انکشاف ہوتا ہے کہ تھوڑی بہت تبدیلی کے ساتھ وہ آج بھی مستقل طور پر جاری ہیں۔

یہ غور طلب بات ہے کہ شہری آزادیوں اور انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کے حوالے سے بے حد تشویش کا اظہار کیا جاتا ہے مگر حیرت ہے کہ معاشی خلاف ورزیوں کے بارے میں کبھی پریشانی ظاہر نہیں کی جاتی حالانکہ یہ براہ راست انسانی صحت پر اثر انداز ہوتی ہیں۔

خارجہ معاملات کے حوالے سے یہ طریقہ اختیار کر رکھا ہے کہ بہت سی خلاف ورزیاں کو مقامی رنگ دے دیا جاتا ہے تاکہ امریکی شہریوں کو فرضی خطرہ سے خوفزدہ کر کے مختلف پالیسیوں کے نفاذ کے سلسلہ میں ان کی حمایت حاصل کر لی جائے۔

ان سے زیادہ لاچار اور مایوس غلام کوئی نہیں ہو سکتا جو جانتے بوجھتے اس جھوٹ پر یقین رکھتے ہوں کہ وہ آزاد ہیں۔ (جان وولفنگ وان گوٹے)

O ہر ریاست میں پولیس، قومی گارڈ اور اکثر اوقات فوجی دستوں کی جانب سے غشیات کے خلاف جنگ کی آڑ میں ہیلی کاپٹروں کے ذریعہ لوگوں کے گھروں کی خفیہ نگرانی کرنا، سرکیس بند کر دینا، زبردستی تفتیش کرنا، خوف و ہراس پھیلانا اور طاقت کا زیادہ سے زیادہ مظاہرہ کر کے رہائشیوں کو خوفزدہ کرنا معمول بن گیا ہے۔

O سینکڑوں امریکی شہروں میں نوجوانوں کو رات کے کرفیو کی خلاف ورزی کے الزام میں پکڑ لیا جاتا ہے اور بہت سے تو دن کے کرفیو کی خلاف ورزی کے الزام میں بھی دھر لیے جاتے ہیں۔

O سی آئی اے، ایف بی آئی اور دیگر وفاقی ایجنسیاں ان دستاویزات کی بازیابی کے لیے عدالتی احکامات کو نظر انداز کر دیتی ہیں جن کی اتارنی کو ریاستی عدالتوں میں قومی سلامتی کے کیسوں کے سلسلہ میں اپنے موکل کے دفاع کے لیے ضرورت ہوتی ہے۔

O امریکہ میں رہنے والے کیوبا، لیبیا، عراق، شمالی کوریا، ایران، یوگوسلاویہ اور ایسے ہی کسی ملک کا سفر کرنے، وہاں پیسے خرچ کرنے یا بحری جہازوں کے ذریعہ مختلف اشیاء وہاں لے جانے کے جرم میں وفاقی حکومت کے مسلسل عتاب کا نشانہ بنے رہتے ہیں جس میں سزائیں، جرمانے اور دھمکیاں شامل ہوتی ہیں۔ ان ملکوں سے تعلق رکھنے والے جو اقوام متحدہ کے مشن کے تحت نیویارک یا واشنگٹن میں انٹرسٹ سیکشن کا دورہ کرتے ہیں ان کی ایف بی آئی کی جانب سے مسلسل نگرانی کی جاتی ہے اور انہیں ہر لمحہ تصاویر اترنے کا، ایف بی آئی کی جانب سے فون کاٹنا یا تفتیش کا خطرہ لاحق رہتا ہے۔

O سی آئی اے منتخب ملکوں سے آنے والی یا وہاں بھیجی جانے والی ڈاک خفیہ طور پر کھول کر پڑھتی ہے۔ یہ اخلاقیات سے گری ہوئی حرکت ہے تو کیا ہوا؟ امریکیوں کے خطوط خواہ وہ ملک کے اندر یا کسی دوسرے ملک بھیجے جائیں پڑھنا ایف بی آئی کے فرائض میں شامل ہے۔ دونوں اپنا اپنا کام پوری ”جائفتاشی“ سے کر رہی ہیں۔

O مغربی ریاستوں میں پولیس اور فیڈرل ہارڈر پٹرول ایجنٹس پیدل چلنے والوں اور موٹر سائیکل سواروں کو پکڑ کر روک لیتے ہیں کیونکہ وہ دیکھنے میں ہسپانوی لگتے ہیں اور انہیں

اس بات کا ثبوت پیش کرنے پر مجبور کرتے ہیں کہ وہ امریکہ میں قانونی طور پر مقیم ہیں۔
 O ہائی وے پر موٹر سائیکل سواروں کو منشیات کی جانچ پڑتال کے لیے روک لیا جاتا ہے۔ زیادہ تر سیاہ فاموں اور ہسپانویوں کو روکا جاتا ہے کیونکہ منشیات لانے لے جانے کے لیے نسل پرستی کی بنیاد پر ملازم رکھے جاتے ہیں۔ پولیس سیاہ فاموں کو تنگ کر کے تلاشی لیتی ہے اور ان کے اعضاءے تناسل اور مقعد کے مقامات پر روشنی ڈال کر چیکنگ کی جاتی ہے۔

آئی این ایس 18 سال سے کم عمر بچوں کو پکڑتی ہے جن میں سے زیادہ تر لاطینی امریکی یا چینی ہوتے ہیں۔ انہیں کئی کئی ماہ تک قید میں رکھا جاتا ہے۔ نہ تو انہیں ان کے حقوق سے آگاہ کیا جاتا ہے نہ ہی انہیں کسی وکیل سے یا اپنے کسی رشتہ دار سے رابطہ کرنے دیا جاتا ہے۔ غالباً انہیں اس طرح پکڑنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ان کے غیر قانونی طور پر مقیم والدین انہیں چھڑانے کے لیے آئیں تو انہیں حراست میں لے لیا جائے۔

O نجی کارپوریشنیں اپنے ملازمین کی فون کالز، وائس میل ریکارڈ کرتی ہیں ان کی ای میل اور کمپیوٹر فائلیں پڑھتی ہیں ان کا روزنامہ چیک کرتی ہیں کہ وہ کنسی ویب سائٹ دیکھتے ہیں کام کے دوران ان کی ویڈیو بنائی جاتی ہے لا کر روز غسائلیوں میں دو طرفہ آئینوں اور خفیہ کیمروں کے ذریعہ ان کی نگرانی کی جاتی ہے ان کے خاندان دوست احباب اور ہر ملنے جلنے والے کا بھی مکمل ریکارڈ رکھا جاتا ہے ان کے دفاتروں کو کھنگالا جاتا ہے ہوائی اڈہ کی طرز کی برقی تلاشی لی جاتی ہے منشیات چیک کرنے کے لیے ان کے پیشاب کا نمٹ لیا جاتا ہے ان کے پس منظر کے حوالے سے ہر چھوٹی بڑی تفصیل معلوم کی جاتی ہے۔ ان سب کے ساتھ ساتھ ان کے رویہ پر خصوصی نظر رکھی جاتی ہے کہ ملازمت کے دوران ان کا رویہ غلامانہ اور مسکینوں والا ہوتا ہے یا یہ کہ ان کی کوئی بھی حرکت کبھی کسی خطرہ کا احساس تو نہیں دلاتی۔

O اپنا پولیس کی نینول اکیڈمی میں تقریباً 300 طلباء پر مشتمل ایک شرارتی گروپ کا ہر ہفتہ پیشاب نمٹ لیا جاتا ہے جبکہ دیگر سکولوں میں طلباء کو ٹریک ٹیم اور شطرنج کے کلب میں شمولیت کے وقت تفریح یا مطالعاتی دورے پر جاتے ہوئے اور ڈرائیو پر جانے سے پہلے اور آنے کے بعد پیشاب کا نمٹ لازمی طور پر کرانا ہوتا ہے۔ سکولوں کی یہ پالیسیاں عدالت سے باقاعدہ طور پر منظور شدہ ہیں۔

O نیوجرسی میں ریاست کے گھڑ سوار سپاہیوں کے پاس ہونٹوں کے ملازمین اور

نیوجرسی کی محصول چوگیوں کی مکمل فہرست ہوتی ہے۔ ہر آنے جانے والے پر نظر رکھنے کے لیے وہ ان کے ساتھ مسلسل رابطہ رکھتے ہیں۔ ہوٹل کے ملازمین کو ہدایت ہوتی ہے کہ جیسے ہی انہیں کوئی مہمان مشکوک محسوس ہو وہ گھڑسوار سپاہی دستے کو اطلاع دیں۔ مشکوک کی وضاحت اس طرح کی جاتی ہے کہ اگر کوئی مہمان اپنے کمرے کا کرایہ کیش کی صورت میں دے یا پھر وہ فون کا لڑن کر گھبرا جائے ہیجان میں مبتلا ہو جائے تو اس کا مطلب ہے کہ وہ مشتبہ شخص ہے اور اس پر نظر رکھنا ضروری ہے۔ سپاہی دستوں کو ہوٹل کے میئر کی طرف سے مکمل اجازت ہوتی ہے کہ وہ بغیر کسی قسم کے وارنٹ کے کریڈٹ کارڈ کی رسیدوں اور مہمانوں کے رجسٹریشن فارمز کی چھان بین کر کے مشکوک مہمان کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کر لیں۔

سپاہیوں کے یہ دستے ہوٹل کے ملازمین کے لیے خفیہ نگرانی کے سیمینار کا بھی اہتمام کرتے ہیں جن کے ذریعہ انہیں مہمانوں میں سے منشیات کے بیوپاریوں کا کھوج لگانے کی تربیت دی جاتی ہے۔ منشیات کے بیوپاریوں کے سلسلہ میں جونشائیاں انہیں بتائی جاتی ہیں ان میں نسل اور ہسپانوی زبان سرفہرست ہوتی ہے۔

فیڈرل ایمرجنسی مینجمنٹ ایجنسی (ایف ای ایم اے) اجنبیوں، انتہا پسند گروہوں اور دیگر ناپسندیدہ افراد کی تازہ ترین فہرستیں مرتب کرتی ہے تاکہ کسی بھی قسم کی ہنگامی صورتحال میں انہیں فوری طور پر حراست میں لے لیا جائے۔

O امریکہ میں قائم 50 سے زائد نام نہاد ”بوٹ کمپنوں“ میں سے ایک میں بچوں کو قید کر کے رکھا جاتا ہے۔ یہاں ان بچوں کو سزا کے طور پر اتنا بھگایا جاتا ہے کہ ان کے پیروں میں سے خون بہہ بہہ کر جوتوں میں سے رسنے لگتا ہے۔ اس دوران ایک بچہ جان بحق بھی ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ ان بچوں کو اکثر اوقات یا تو باندھ دیا جاتا ہے یا پھر ان کو ہتھکڑیاں پہنا کر رکھا جاتا ہے۔

O حاملہ عورتوں کو منشیات کے استعمال کے الزام میں گرفتار کر لیا جاتا ہے خواہ ان کا بچہ بالکل محتند ہی کیوں نہ پیدا ہوا انہیں زیر حراست رکھا جاتا ہے۔ دراصل منشیات سے متاثرہ بچہ کا خطرہ ایک بھانہ ہے۔

O سرکاری ایجنسیاں اور پرائیویٹ کارپوریشنیں ہم جنس پرست جوڑوں اور غیر شادی شدہ مخالف جنس جوڑوں کو وہ مراعات نہیں دیتیں جو وہ شادی شدہ مخالف جنس جوڑوں کو

فراہم کرتی ہیں۔ ہم جنس پرستوں کو فوج سے نکال دیا جاتا ہے خواہ ان کے خلاف اس حوالہ سے کسی بھی قسم کی غیر اخلاقی حرکت کا بھی الزام تک نہ لگا ہو۔

O بین الاقوامی وفاقی، فوجی، ریاستی اور قانون نافذ کرنے والے ادارے خفیہ ایجنسیاں اور پرائیویٹ ادارے آئرش اور مشرق وسطیٰ کے حامی گروپوں، انسانی حقوق، تارکین وطن کے حقوق، شہری آزادیوں، جیل کی اصلاحات، اقلیتوں، مزدوروں، ماحولیات، جانوروں کے حقوق، ایٹمی طاقت کے لیے کام کرنے والوں اور سامراجیت مخالف عناصر کے خلاف مستقل نوعیت کے اقدامات کر رہی ہیں جن میں ان کے لیے قدم قدم پر رکاوٹیں کھڑی کرتا، فنڈز کا خاتمہ پابندیاں، ہر قسم کی امداد روکنا، نئے قوانین کا نفاذ اور جدید ٹیکنالوجی کی مدد سے ان کی ہر لمحہ خفیہ نگرانی وغیرہ شامل ہیں خواہ ان عناصر کے کبھی بھی کسی قسم کی غیر قانونی سرگرمیوں یا پر تشدد کارروائیوں میں ملوث ہونے کا کوئی ثبوت موجود نہ ہو۔

ایف بی آئی اور پولیس اجلاس اور مظاہروں میں شرکت کرنے والوں کی نیم پلیٹیں نوٹ کرتی ہیں، لوگوں کی خفیہ طور پر تصویریں بنائی جاتی ہیں، ان گروپوں میں داخل ہو کر مخبری کرانے کے لیے ادا نیگیاس کی جاتی ہیں، دفتروں کے تالے توڑ کر ڈاک اور امداد فراہم کرنے والوں کی فہرستیں چرائی جاتی ہیں، فائلوں کے ذریعہ محض خوفزدہ کرنے اور ڈرانے دھمکانے کے لیے گرفتاریاں عمل میں لائی جاتی ہیں (گرفتار پہلے کر لیا جاتا ہے جبکہ الزامات بعد میں عائد کئے جاتے ہیں) ایف بی آئی والے ان گروپوں کے اراکین کے گھروں اور کام کی جگہوں کے چکر لگاتے ہیں، بیورو کی طرف سے ان لوگوں کے بارے میں ان کے کونیکٹ کو بے نام خطوط بھیجے جاتے ہیں جن میں لکھا ہوتا ہے کہ دراصل یہ مخبر ہیں۔ اسی قسم کے زہریلے پراپیگنڈہ سے ممبر پور خطوط ان کے دفتر کے مالکان، مالک مکان اور شریک حیات کے نام بھی بھیجے جاتے ہیں جن کا مقصد زیادہ سے زیادہ پریشان کرنا ہوتا ہے۔

O انٹرپورٹ پر مسافروں کو مشکوک قرار دے کر تفتیش کے لیے نہ صرف کئی گھنٹوں بلکہ کئی دنوں تک روک لیا جاتا ہے ظاہر ہے کہ اس چکر میں ان کی فلائٹ چھوٹ جاتی ہے ان مسافروں کو ان کی قومیت، زبان، ظاہری شکل و صورت، سفر کے مقصد اور دیگر پیمانوں کی بنیاد پر مشتبہ دہشت گرد قرار دیتے ہوئے بغیر کسی وارنٹ کے روک کر شامل تفتیش کر لیا جاتا ہے۔ انہیں ہنگامہ کے تلاش لی جاتی ہے جس میں جسمانی اعضاء کی تلاشی، ایکس رے، زبردستی دافع قبض

ادویات کھانے پر مجبور کرنا اور انکی آنتوں کی حرکات کا معائنہ وغیرہ وغیرہ شامل ہیں۔

○ ایف بی آئیلا سیر میٹوں کو بطور خاص ان سائنسی اور فنی کتابوں کی رپورٹ ارسال کرنے پر مجبور کرتی ہے جن کے نام غیر ملکی لگتے ہیں اور جن کی زیادہ مانگ ہوتی ہے۔ (جب اس پروگرام کا پہلی بار انکشاف ہوا تو اس پر بہت تنقید کی گئی جس پر ایف بی آئی نے تنقید کرنے والوں کے بارے میں چھان بین شروع کر دی)

○ ڈرگ انفورسمنٹ ایڈمنسٹریشن (ڈی ای اے) پبلشروں سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ اسے ان لوگوں کے ناموں کی فہرست فراہم کریں جو مرہجوانہ کی کاشت کے بارے میں کتابیں خریدتے ہیں۔

○ اکثر اوقات خاتون پولیس افسر فاحشہ کے روپ میں مردوں کو زنا کے لیے بھاتی ہیں اور پھر پولیس فاحشوں کے گاہکوں کی گاڑیاں اپنے قبضہ میں لے لیتی ہے اس بات سے انہیں کوئی غرض نہیں ہوتی کہ یہ گاڑی اس کی ملکیت ہے یا نہیں۔
پولیس افسر فاحشوں کو گرفتاری کی دھمکیاں دے کر ان کے ساتھ زنا کرتے ہیں۔
○ استقاط محل کی خواہشمند خواتین کو اپنے راستہ میں ریاستی اور وفاقی حکام کی جانب سے بے شمار رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

○ ایف بی آئی یا پولیس کی جانب سے اچھی شہرت کے حامل اور رحل سیاہ قام منتخب اہلکاروں کو گرفتار کرنے کی نہایت تکلیف دہ کارروائیاں عمل میں لائی جا رہی ہیں (اس سلسلہ میں واشنگٹن ڈی سی کے سابق میئر میرین ہیری کاکیس نہایت نمایاں ہے)
○ نسلی تعصب کی وجہ سے لوگوں کو ملازمت اور گھروں سے بے دخل کر دیا جاتا ہے۔

○ بے شمار غیر ملکی دانشوروں، عالموں اور سرگرم عناصر کو امریکہ میں ہونے والی کانفرنسوں میں شرکت کے لیے امریکہ میں داخلے کی اجازت اس لیے نہیں دی جاتی کہ ان کے نظریات یا پھر اس کانفرنس کے نظریات امریکی محکمہ خارجہ کی نظر میں ناپسندیدہ ہوتے ہیں۔
○ لسانی اقلیتیں ”صرف انگریزی“ تحریک کی جانب سے مسلسل ذلت و تحقیر اور زیادتیوں کا نشانہ بن رہی ہیں۔

○ امریکی حکومت کے ایجنٹ بعض لوگوں کو ورلڈ ٹریڈ سنٹر میں بمباری کی طرز کی اور

دیگر دہشت گرد کا ردائیاں کرنے کی ترغیب دیتے ہیں۔

○ جج آپ کو قید کی سزا سناتا ہے اور پھر جیل کے افسر آپ کو جہنم میں پھینک دیتے ہیں..... قیدیوں کے ہاتھ پشت پر باندھ دیئے جاتے ہیں اور انہیں مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ کتوں کی طرح پلیٹ میں منہ ڈال کر کھانا کھائیں اور اپنے چہرے پر ملیں۔ منشیات کے جرائم میں سزا پانے والے غیر تشدد پسند قیدیوں کو باوجود عدالتی حکم، خطرناک قاتلوں، زانیوں اور ڈاکوؤں کے ساتھ رکھا جاتا ہے..... محافظ قیدیوں کی ٹانگوں کے درمیان ٹھڈے مارتے ہیں اور ان پر کتے چھوڑ دیتے ہیں..... محافظ قیدی عورتوں کو بے رحمی سے مارتے ہیں۔ انہیں بے آبرو کرتے ہیں انہیں مرد قیدیوں کے ہاتھوں فروخت کر دیتے ہیں اور پھر انہیں باقاعدہ طوائفیں بنا دیا جاتا ہے۔ انہیں اصلاحی افسروں کے ساتھ بے لباس ہو کر جنسی حرکات کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے (14 ریاستوں میں اصلاحی افسروں کا قیدی عورتوں کے ساتھ جنسی تعلقات رکھنا قانون کے خلاف نہیں ہے) محافظ قیدی عورتوں کی قابل اعتراض حالت میں تصاویر بناتے ہیں، دونوں جنس کے قیدیوں کو بالکل بے لباس یا صرف زیر جاموں میں رکھا جاتا ہے اور مخالف جنس کی جانب سے ان کی نگرانی ہوتی ہے..... مرد قیدیوں کو کسی بھی قسم کی سزا کے خوف کے بغیر قتل کر دیا جاتا ہے..... محافظ آنسو گیس استعمال کرتے ہیں، قید خانوں میں قیدیوں کے ہاتھ باندھ کر ان کے جسم کے نازک حصوں پر مرچیں اور جاوڑی چھڑکی جاتی ہے..... قیدیوں کو دوسرے قیدیوں کی جانب سے ہونے والے جنسی یا جسمانی حملوں سے نہیں بچایا جاتا..... قیدیوں کو ہر وقت جھکڑیوں اور بیڑیوں میں جکڑ کر رکھا جاتا ہے، یہاں تک کہ رفع حاجت یا نہاتے وقت بھی انہیں ان سے چھٹکارا نہیں ملتا..... جیل افسران کی جانب سے محافظوں کے کاموں میں رکاوٹ ڈالنے کے خطرہ کے پیش نظر کیلیفورنیا کے اصلاحی افسران کی یونین کے افسران عامہ اور قانون دانوں کے ساتھ وسیع سیاسی رابطے ہوتے ہیں جن کی وجہ سے محافظ کسی بھی قسم کی سزا کے خوف کے بغیر اپنا کام جاری رکھتے ہیں۔

○ امریکہ میں قیدیوں کی تعداد 20 لاکھ سے زائد ہو گئی ہے اور ان کے حقوق مستقل طور پر چیلنجے جا رہے ہیں۔ انہیں تعلیم، فنی تربیت، مطالعاتی مواد کی فراہمی، کھیل، ورزش، قیدیوں کے قانون سے متعلق لائبریری، مفت قانونی مشاورت، اپنے کیسوں کے سلسلہ میں ایپل کی آسانی اور ذرائع ابلاغ تک رسائی کی جو سہولیات فراہم کی جاتی تھیں آہستہ آہستہ سب چھینی

جارہی ہیں۔ اب یہ حال ہے کہ ان کے لیے رہتا، کھانا اور ڈاکٹر تک رسائی بھی اذیتناک اور مشکل ترین ہوتی جارہی ہے۔ ان کے لیے اپنا سامان وصول کرنے پر پابندی عائد کر دی گئی ہے، انہیں داڑھی اور بال منڈوانے پر مجبور کیا جاتا ہے، ہفتہ میں ایک بار چند منٹ سے زیادہ فون پر بات کرنے کی اجازت نہیں ہوتی، مہینہ میں ایک بار اہلخانہ سے ایک گھنٹہ کی ملاقات اور اس دوران اہلخانہ کے ساتھ ذلت آمیز سلوک کیا جاتا ہے، انہیں عریاں کر کے ان کی مکمل تلاشی لی جاتی ہے۔ قیدیوں کو ان کے اہلخانہ سے دور دراز مقامات پر جیلوں میں منتقل کر دیا جاتا ہے، ایڈز اور دیگر جان لیوا امراض میں مبتلا مریضوں کے علاج معالجہ سے انکار کر دیا جاتا ہے، دمہ کے مریضوں کی مناسب دیکھ بھال نہیں کی جاتی، نفسیاتی مریضوں کو دوائیں اور بلڈ پریشر کے مریضوں کو مناسب خوراک فراہم نہیں کی جاتی۔ قیدیوں کو ہفتہ میں صرف چند گھنٹوں کے لیے تازہ ہوا میں لایا جاتا ہے ورنہ وہ دن رات قید خانوں میں پڑے رہتے ہیں جہاں 24 گھنٹہ ان کے سروں پر بلب چلتے رہتے ہیں۔

O ورچینا میں بگ سٹون گیپ کے مقام پر 3,000 فٹ کی بلندی پر ایک نیا جیل تعمیر کیا گیا ہے جہاں ہر قید خانہ میں کھڑکیاں رکھی گئی ہیں تاکہ قیدی نیچے وادی کا نظارہ کر سکیں۔ جیل حکام ان کھڑکیوں کو بند کرانے کی منصوبہ بندی کر رہے ہیں تاکہ قیدی باہر نہ دیکھ سکیں۔

O سرکاری ایجنسیاں کئی لوگوں کے بینک اکاؤنٹ اس شبہ میں منجمد کر دیتی ہیں کہ وہ دہشت گردوں کے ساتھی ہیں مگر بعد میں ثابت ہوتا ہے کہ ان کا ٹیک غلط تھا اور وہ شریف شہری ہیں۔

O تعلیمی اداروں کو اپنے ہاں فوجی اہلکاروں کی تعیناتی کے لیے مجبور کیا جاتا ہے تاکہ طلباء کی امداد اور دیگر مقاصد کے لیے جاری ہونے والی سرکاری گرانٹس کا سلسلہ نہ رک جائے۔

O امریکی فوج مقامی طور پر فوجی مشقوں میں مصروف رہتی ہے جس کی ایک مثال میساچوسٹس میں ہونے والی حالیہ مشق ہے:

”گذشتہ ہفتہ ہیلی کاپٹروں کے ذریعہ نیوی کے اہلکاروں کو بعض اہم عمارتوں کی چھتوں پر اتارا گیا جہاں سے وہ عمارتوں میں داخل ہوئے اور مصنوعی دھماکوں اور فائرنگ کر

کے ہر طرف تباہی و بربادی پھیلا دی جس سے لوویل کی نصف سے زیادہ آبادی جاگ گئی، دھماکوں نے انہیں بری طرح ہراساں کر کے رکھ دیا تھا۔ اس سے قبل اسی روز شام کو اس وقت ہمارے گھر بری طرح بھونچال کی زد میں آئے تھے اور کھڑکیاں ٹوٹ گئی تھیں جب کئی ہیلی کاپٹر بمشکل 200 فٹ کی بلندی پر ہمارے سروں پر سے اڑتے ہوئے گئے تھے۔“

امریکہ میں ہونے والی کئی مشقوں میں فوج جان لیوا گولہ بارود استعمال کرتی ہے۔
O ایک ڈرائیور نے، جسے پولیس نے زبردستی روک لیا تھا اپنے ساتھ پولیس کی بدسلوکی کے واقعہ کو ریکارڈ کر لیا۔ جب وہ اس بدسلوکی کی شکایت بمعہ ثبوت لے کر مقامی پولیس سٹیشن گیا تو اس سے ٹیپ چھین لی گئی اور پھر اس پر غیر قانونی ریکارڈنگ کا الزام عائد کر کے گرفتار کر لیا گیا۔

O بسوں اور ریل گاڑیوں میں ڈرگ انفورسمنٹ ایڈمنسٹریشن کے اہلکار مسافروں کے سامان کی زبردستی تلاشی لینے کے لیے سوار ہو جاتے ہیں اور مسافروں کو یقین دلایا جاتا ہے کہ یہ سب کچھ انہی کے مفاد میں کیا جا رہا ہے۔

O قانون نافذ کرنے والے اداروں کے اہلکار کسی کے بھی گھر میں گھس کر اس پر منشیات یا کسی بھی قسم کا الزام عائد کر کے اس کا کمپیوٹر اٹھا کر لے جاتے ہیں..... وہ یہ کمپیوٹر اپنے دفتر میں لے جاتے ہیں جہاں ذاتی فائلیں اور میلو پڑھنے کے لیے انہوں نے ملازم رکھے ہوتے ہیں۔ کمپیوٹر ایک بار کسی گھر سے اٹھا کر لے جائیں تو پھر اس بارے میں کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا کہ یہ کب واپس آئیں گے۔ آئیں گے بھی یا نہیں؟

O میامی اور نیو جرسی میں جو لوگ کاسٹرو مخالف پارٹی کی حمایت نہیں کرتے مستقل طور پر ظلم اور زیادتیوں کا نشانہ بن کر رہ جاتے ہیں۔ کیوبا سے مصالحت کی تجاویز دینے، امریکی پابندیوں کے خاتمے کے مطالبات کرنے، جزیرہ کی جانب روانہ ہونے، وہاں بحری جہازوں کے ذریعہ ادویات پہنچانے وغیرہ کی وجہ سے سینکڑوں بار امریکہ کی طرف سے بمباری، فائرنگ، قتل و غارت گری، تشدد کا روبرو کی تباہی اور ملازمتوں سے نکالے جانے جیسی کارروائیاں عمل میں لائی جا چکی ہیں۔ یہ تمام کارروائیاں قانون کے کسی بھی خوف سے بے پرواہ ہو کر کی جاتی ہیں۔

O کاسٹرو مخالف دہشت گردوں کو تو امریکی حمایت اور مکمل چھوٹ حاصل ہے جبکہ

دوسری طرف وہ 30 غیر ملکی تنظیمیں بھی ہیں جنہیں انسداد دہشت گردی کے 1996ء کے قانون کے تحت ”دہشت گرد“ قرار دیتے ہوئے مطعون کر دیا گیا ہے۔ یہ قانون افراد کو جانتے بوجھے کسی بھی غیر ملکی دہشت گرد قرار دی جانے والی تنظیم کو مددگار مواد یا وسائل مہیا کرنے سے منع کرتا ہے۔ گویا اردن میں قائم حساس کے یتیم خانے میں بچوں کو کھلونے فراہم کرنا، کرد تنظیم کے قائم کئے گئے سکول میں کتابیں مہیا کرنا یا پھر آئرش قیدیوں کے اہلخانہ کی امداد کے لیے رقوم اکٹھی کرنا ”معروف دہشت گرد تنظیم کی معاونت“ کی ذیل میں آئے گا اور ایسا کرنے والے کے خلاف وفاقی قانون کی خلاف ورزی کے جرم میں کارروائی ہو سکتی ہے۔

اس قانون کے تحت امریکہ میں قانونی طور پر مقیم ہزاروں افراد کو جن میں سے اکثر کئی دہائیوں سے یہاں اپنے اہلخانہ کے ہمراہ رہائش پذیر ہیں جن کی یہاں نسلیں پیدا ہو کر جوان ہو چکی ہیں جبراً ان کے ملک واپس بھیجا جا رہا ہے اور ان کے امریکہ میں دوبارہ داخلہ پر پابندیاں عائد کی جا رہی ہیں اور اس کی بنیاد مبینہ طور پر اس قسم کی تنظیموں کے ساتھ روابط یا ان سے ماضی میں سرزد ہونے والے کسی ایسے معمولی سے معمولی جرم کو بنایا جا رہا ہے جس کی وہ سزا بھی بھگت چکے ہیں۔ بہت سوں کے ایسے جرم کو بھی جو اتنا معمولی تھا کہ اس پر سزا بھی نہیں دی گئی ملک سے نکالنے کے لیے بہت کافی سمجھا گیا۔

ماضی میں آئی این ایس کے پاس اختیار تھا کہ وہ ہر کیس کی انفرادی طور پر جانچ پڑتال کرے اور پھر مکمل تحقیقات کے بعد صرف ان لوگوں کو ملک سے نکالے جن کے بارے میں یہ ثابت ہو جائے کہ وہ قومی سلامتی کے لیے خطرہ ہیں۔ اب بلا لحاظ ہر ایک کو نکالا جا رہا ہے۔ بعض اوقات تو ان لوگوں کو گرفتار کر کے جبراً ان کے ملک واپس بھیج دیا جاتا ہے جو شہریت کے لیے درخواست دیتے ہیں۔

O آئی این ایس کے اہلکار امریکہ میں قانونی طور پر مقیم فلسطینیوں کے گھروں میں زبردستی گھس جاتے ہیں اور انہیں مبینہ طور پر فلسطینی تنظیموں کے رسائل تقسیم کرنے اور ایسے فلسطینی مقاصد کے لیے چندہ جمع کرنے کا الزام میں گرفتار کر لیتے ہیں جن کا انتشار پسندی سے دور دور تک واسطہ نہیں ہوتا۔ اس کے بعد انہیں فرد جرم عائد کر کے فیصلہ کے لیے کسی عدالت میں نہیں بھیجا جاتا بلکہ خود ہی ان بے گناہوں کو فلسطینی ہونے کی سزا کے طور پر غیر معینہ مدت کے لیے قید کر لیا جاتا ہے۔ اس کے بعد انکی قسمت ان کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ (محکمہ

انصاف تو کافی عرصہ سے اس پر یقین رکھتا ہے اور سپریم کورٹ نے بھی اب اس کی تصدیق کر دی ہے کہ غیر ملکیوں کو حقوق کے قوانین کا مکمل تحفظ حاصل نہیں ہے)

O سرکاری ایجنٹ اور پرائیویٹ سرائیوں گھر کے پیچھے پھینکے گئے یا زمین میں دبائے گئے کوڑے کرکٹ کے ذریعہ بھی آپ کی جاسوسی کرتے ہیں۔

O ایک وفاقی جج نے ایک امریکی شہری کو 6 ماہ قید اور 300 گھنٹہ سماجی خدمت کی سزا سنائی کیونکہ اس نے لیبیا کے ایک اہلکار کو جسے حکام نے میکسیکو سے ٹیکساس تک کاویزہ دینے سے انکار کر دیا تھا انسانی ہمدردی کے تحت اس کی منزل مقصود تک پہنچا دیا تھا۔ اسے اس بات کی سزا دی گئی تھی کہ اس نے چاہے لاشعوری طور پر ہی سرکاری سطح پر دشمن قرار دیئے جانے والے ملک کے شہری کو انسانی تعظیم کے قابل کیوں سمجھا؟

O پولیس ہمیشہ ماکان کا ساتھ دیتے ہوئے ہڑتالیوں اور احتجاجی مظاہرے کرنے والوں کی پٹائی کر کے انہیں گرفتار کر لیتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ گزشتہ 150 سالوں میں امریکہ میں صنعتی جھگڑوں کے دوران پولیس نے ہمیشہ یہی رویہ اختیار کیا ہے۔

کارپوریشنیں اس سلسلہ میں 10,000 سے زائد پرائیویٹ سیکوریٹی فرموں کو استعمال کر رہی ہیں جنہوں نے ہڑتالوں کو کچلنے اور یونین بنانے والوں کو ذلیل و خوار کرنے کے لیے تقریباً 15 لاکھ محافظ ملازم رکھے ہوئے ہیں۔

O شمالی کیلیفورنیا میں قانون نافذ کرنے والے افسران ماکان کے مفادات کی حمایت کرتے ہوئے پرامن احتجاج کرنے والوں کی آنکھوں میں مرچوں کی دھونی دیتے ہیں تاکہ احتجاج کو کچلا جاسکے اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہو جاتے ہیں۔ احتجاج کرنے والے تکلیف کی شدت سے ترپتے ہیں اور بہت سے پولیس کی حراست میں ہلاک ہو جاتے ہیں۔

O بینک، ٹیلیفون کمپنیاں، پولیٹی کمپنیاں، کریڈٹ کارڈ کمپنیاں، ایئر لائنز، بس کمپنیاں، کار کمپنیاں، ہوٹل، سرائے اور ہر قسم کے نجی ادارے کئی مقامی، ریاستی اور وفاقی حکام کو اپنے گاہکوں کے بارے میں وہ تمام معلومات جو وہ اپنے مستقل بڑھتے ہوئے اختیارات کے تحت طلب کرتے ہیں فراہم کرتے ہیں۔

منشیات کے خلاف جنگ میں بینکوں، بروکرز، جوا خانوں اور دیگر مالیاتی اداروں سے

ان کے گاہکوں کے بارے میں مکمل معلومات اور کسی بھی ”غیر معمولی“ یا ”مشتبہ“ کارروائی کی رپورٹ طلب کی جاتی ہے۔ یہ تمام معلومات محکمہ خزانہ کے فنانشل کرائمز انفورسمنٹ نیٹ ورک کو فراہم کی جاتی ہیں جس کے کمپیوٹرز ہر لمحہ افراد اور بینک اکاؤنٹس، کاروبار، جائیداد اور دیگر اثاثوں کے مابین تعلق جوڑنے میں مصروف رہتے ہیں۔

O ریاستیں اپنے رہائشیوں کی نہایت ذاتی اور خفیہ معلومات نجی انفارمیشن کمپنیوں اور دیگر اداروں کو فروخت کر رہی ہیں۔

O ذیل میں جو سچا واقعہ بیان کیا جا رہا ہے۔ یہ پورے امریکی معاشرہ کا آئینہ ہے اس قسم کے واقعات روزانہ ہی کہیں نہ کہیں وقوع پذیر ہو رہے ہیں: کسی بھی قسم کی پیشگی اطلاع کے بغیر ضلع کی مسلح پولیس اور سکول سسٹم کے افسروں پر مشتمل ٹیم سکولوں میں پہنچ جاتی ہے اور ہر ایک کو مرکزی ہال میں اکٹھے ہونے کا حکم دے دیا جاتا ہے جہاں کتے طالب علموں کا سامان سونگھتے ہیں جبکہ دعائی آلہ کی مدد سے طلباء کے جسموں کی جانچ پڑتال کی جاتی ہے اور ان کی مکمل تلاشی لی جاتی ہے۔ ایسے ہی ایک واقعہ میں یہ سب دیکھ کر ایک ہائی سکول کی استانی نے بہت زیادہ دکھ اور پریشانی کا اظہار کیا۔ جب حکام نے اس کے اس رویہ کا سبب پوچھا تو اس نے وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ ”چونکہ میں آئین پڑھاتی ہوں اس لیے۔“ اس کے بعد ایک پولیس افسر نے پرنسپل سے کہا کہ اس کے اس ”نویہ“ کے مسئلہ کی وجہ سے مستقبل کے کسی چھاپے کے دوران اسے حراست میں بھی لیا جاسکتا ہے۔ اس کے بعد پڑنے والے چھاپے کے دوران 1500 طالب علموں میں سے صرف اس استانی کے بیٹے کی سر سے پاؤں تک مکمل تلاشی لی گئی۔ اس کے بعد پارکنگ میں موجود گاڑیوں کی تلاشی لی گئی اور پولیس نے اس استانی کی گاڑی میں سے میری جو آنے کے سگریٹ برآمد ہونے کا دعویٰ کیا۔ تعلیمی بورڈ نے پہلے اسے معطل کیا اور پھر اسے ملازمت سے فارغ کر دیا گیا۔

O بے شمار سکولوں میں طالب علموں کو جن وجوہات کی بناء پر نکالا گیا ہے اور یہ سلسلہ مستقل جاری ہے وہ یہ ہیں: بغیر نسخہ کے درد کش دوا ایڈول کی بوتل سکول میں لے کر آنا۔ ”ناقابل قبول“ رنگ میں اپنے بال رنگنا، اپنی ہم جماعت کو ماہواری روکنے کے لیے مائیڈول ٹیمبلٹ دینا، لیسن ڈرائیس ”منشیات“ سکول لے کر آنا، کسی استاد کے لیے کمرس کے تختہ کے طور پر گفٹ پیپر میں لپٹی ہوئی شراب کی بوتل لانا وغیرہ ایک طالب علم کو اس لیے سزا دی گئی کہ

اس کے پاس اپنے کھانے کے لیے لائے ہوئے پھل کو کاٹنے کے لیے چھوٹا سا چاقو تھا، ایک نو سالہ بچہ کو اس لیے سزا دی گئی کہ اس نے پستول کی تصویر بنا کر کلاس میں لہرائی تھی، ایک چھ سالہ بچہ کو اس لیے اس کے گھر واپس بھیج دیا گیا کہ اس نے ایک بچی کے گال پر پیار کر لیا تھا، چوری ہونے والے روپوں کو تلاش کرنے کے لیے 8 سالہ بچوں کو سکول میں سب کے سامنے برہنہ کر کے ان کی تلاشی لی گئی (وہ رقم ان سے برآمد نہیں ہوئی)۔ چھوٹی جماعتوں سے چھٹی کلاس تک کے بچوں کے دیگر جسمانی اعضاء کے ساتھ ساتھ اعضاءے تاسل کو بھی لازمی طور پر جانچ پڑتال کی جاتی ہے، ہائی سکول میں طلباء میں شراب نوشی کی جانچ پڑتال کرنے کے لیے سانسوں کے ذریعہ تجزیہ کرنے والوں کو ملازم رکھا جاتا ہے۔

پولیس ہائی سکول کے طالب علموں سے پوچھتی ہے کہ ان میں سے کون جانا چاہتا ہے کہ کیمسٹری کی نصابی کتاب بم بنانے کے لیے تھی۔

ایک گیارہ سالہ لڑکے کو پولیس محرمات سے مباشرت (ایسی عورت سے ہم بستر ہونا جس سے نکاح حرام ہو) کے الزام میں گرفتار کر کے لے گئی کیونکہ ایک ہمسایہ نے گواہی دی تھی کہ اس نے اس لڑکے کو اپنی بہن کو ”جنسی“ طور پر چھوتے دیکھا ہے۔ اس لڑکے کو چھ ہفتوں تک بچوں کے جیل میں رکھا گیا اور صرف ایک بار عدالت میں پیش کیا گیا جہاں اس بچہ نے اور اس کے والدین نے بتایا کہ اپنی پانچ سالہ بہن کو پیشاب کرانے کے لیے اس نے جاگیہ اتارنے میں اس کی مدد کی تھی۔

دو دس سالہ لڑکوں پر اس لیے ”مجرمانہ فعل“ کا الزام عائد کر دیا گیا کہ انہوں نے اپنی استانی کی پانی کی بوتل میں تھوڑا سا صابن ڈال دیا تھا۔

O ہائی سکول کے ایک استاد کو بغیر تنخواہ کے ملازمت سے برخاست کر دیا گیا کہ اس نے حساب پڑھاتے ہوئے حقیقی زندگی کی مثال دے دی تھی جو یہ تھی کہ جیروم اپنی نصف پاؤنڈ ہیروئن میں سے کچھ کم کر کے 20 فیصد زیادہ منافع کمانا چاہتا ہے۔ بتائیے وہ کتنے اونس ہیروئن کم کرے گا؟

O قیدی بچوں کو اصلاحی سکولوں میں گنجا کر کے کئی ہفتوں کے لیے تاریک کوٹھڑیوں میں تنہا ڈال دیا جاتا ہے۔ صرف ایک قیدی میں ناک دیوار سے لگا کر سولہ سولہ گھنٹوں تک انہیں سیدھا کھڑا رہنے کی سزا دی جاتی ہے اور پھر ننگا کر کے ہاتھ باندھ کر بستر پر لٹا دیا جاتا

ہے۔ چھوٹے بچوں کو بالغ مجرموں کے ساتھ قید کر دیا جاتا ہے۔

O 1978ء کے غیر ملکی خفیہ نگرانی ایکٹ کے تحت قائم ہونے والی ایک وفاقی عدالت کو امریکہ میں برقی آلوں کے ذریعہ نگرانی کی اجازت کے حصول کے لیے درخواستیں موصول ہوتی رہتی ہیں جن کی وہ اجازت دے دیتی ہے۔ پہلے 20 سالوں کے دوران اس عدالت کو ایف بی آئی اور نیشنل سکیورٹی ایجنسی کی وساطت سے محکمہ انصاف کی جانب سے 10,000 درخواستیں موصول ہوئیں جن میں سے صرف ایک کو فی بنیاد پر مسترد کیا گیا باقی سب کی سب منظور کر لی گئیں۔

انفرادی کیسوں کے حوالے سے نہ تو کوئی عوامی نہ ہی کسی قسم کا مخفی ریکارڈ سامنے آیا۔ کلنٹن انتظامیہ نے عدالتی اختیارات کا دائرہ وسیع کرتے ہوئے محکمہ انصاف کو مکمل عدالت کے عمومی وارنٹ کے طریقہ کار سے جو کہ کسی جرم کی تفتیش کے لیے چیزوں کو قبضہ میں لینے اور چھان بین کے لیے ضروری ہوتا ہے ہلا ترا قرار دے دیا۔

اس خفیہ نگرانی کا ہدف وہ عناصر ہیں جو کسی ایسی تنظیم کی حمایت و معاونت کر رہے ہیں جو امریکہ کی نظر میں قابل نفرت ہے۔ وفاقی ایجنٹ اب آنے اور جانے والی ان تمام ٹیلیفون کالز کے نمبر حاصل کر سکتے ہیں جو کہ مشتبہ غیر ملکی ایجنٹوں کے زیر استعمال ہوں۔

O شراب پی کر گاڑی چلانے کے حوالے سے 80ء کی دہائی میں خون میں الکوحل کی مقدار 15. مقرر کی گئی جو بعد میں 10. کر دی گئی اور پھر بعض ریاستوں میں 08. ہو گئی۔ اگر 08. سے کام نہ بنا تو کیا کانگریس اور ریاستیں اسے 06. اور پھر 04. کر دیں گے؟ کسی موقع پر خود وفاقی حکومت ان کم کیے جانے والے پوائنٹس کا سائنسی جواز مانگے گی۔

نشہ کی حالت میں ڈرائیونگ کرنے والوں کو حراست میں لے کر پولیس فوری طور پر ان کی گاڑیاں قبضہ میں لے لیتی ہیں۔ اکثر اوقات پولیس فرد کے چھوٹ جانے کے باوجود گاڑی اپنے قبضہ میں رکھنے کی کوشش کرتی ہے۔

O لوگوں پر ان کے گھروں تک میں جوئے بازی کا الزام عائد کر کے انہیں ڈرایا دھمکایا جاتا ہے گرفتار کیا جاتا ہے یہاں تک کہ بعض واقعات میں ان کی جائیدادیں تک ضبط کر لی گئی ہیں۔ جبکہ دوسری جانب جوئے کے وہ اڈے جو مقامی یا ریاستی حکومت کی سرپرستی میں چل رہے ہوتے ہیں بغیر کسی خوف و خطر کے اپنا کام جاری رکھتے ہیں۔

O امریکہ کی جیلوں میں سینکڑوں سیاسی قیدی سڑ رہے ہیں۔ جیسا کہ امریکہ میں قائم انسانی حقوق کے گروپوں نے جینوا میں اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے کمیشن کے سامنے تصدیق کی اور ثبوت پیش کیے کہ ان لوگوں کو سیاسی اور سماجی تبدیلی و بہتری کے لیے اقدامات کرنے کی پاداش میں یہاں رکھا گیا ہے۔ انہوں نے 60ء اور 70ء کی دہائی میں سیاہ فاموں کی آزادی کی تحریکوں خصوصاً بلیک پینتھرز کے ارکان کے بارے میں بتایا جو یہاں قید ہیں۔ جبکہ دیگر قیدیوں میں مقامی امریکی سرگرم عناصر، ایٹمی سرگرمیوں کے مخالفین اور امریکہ کی پورٹریکٹو سطحی امریکہ اور دنیا بھر میں مداخلتوں اور جارحیت کی پالیسیوں کے مخالفین ہیں۔ ان میں سے بہت سے قیدی ایف بی آئی کے بدنام زمانہ کاؤنٹر انٹیلیجنس پروگرام (Cointelpro) کی گھناؤنی چالوں کا شکار ہوئے۔ اس پروگرام کا مقصد بلیک پینتھرز اور سفید فام انتہا پسندوں کو ”غیر جانبدار“ بنانا تھا۔ بہت سوں کو جانبداری وجہ سے تشدد کا سامنا کرنا پڑا۔ بائیں بازو کے مقاصد کے لیے کام کرنے والوں کے ساتھ ان لوگوں کی نسبت زیادہ وحشیانہ سلوک کیا گیا اور سخت ترین سزائیں دی گئیں جو یہی کام پیسہ کے لیے یادائیں بازو کے لیے کر رہے تھے۔ بہت سوں کو محض دھماکہ خیز مواد رکھنے کے جرم میں حالانکہ اس سے کسی قسم کا جانی یا مالی نقصان نہیں ہوا قید کی سزا بھگتتے ہوئے 50 سال سے زائد عرصہ گزر چکا ہے۔ اس قسم کے جرائم میں عام طور پر عدالت یا ریاست 10 سال قید کی سزا سناتی ہے۔ مگر یہ لوگ سیاسی قیدی ہیں۔

حالانکہ یہ خطرناک قیدی نہیں ہیں کہ جنہیں قید تنہائی میں ڈال دیا جائے اس کے باوجود ان سیاسی قیدیوں کو اکثر اوقات یہ سزا بھی بھگتنا پڑتی ہے۔

اکتوبر 1997ء میں کانگریس کے سیاہ فام اراکین نے دنیا کو ان سیاسی قیدیوں کے وجود کا احساس دلانے کے لیے ایک یادداشت پیش کی۔

O سیاسی پناہ کی تلاش میں امریکہ آنے والے پسماندہ ممالک کے باشندے بغیر کسی جرم کے نہایت ہی کمپری کی حالت میں امریکن جیلوں میں سڑ رہے ہیں۔ کچھ ناقابل برداشت صورتحال کا شکار ہو کر موت کے منہ میں جا رہے ہیں تو کچھ بیمار یوں کا علاج نہ ہونے کے سبب مر رہے ہیں۔ ان بھولے ہوئے انسانوں کے بارے میں کبھی ایمنسٹی انٹرنیشنل یا انسانی حقوق کی دیگر تنظیمیں کوئی رپورٹ جاری کر دیتی ہیں تو دنیا کو ان کے بارے میں پتہ چل

جاتا ہے ورنہ ان کے اپنے بھی انہیں دھوکہ دے چکے ہیں۔ ایف بی آئی اور آئی این ایس ان غیر ملکیوں کو قید رکھنے اور بلا آخر ان کے ملک واپس بھجوانے کے لیے خواہ انہوں نے امریکی شہریوں سے شادیاں ہی کیوں نہ کر رکھی ہوں ایسی خفیہ شہادتیں استعمال کرتی ہیں جنہیں دیکھنے کا حق نہ تو ملزمان کو اور نہ ہی ان کے وکیلوں کو دیا جاتا ہے۔ یہ غیر ملکی عام طور پر وہ لوگ ہوتے ہیں جو اپنے ملک میں انسانی حقوق کے لیے آواز اٹھاتے ہیں اور اس کے نتیجے میں اپنی حکومت کے تشدد اور ظلم و ستم کا نشانہ بننے کی وجہ سے وہاں سے بھاگنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ ہو سکتا ہے ان کی حکومتیں امریکہ سے درخواست کرتی ہوں کہ انہیں یا تو ہمیشہ کے لیے خاموش کر دیا جائے یا واپس بھیج دیا جائے۔ 1999ء میں آئی این ایس نے 10,000 سے زائد سیاسی پناہ کے طلبگاروں کو پکڑا۔ حالانکہ اسی سال فردری میں اقوام متحدہ کے ہائی کمشنر برائے مہاجرین کے امریکہ میں موجود نمائندہ نے امریکہ کو کہا تھا کہ غیر ملکیوں کو قید میں ڈالنے کا سلسلہ بند کر دے جنہیں شاید سیاسی قیدی بنایا جا رہا تھا۔

O بوائے سکاؤٹس نے ایک نوجوان کو رکنیت دینے سے انکار کر دیا کیونکہ وہ لادین اور دہریہ تھا جبکہ ایک بالغ کو اس لیے ٹروپ لیڈر سے نہیں بنایا گیا کیونکہ وہ ہم جنس پرست تھا۔ O 10,000 سے زائد ایف بی آئی کے ایجنٹ انٹرنیٹ کے ذریعہ لوگوں کو نشانہ بنانے میں مصروف ہیں۔ اکثر خود کو 13 سالہ لڑکی ظاہر کر کے مردوں کو ملاقات کے لیے آمادہ کیا جاتا ہے۔ جب وہ مرد خود کو ظاہر کر دیتا ہے تو اسے گرفتار کر لیا جاتا ہے۔

O قانونی طور پر امریکہ آنے والے بہت سے غیر ملکی بھی جیلوں میں سڑ رہے ہیں۔ ان کے سفارتخانوں کو مطلع کیے بغیر ان پر فرد جرم عائد کر دیا جاتا ہے۔ قیدی کو اس بات سے بھی آگاہ نہیں کیا جاتا کہ وہ خود اپنے سفارتخانہ سے رابطہ کرنے کا حق رکھتا ہے۔ ان میں سے کئی موت کی دہلیز پر پہنچ چکے ہیں۔

O آئی آر ایس بیک وقت جج، جیوری اور جلاؤ کا کردار ادا کر رہی ہے جس کا ٹیکس کی وصولی کا خوفناک طریقہ کار ٹیکس ادا کرنے والوں کے گلے میں پھانسی کا پھندا بنا ہوا ہے۔ یہ شہریوں کو ایسے ٹیکس ادا کرنے کا حکم بھی دیتی ہے جو ان پر لاگو ہی نہیں ہوتے۔ اور اگر وہ اس کی ہدایت کے مطابق ٹیکس ادا نہ کر پائیں تو ان کی گاڑیاں اور بینک اکاؤنٹ قبضہ میں لیے جاتے ہیں۔ اپنے دفتری اخراجات پورے کرنے اور عام لوگوں کی زندگیوں کو پریشانیوں

اور تباہی و بربادی سے دوچار کرنے کے لیے انتقامی طور پر ان پریکسوں کے جرماتوں کا بوجھ بھی لا دیا جاتا ہے۔ ان لوگوں کے خلاف چھان بین کا سلسلہ بھی شروع ہو جاتا ہے کیونکہ انہوں نے حکومت کے اعلیٰ عہدیدار کو پریشان کیا ہوتا ہے۔

O ان طالب علموں کی مالی اعانت کی جاتی ہے جو سگریٹ نوشی، شراب نوشی، منشیات کا استعمال اور سکول کے اصول و ضوابط کی خلاف ورزی کرنے والے اپنے ساتھی طالب علموں کی مکمل رپورٹ دیتے ہیں۔

ڈیر (Dare) اور سکولوں میں منشیات کے خلاف جاری دیگر پروگراموں کے ذریعہ بچوں کو سکھایا جاتا ہے کہ وہ اپنے والدین میں میری جوانہ اور دیگر منشیات کے استعمال کا پتہ لگائیں۔

نیویارک کے میئر نے شہریوں پر زور دیا ہے کہ وہ جنسی ویڈیو کی دکانوں اور بیہودہ شراب خانوں میں جانے میں والوں کی تصویریں بنایا کریں۔

خبر رسانی اور معلومات کے حصول کے دیگر منصوبوں میں لوگوں کو ہدایت دی جاتی ہے کہ وہ سیٹ بیلٹ نہ باندھنے والوں، غیر اخلاقی اور معنی خیز لطیفے سنانے والوں اور کوڑا کرکٹ صحیح طریقہ سے نہ ضائع کرنے والوں تک بارے میں مکمل معلومات فراہم کریں۔

O منشیات کا کاروبار کرنے والوں کو پہلی بار منشیات لانے اور لے جانے پر مامور افراد اور جن کے خلاف کسی قسم کی مجرمانہ کاروائیوں میں ملوث ہونے کا ثبوت تک نہیں ان کے ہمراہ طویل مدت کے لیے جیل بھیج دیا گیا۔

O ”تھری سٹراکس“ قوانین کے تحت لوگوں کو چھوٹی موٹی چوریوں کے جرم میں بھی 25 سال سے لے کر عمر قید کی سزائیں دی جا رہی ہیں حالانکہ ”تھری سٹراکس“ قوانین خطرناک جرائم کے لیے بنائے گئے ہیں۔

O گریڈ جیوری سسٹم بہت اچھے طریقہ سے کام کر رہا ہے۔ تقریباً تمام وفاقی مقدمات میں فرد جرم عائد کرنے کے لیے اسے استعمال کیا جاتا ہے۔ نہ تو ملزم وہاں موجود ہوتا ہے نہ اس کا وکیل اس لیے الزام عائد کرنے والے کی مخالفت نہیں کی جاسکتی۔ اس نظام کے ذریعہ خوف و ہراس پھیلایا جا رہا ہے۔ رشتہ داروں سے ٹیک دوسرے کے بارے میں معلومات حاصل کی جاتی ہیں اور ایک دوسرے کے خلاف گواہی دینے پر مجبور کیا جاتا ہے جسے

خفیہ بھی نہیں رکھا جاتا۔ والدین سے اپنی اولاد کے خلاف گواہی لی جاتی ہے، بہنوں کو بھائیوں اور بھائیوں کو بہنوں کے خلاف گواہی دینے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ یہ بڑھتے ہوئے انتظامی اختیارات کا ایک خفیہ ہتھیار ہے۔

○ وہ لوگ جو اپنے گھروں میں تنہائی میں ذہنی ورزشیں کرتے ہیں، نروان حاصل کرنے کے لیے لو لگاتے ہیں یا روحانی قوت کے حصول کے لیے مشقیں کرتے ہیں اپنے اس گناہ کے لیے ریاست کی طرف سے سزا کے مستحق قرار پاتے ہیں۔ نوجوانوں پر یہ الزام عائد کر کے کہ ان کے پاس سے تقریباً ایک گرام ایل ایس ڈی برآمد ہوئی ہے انہیں 20 سال کے لیے جیل بھیج دیا جاتا ہے اور اس سلسلہ میں کسی قسم کا ثبوت مہیا کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی کہ ان کے پاس ایسی کوئی چیز تھی یا اس سے کسی کو کوئی نقصان پہنچا۔

○ ہومن رائٹس وائچ نے ریاست کی حکومتوں پر وہی الزام عائد کیا ہے جو نیویارک پر لگایا تھا کہ وہ بین الاقوامی قانون کی خلاف ورزی کرتے ہوئے منشیات کا کاروبار کرنے والوں کو وہی سزائیں دے رہی ہیں جو خطرناک مجرموں کو دی جاتی ہیں۔ دو اونس کو کین فروخت کرنے والے شخص کو نیویارک میں عمر قید کی سزا دی جاتی ہے۔ یہ وہی سزا ہے جو وہاں ایک قاتل کو دی جاتی ہے۔

○ بہت سی ریاستیں جنسی جرائم کرنے والوں کے نام ایڈریس، مکمل بائیو ڈیٹا اور تصویریں شہر کر کے انہیں ان کے رہائشی علاقوں اور ملازمتوں سے نکھار رہی ہیں۔ اس سلسلہ میں اس نظریہ کو بھی مکمل طور پر نظر انداز کیا جا رہا ہے کہ جنسی جرم کرنے والا قابل اصلاح ہے اور اس کی اصلاح کر کے اسے مہذب شہری بنانا ریاست کا فرض ہے۔

○ والدین مذہبی گروپوں اور دیگر تنظیموں کی جانب سے مسلسل شکایات موصول ہونے پر سکولوں میں پڑھائی جانے والی سینکڑوں کتابوں کو نصاب تعلیم سے خارج کیا جا رہا ہے۔ عوامی لائبریریوں میں موجود کتابوں کے ساتھ بھی کچھ اسی قسم کا سلوک ہو رہا ہے۔ وہ کتابیں جن کے بارے میں فیصلہ سنا دیا گیا ہے کہ انہیں کوئی بھی پڑھنا پسند نہیں کرتا ان میں کچران دی رے، مکملیری فن، آلیور ٹوئسٹ، دی گرینچس آف رچھ، دی ڈائری آف این فرینک، آئی نو وائی دی کیج برڈسنگ شامل ہیں ان کے علاوہ بے شمار کم معروف ناول، بے شمار تاریخی کتب، سماجی کتابیں، جغرافیہ یہاں تک کہ ہوم اکٹاکس کی کتب، سکول کے اخبارات، غیر

نصابی مواد موسیقی اور فنون لطیفہ کو بھی نشانہ بنایا جا رہا ہے۔

O وہ افراد جو چاہتے ہیں کہ ان کی زندگی کا خاتمہ سکون سے ہو جائے انہیں ریاست کا قانون، کیتھولک چرچ اور شہری گروپ اس سلسلہ میں ڈاکٹر کی مدد لینے کی اجازت نہیں دیتے اور یگان میں اس سلسلہ میں ہونے والے ریفریٹم میں 60 فیصد آراء کا احترام کرتے ہوئے ڈاکٹروں کو خودکشی میں مدد دینے کی قانونی اجازت دے دی گئی۔ مگر ڈرگ انفورسمنٹ ایڈمنسٹریشن نے ڈاکٹروں کو خبردار کر دیا ہے کہ اگر انہوں نے کسی کی خودکشی کرنے میں مدد کی تو ان کا میڈیکل پریکٹس کا لائسنس ضبط کر لیا جائے گا خواہ اس دھمکی پر عملدرآمد ہو یا نہ ہو اثر تو یقیناً ہوگا۔

● بے شمار ایسے لوگ جنہیں شدید درد میں میری جوآنہ کے استعمال سے آرام مل جاتا ہے مگر سرکاری سطح پر انہیں اس کے استعمال کی اجازت نہیں دی جاتی۔ ریاستوں میں وٹرز نے میری جوآنہ کے بطور دوا استعمال کو قانونی حیثیت دلوانے کا بیڑہ اٹھایا ہے مگر حکام اسے جس حد تک مشکل بنا سکتے ہیں بنا رہے ہیں۔ ڈاکٹمن ڈی سی میں کانگریس نے اس حوالے سے ہونے والے ریفریٹم کے امکانات تک کا خاتمہ کر دیا ہے۔

O کینسر کے مریضوں کو شدید درد میں بھی مارفین کے استعمال کی اجازت نہیں دی جاتی کیونکہ منشیات کے خلاف جنگ کے پروگرام کے تحت ڈاکٹروں کو سختی سے منع کر دیا گیا ہے کہ چاہے کتنی ہی ضرورت کیوں نہ ہو اس قسم کی دوائیاں کسی صورت تجویز نہ کی جائیں۔

O بہت سے لوگوں کو مرنے والوں کی قطار میں کھڑا کیا ہوا ہے۔ اگر وہ خوش قسمت ہیں تو ان 75 مردوں اور عورتوں میں شامل ہو جائیں گے جنہیں 1976ء سے 1998ء کے دوران موت کی اس قطار سے رہا کر دیا گیا۔ ان کے کیس واپس لے لیے گئے کیونکہ وہ بے گناہ ثابت ہو گئے تھے۔

O سینکڑوں شہروں میں اونچے پیمانہ پر مسلح اور تربیت یافتہ ٹیمیں (SWAT) جنہیں خصوصی طور پر فوجی طرز کی کارروائیوں کے لیے تیار کیا گیا ہے باقاعدہ ملازم رکھی جا رہی ہیں اور ان کے بارے میں یہ تاثر دیا جا رہا ہے کہ یہ جرائم کے خلاف ”جنگ“ کا حصہ ہیں۔ انہیں دشمن (شہریوں) کو اپنی آٹومیٹک رائفلوں، ٹینکوں اور گرینینڈ لائچروں کے ذریعہ ہراساں کرنے میں مہارت حاصل ہوتی ہے۔ کسی قسم کی ہنگامی صورتحال نہ بھی ہو تو یہ اپنے کام

میں مصروف رہتے ہیں، کسی بھی محلے میں گھس کر گلیوں کے کونوں میں چھپ کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور پیدل چلنے والوں کو روک کر انہیں زمین پر گرا کر زبردستی ان کی تلاشی لی جاتی ہے، تصویریں بنائی جاتی ہیں اور پھر اپنی تمام ”خفیہ کارروائی“ پٹرول گاڑیوں میں موجود کمپیوٹرز کے ذریعہ ریاستی حکام کو روانہ کر دی جاتی ہے۔

O ایک معروف پرامن مجاہد کو جو صدر کی اعلانیہ مخالفت کرتا تھا خفیہ ایجنسیوں نے اس جگہ سے غائب کر دیا جہاں صدر نے خطاب کرنے کے لیے آنا تھا۔ صدر کا خطاب ختم ہونے کے بعد اسے رہا کر دیا گیا۔

O عدالت میں پیش ہونے والے مدعا علیہان اور قیدیوں کو تشدد کے ایک خاص آلے کے ذریعہ جو الیکٹرانک سکیورٹی بیٹن کہلاتا ہے 50,000 دھڑکتے ہوئے گائے جاتے ہیں۔

O نوجوانوں کو ایک منتخب خصوصی تنظیم میں زبردستی شامل کیا جا رہا ہے جو کہ حکومت مستقبل میں ”قومی سلامتی“ کو درپیش خطرات سے نمٹنے کے لیے تشکیل دی گئی ہے۔ اس سلسلہ میں کسی قسم کے مخالفانہ دلائل قبول نہیں کئے جاتے۔ جو لوگ اس تنظیم میں شمولیت سے انکار کرنے کی کوشش کرتے ہیں انہیں سخت سزائیں دی جاتی ہیں جن میں بھاری جرمانے، قید سخت اور سرکاری طور پر ملنے والی ہر قسم کی مالی سہولیات اور ملازمت کا خاتمہ وغیرہ شامل ہیں۔

وہ لوگ جو پہلے ہی اس تنظیم کے چنگل میں پھنسے ہوئے ہیں انہیں فوج کی طرف تربیت دی جاتی ہے وہ بغیر کسی قسم کی ہچکچاہٹ کے ان لوگوں کو جان سے مار دیں جنہیں نہ تو وہ جانتے ہیں نہ ہی جن سے ان کی کسی قسم کی دشمنی یا عداوت ہے اور اس تربیت کا مقصد یہ ہے کہ وہ ”قومی سلامتی“ کی اس جنگ میں اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرنے کے لیے بھی ہر لمحہ تیار رہیں۔ ایک ایسی جنگ جس کے اصل مقصد سے وہ آگاہ نہیں ہیں۔ انہیں ہر وقت کورٹ مارشل، معطلی اور اگر ملک کے شہری نہیں ہیں تو بالجبر دیس نکالنے کی دھمکیاں دے کر اپنے مقصد کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی انسانی حقوق کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ان پر نشانہ آور ادویات اور ویکسین کے تجربات کئے جاتے ہیں ان سے صحت پر کتنے مضر اثرات مرتب ہوتے ہیں یہ کوئی نہیں جانتا۔

O ان غیر ملکیوں کو امریکی شہریت دینے سے انکار کر دیا جاتا ہے جو اپنے مذہبی

نظریات کی بنیاد پر امریکہ کے دفاع کے لیے ہتھیار اٹھانے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ آئی این ایس مذہب کی بنیاد پر کسی دلیل کو نہیں مانتی، کسی انکار کو قبول نہیں کرتی۔

ایسا شہری جو باہوش و حواس کسی جنگ میں شمولیت سے انکار کر دے تو اس کے انکار سے یہ مطلب لیا جاتا ہے کہ اس نہ صرف اس جنگ میں حصہ لینے سے انکار کیا ہے بلکہ امریکہ کی ہر قسم کی جنگ میں شمولیت سے انکار کر دیا ہے۔ اس کے خلاف کارروائی کرتے ہوئے کسی قسم کا کوئی لحاظ نہیں کیا جاتا۔ (کنساس کی ایک خاتون ڈاکٹر نے جو فوج میں ریزرو کمیشن کی حیثیت سے خدمات سرانجام دے رہی تھی خلیج کی جنگ میں شریک ہونے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ یہ ”صحت عامہ کی عظیم المیہ“ ہے۔ اس جرم کی پاداش میں اس خاتون ڈاکٹر کو 8 ماہ تک ملٹری جیل میں قید رکھا گیا اور کنساس میڈیکل حکام نے اس کا میڈیکل لائسنس منسوخ کر دیا)

O ڈی ای اے اے ٹی ایف آئی این ایس ایف بی آئی ڈی آئی اے خفیہ ایجنسیوں، یو ایس فاریسٹ سروس، نیشنل پارک سروس اور محکمہ پولیس کے سرکاری ”کاؤنٹر ایئر“ سیاہ لباس میں ملبوس نقابوں میں چہرے چھپائے اسلحہ سے لیس دہلا دینے والی آوازوں کے ساتھ گرد ہوں کی شکل میں لوگوں کے گھروں میں منشیات برآمد کرنے اور ان افراد کو تلاش کرنے جو عام طور پر وہاں موجود نہیں ہوتے زبردستی گھس جاتے ہیں فرنیچر توڑ پھوڑ دیتے ہیں گھروالوں کو مارتے پیٹتے ہیں ان کے ہاتھ باندھ دیتے ہیں حاملہ خواتین سے بیہودہ چھیڑ چھاڑ کرتے ہیں بچوں کو خوفزدہ کرتے ہیں انہیں ان کے والدین سے علیحدہ کر کے ان کے خوف سے لطف اٹھاتے ہیں لوگوں کو گولیاں مار کر ہلاک کر دیتے ہیں۔ یہ ساری کارروائی کسی مجرم کی محض ایک ہی اطلاع پر فوری طور پر عمل میں لائی جاتی ہے اور اطلاع کی تصدیق کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی جاتی۔

بھاری اسلحہ سے لیس یہ شکاری جن کی پشت پر قانون کی مکمل حمایت ہوتی ہے لوگوں کو اغوا کر لیتے ہیں انہیں قتل کر دیتے ہیں اور اکثر اوقات ”غلط“ آدمی کو مار دیتے ہیں۔ ایف سی ایجنٹس، فیڈرل مارشلز، سواٹ (SWAT) ٹیم، کنستبلز ایجنٹس اور مقامی پولیس پر مشتمل ٹیمیں ریڈیو سٹیشنوں پر بھی حملے کرتی ہیں۔

O جہاز حروری کا سلسلہ روز بروز بڑھ رہا ہے۔ لوگوں کو کسی قسم کی سہولیات اور ویلجیر گرانٹس کے بغیر کام کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے، کبھی تھوڑی بہت اجرت دے دی جاتی اور

کبھی بالکل ہی نہیں دی جاتی، سزا یافتہ مدعا علیہان کو ”کیونٹی سرورس“ بھیج دیا جاتا ہے۔ باشعور لوگ جو اس پر اعتراض کرتے ہیں انہیں ایسی متبادل ملازمت دی جاتی ہے جو فوجی ملازمت سے بھی زیادہ طویل المدت ہوتی ہے دراصل انہیں اپنا شعور استعمال کرنے کی سزا دی جاتی ہے جو لوگ قید خانوں میں کام کرنے سے انکار کرتے ہیں انہیں ہر قسم کی سہولیات سے محروم کر دیا جاتا ہے، بہت سے نچی کینوں میں بھیج دیئے جاتے ہیں جہاں اجرتیں نہایت کم ہوتی ہیں اور کسی قسم کی سہولیات اور یونین کا تصور تک نہیں ہوتا۔ (قید خانوں کی بہت سی پیداوار بیرون ملک برآمد کر دی جاتی ہے جبکہ یہی کام جب چین نے کیا تو امریکہ نے اس کی بے حد مذمت کی)

O دنیا بھر میں امریکی سفارتخانے ان مخصوص امریکی مسافروں کی کڑی نگرانی کرتے ہیں جن کی ایف بی آئی اور محکمہ خارجہ کے پاسپورٹ آفس کی جانب سے نشاندہی کی جاتی ہے۔

O آئی این ایس اور امریکی بارڈر پٹرول میکسیکو کے بارڈر پر مستقل کے تارکین وطن کو یا تو جان سے مار دیتے ہیں یا جسمانی طور پر تشدد کا نشانہ بناتے ہیں۔ ملک بھر میں قائم آئی این ایس کے مراکز میں ہزاروں تارکین وطن کے ساتھ نہایت ہی غیر انسانی سلوک کیا جاتا ہے۔ ان کا سر کوڑ میں گھسا دینا، زبردستی نشہ کرانا اور برہنہ کر کے یہ گانے پر مجبور کرنا کہ ”امریکہ نمبر ون ہے“ وغیرہ وغیرہ جیسی کارروائیاں شامل ہیں۔

O آئی این ایس غیر قانونی طور پر سوشل ایجنسی کے ان ملازمین کی فائلیں ضبط کر لیتی ہے جو بغیر دستاویز کے امریکہ آنے والے تارکین وطن سلسلہ میں کام کر رہے ہیں۔ وکیل اور متاثرین کے لیے کام کرنے والے دیگر لوگوں کے لیے شکایت دائر کرنا اور آئی این ایس یا بارڈر پٹرول کی جانب سے اس سلسلہ میں وضاحت حاصل کرنا ناممکنات میں سے ایک ہے۔ ذرائع ابلاغ اور انسانی حقوق کی تنظیموں کو تو اس معاملہ سے بالکل علیحدہ کر دیا گیا ہے۔

O اس انجیلس میں وفاقی اور مقامی مسلح قوتیں جن میں رائٹ سکواڈ، ماؤنٹڈ پونش، اے ٹی ایف ایجنش، آئی این ایس کمانڈو پونش شامل ہیں مجبوس خانوں اور آئی این ایس کی کارروائیوں کے خلاف ہونے والے احتجاجی مظاہروں کو بری طرح کچل دیتی ہیں۔ ہجوم کو منتشر کرنے کے لیے آنسو گیس اور پانی کا وحشیانہ طریقہ سے استعمال کیا جاتا ہے..... احتجاجی مظاہرین کی بڑی تعداد زخمی ہو جاتی ہے جنہیں گرفتار کر لیا جاتا ہے۔ ان میں سے جن کے

پاس مکمل دستاویزات نہیں ہوتیں انہیں پولیس نیشن سے براہ راست زبردستی ان کے ملک واپس روانہ کر دیا جاتا ہے۔

○ بے سہارا مدعا علیہان کئی ماہ تو عدالت کی جانب سے ان کے لیے وکیل مقرر ہونے کے انتظار میں گزار دیتے ہیں اور پھر اگلے کئی ماہ اس وکیل سے بات کرنے کے انتظار میں گذر جاتے ہیں۔

○ ضمانت کا تصور نہایت تیزی سے ختم ہو رہا ہے۔ ہمیں شروع سے یہ بتایا گیا ہے کہ معاشرتی اصول اور قانون کے مطابق سوائے کسی بہت بڑے جرم کے ہر جرم قابل ضمانت ہوتا ہے۔ یہ بھی قانون ہے جس طویل مدت سے عملدرآمد ہو رہا ہے کہ کسی کو بھی اس وقت تک قید میں نہیں رکھا جاسکتا جب تک کہ اس کا جرم ثابت نہ ہو جائے۔ مگر اب یہ نظریہ اصول اور یہ قانون سب ختم ہو گئے ہیں۔ اب ہمارے گرفتاری اور قید کا ایک نیا ہی نظریہ سامنے آیا ہے۔

○ شہریوں پر کسی ملک کے لیے مجبوری کرنے یا مجبوری کی کوشش کرنے کا الزام لگا کر

طویل مدت کے لیے قید میں ڈال دیا جاتا ہے اکثر یہ عمر قید میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ جس اطلاع کا انکشاف کیا جاتا ہے وہ یا تو پہلے ہی منظر عام پر آ چکی ہوتی ہے یا پھر اس حد تک ناکارہ ہوتی ہے کہ اس سے دور دور تک امریکہ کو یا کسی اور کو کسی قسم کا نقصان پہنچنے کا اندیشہ نہیں ہوتا۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ یہ بات ان کو ناگوار گذرتی جو خود بڑے پیمانے پر خفیہ کھیل حب الوطنی کے کھیل یا دشمنی کے کھیل کھیل رہے ہوتے ہیں۔ یہ شاطر کھلاڑی موقع کی تلاش میں رہتے ہیں کہ کب کوئی شکار ہاتھ آئے اور یہ اعلان کریں کہ ”غداری نے امریکہ کی قومی سلامتی کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا ہے۔“ بعض کیس تو ایسے بھی ہیں کہ تمام اطلاعات ایف بی آئی کو پہنچائی گئیں مگر اطلاعات حاصل کرنے اور کام نکل جانے کے بعد ان لوگوں کو نہایت چال بازی سے خبر ثابت کر کے کئی دہائیوں کے لیے جیل کی سلاخوں کے پیچھے پہنچا دیا گیا۔

○ وفاقی حکومت 5 ملین سالانہ کی شرح سے نئی دستاویزات کی تیاری میں مصروف ہے۔ یہ دستاویزات اس جمہوری ملک کے عام شہریوں کی پہنچ سے باہر ہیں کیونکہ ان پر ”خفیہ“ اور ”انتہائی خفیہ“ کی مہریں ثبت ہیں۔

○ صحرائے نواڈا میں محکمہ دفاع کے ”ایریا 51“ کے کارکن جلائے جانے والے کیمیائی فضلہ کا شکار ہو رہے ہیں۔ زہریلے کیمیائی مادوں سے آلودہ فضا میں سانس لینے کی وجہ

سے وہ انتہائی خطرناک بیماریوں میں مبتلا ہو رہے ہیں جن میں سے زیادہ تر جان لینے کے بعد ہی ملتی ہیں ان ہلاکت خیز امراض میں سانس کی تکلیف، کینسر، جسم میں ناقابل برداشت درز، آنتوں میں زہر اور جلدی امراض شامل ہیں اس کے علاوہ نشوز میں زہریلے مادے بھر جانے کا ناقابل علاج مرض بھی پیدا ہو گیا ہے جو دنیا میں بہت کم انسانوں میں پایا جاتا ہے مگر ”ایریا 51“ کے گرد حفاظتی انتظامات اس قدر سخت ہیں کہ متاثرین کو یہ تک علم نہیں ہو سکتا کہ وہ کس قسم کے کیمیائی مادوں کا شکار ہوئے ہیں کہ اس کے مطابق مناسب علاج معالجہ کرایا جاسکے۔ وہ تو کسی قسم کے ہرجانہ کا مطالبہ بھی نہیں کر سکتے کیونکہ قانونی طور پر ”ایریا 51“ کی تحقیقات پر پابندی ہے۔ قومی سلامتی کے نقطہ نظر سے اس علاقہ کو ہر قسم کے قانون سے بالاتر قرار دے دیا گیا ہے۔

O سیاہ یونیفارم میں ملبوس افران، جن کے پیروں میں سیاہ بھاری جوتے اور چہروں پر سیاہ نقاب ہوتے ہیں، جن کے یونیفارم پر ان کے ناموں کی تختیاں نہیں ہوتیں کسی بھی جیل میں اچانک ہی دھاوا بول دیتے ہیں قیدیوں کو مار مار کر ان کے بستروں پر سے اٹھاتے ہیں انہیں برہنہ کر کے ان پر تشدد کرتے ہیں انہیں دھکے دیتے ہیں ان کی پشت پر کودتے ہیں ایسے ہی ایک واقعہ میں ایک قیدی کا سر پوری قوت کے ساتھ دیوار سے ٹکرایا گیا، ہڈیاں چٹخنے کی آواز اور اس کے ساتھ ہی قیدی کی دلخراش چیخوں نے فضا کو دہشت ناک بنا دیا۔ دیوار پر اور زمین پر ہر طرف خون ہی خون تھا۔ اس قسم کے مظاہرے اکثر و بیشتر دیکھنے میں آتے ہیں کیونکہ اصلاحی کشتہ کو قیدیوں کی ناز برداری پسند نہیں ہے۔

O ہیومن رائٹس واچ اور اے سی ایل یونے ایک بار پھر انکشاف کیا ہے کہ امریکہ انٹرنیشنل کوویٹ کے آرٹیکل 10 کی مسلسل خلاف ورزی کر رہا ہے جو شہری و سیاسی حقوق کے بارے میں ہے۔ حالانکہ امریکہ 1992ء میں اس آرٹیکل کی توثیق کر چکا ہے جس کے مطابق ”بحیثیت انسان تمام قیدیوں اور زیر حراست افراد کا پیدائشی حق ہے کہ ان کے ساتھ انسانی سلوک کیا جائے۔“ (1999ء کے دوران این وائی پی ڈی کے خلاف 2,324 دعوے دائر کئے گئے جن کے مطابق جیل میں ہر دس دن کے بعد کوئی نہ کوئی قیدی وحشیانہ تشدد کا شکار ہو کر ہلاک ہو رہا ہے۔ ان ہلاکتوں کے ذمہ دار پولیس افسروں کے خلاف نہ صرف یہ کہ کسی قسم کی کوئی کارروائی نہیں کی گئی بلکہ کچھ عرصہ بعد انہیں ترقی دے دی گئی)

O کیلیفورنیا میں نوجوانوں کو صرف اس لیے پکڑا جاتا ہے ہر اس سال کیا جاتا ہے ان کی تصاویر اتاری جاتی ہیں اور پوچھ گچھ کی جاتی ہے کیونکہ انہوں نے بد معاشوں کی طرح کے کپڑے پہنے ہوتے ہیں یا پھر مشہور بد معاش گروپوں کے رنگ کے کپڑوں میں ملبوس ہوتے ہیں۔

صبح سویرے شریف کے نائین مشتبہ بد معاش گروپوں کے ارکان کے والدین کے گھروں میں پہنچ جاتے ہیں اور انہیں دھمکیاں دیتے ہیں کہ اگر انہوں نے اپنی اولاد کی ذمہ داری نہ لی تو ان پر سنگین جرائم کے الزامات عائد کر کے جیل بھیج دیا جائے گا۔

O ڈیٹرائٹ، نیویارک، فلاڈیلفیا، لاس اینجلس اور انڈیا نا جیسے بڑے شہروں میں پولیس کے نزدیک قانون کی کوئی حیثیت نہیں ہے حالیہ برسوں میں تو قانون کا مذاق اڑانے کے مظاہرے کچھ زیادہ ہی بڑھ گئے ہیں مثال کے طور پر تلاشی کے وارنٹس کے حصول کے لیے عدالت کو جھوٹی اطلاعات فراہم کرنا، بغیر وارنٹس کے کارروائیاں کرنا، جھوٹا حلف اٹھانا، فوجداری کیسوں میں منشیات کے جعلی ٹیسٹوں کے نتائج کے استعمال کی اجازت دینا، منشیات، پیسہ، اسلحہ اور دیگر بیش قیمت اشیاء چرانے کے لیے منشیات کی تلاش کے لیے جھوٹے چھاپے مارنا، منشیات کے بیوپاریوں کی رہائی کے بدلے ان سے پیسہ اور منشیات لینا، لوگوں کو ان کی رہائشگاہوں کے قریب لوٹنا اور مار پیٹ کرنا وغیرہ وغیرہ۔

لا قانونیت اور انفرادی حقوق کی پامالی کے مظاہرے اس وقت بھی دیکھنے میں آتے ہیں جب وہ تلاشی کے بہانہ لوگوں کے گھروں میں زبردستی کھس جاتے ہیں اور پھر ایسی تباہی پھیلاتے ہیں کہ الامان الحفیظ۔ خاص قسم کی بندوقوں کے ذریعہ فائر کر کے دروازوں کو ان کے قبضوں سے علیحدہ کر دیا جاتا ہے یا تالے توڑے جاتے ہیں پھر گھر والوں کو خوفزدہ کرنے کے لیے گھر کے اندر بارودی گولے پھینکے جاتے ہیں جن سے ہونے والے دھماکوں سے کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی، لوگوں کی غیر قانونی طور پر تلاشی لی جاتی ہے اپنی بندوقوں کے ذریعہ ان کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کی جاتی ہے، بغیر کسی وجہ کے لوگوں پر گولیاں چلائی جاتی ہیں، انہیں ہلاک کر دیا جاتا ہے، بے گناہ لوگوں پر منشیات کا الزام لگا کر اور جھوٹی گواہیوں کے ذریعہ انہیں حراست میں لے لیا جاتا ہے، گواہیوں میں جب جی چاہے تہدیلیاں کر دی جاتی ہیں، لوگوں کو بچا کر کے گھر سے باہر نکلنے پر مجبور کیا جاتا ہے، گرفتاری کی جھوٹی رپورٹیں درج کی جاتی ہیں۔ بعض

اوقات ان تمام کارروائیوں کے بعد کوئی الزام عائد نہیں کیا جاتا کیونکہ اس کا مقصد ان لوگوں کو ڈرانا دھمکانا اور اذیت دینا ہوتا ہے جو ان کے خلاف شکایت کرتے ہیں۔

O نابالغ بچوں کو چھوٹے موٹے جرائم میں گرفتار کرنے کے بعد غیر قانونی طور پر انہیں ہنگا کر کے ان کی تلاشی لینے کے خلاف 60,000 لوگوں کی جانب سے نیویارک سٹی میں نئے مقدمات دائر کئے گئے ہیں۔

O بڑی بڑی کارپوریشنیں اور کاروباری ادارے بھاری معاوضے ادا کر کے تعلقات عامہ کی کمپنیوں کی خدمات حاصل کرتے ہیں جو کہ اپنے وکیلوں، جاسوسوں، سرانرساؤں اور اپنی شیطانی مہموں کے ذریعہ ابلاغ اور رائے عامہ کو ان صحافیوں، مضمون نگاروں اور خوراک، ماحولیات اور دیگر سماجی شعبوں سے متعلق سرگرم عناصر کے خلاف منظم کرتی ہیں جو ان کے کلائنٹس کے لیے مستقبل میں خطرہ بن سکتے ہیں۔ ان کی کوشش ہوتی ہے کہ اگر یہ ان سرگرم عناصر کو جرائم پیشہ نہ ثابت کر سکیں تو یہ کم از کم اپنے سیاسی حقوق کی جدوجہد کرنے والے بیوقوف اور احمق ضرور نظر آئیں۔

O این بی سی ایک ایٹمی سرگرم کارکن کو جو ایک نیٹ ورک کی مالک ہے اس لیے مسٹر وکر رہی ہے کہ اس نے جنرل الیکٹرک پر تنقید کر دی تھی۔ ایک اور ایٹمی کارکن یا مضمون نگار یا فوجی اخراجات کے مخالف کو سی بی سی کی جانب سے اس لیے خوش آمدید نہیں کہا جاتا کہ اس کا تعلق ویسٹنگ ہاؤس سے ہے۔

O مختلف ملکوں پر تازہ ترین امریکی جارحیت کے دوران ذرائع ابلاغ پر بہت زیادہ پابندیاں عائد کر دی گئی ہیں۔ یہ مکمل طور پر حکومت کے دباؤ میں ہیں کہ انہوں نے جنگ کے بارے میں امریکی عوام تک کوئی خبریں پہنچانی ہیں اور کوئی نہیں۔ رپورٹر کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ اپنی رپورٹ کی کاپی سب سے پہلے پینٹاگون کو سنسر کے لیے پیش کریں، پینٹاگون ہی انہیں بتاتا ہے کہ وہ کہاں جاسکتے ہیں، کوئی فلم بنا سکتے ہیں اور کس کا انٹرویو کر سکتے ہیں اور جو ان احکامات پر عمل نہیں کرتے ان کے مالکان پینٹاگون کے بے پناہ دباؤ پر ان کا تبادلہ کر دیتے ہیں۔

O ایف بی آئی امریکہ میں ویتنامی اور روسی زبانوں میں شائع ہونے والے اخبارات میں اشتہار دے رہی ہے جن میں تاریکین وطن سے مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ وہ اپنے درمیان موجود مشتبہ جاسوسوں کے بارے میں اسے اطلاع دیں۔

O قیدی جو کیتھولک پادری کے سامنے خدا کے نام پر جو بھی اعتراف کرتے ہیں اسے جیل کے حکام ریکارڈ کر لیتے ہیں۔ قیدیوں کی ذاتی ڈاک ان کے حوالے کرنے سے پہلے کھول کر پڑھی جاتی ہے۔ صرف سزایافتہ قیدیوں کے ساتھ یہ سلوک نہیں ہوتا بلکہ مقدمہ بازی کے منتظر قیدیوں کے ساتھ بھی یہی سب کچھ ہوتا ہے۔

O ایف بی آئی مقدمہ کی کارروائی میں استعمال کرنے کے لیے تصویریں تیار کرتی ہیں اور اس کی جرائم کی لیبارٹری اپنا کام نہایت منظم طریقہ سے کرتی ہے جس میں مدعا علیہان کے خلاف سرکاری کیس کو فائدہ پہنچانے کے لیے شہادتوں میں تبدیلی کرنا، ان کی غلط سمت رہنمائی کرنا، حتیٰ کہ جج کو جھوٹے الزامات پر سزا سنا دینے تک کی اجازت ہوتی ہے۔ بیورو کا افسر کوئی بھی ایسی رپورٹ جس میں ایف بی آئی کی کارروائیوں پر تنقید کی گئی ہوتی ہے اپنے وکیلوں تک کے علم میں لائے بغیر اسے ضائع کر دیتا ہے۔ ملزم پر جھوٹے الزام کو درست ثابت کرنے کے لیے بیورو ہر حربہ اختیار کرنے کی اجازت دیتی ہے۔ اس سلسلہ میں جھوٹی اور نامکمل گواہیاں تک تسلیم کر لی جاتی ہیں۔

ایف بی آئی کے ایک نہایت تجربہ کار اور ماہر ایجنٹ کو بیورو کی ان کارروائیوں پر اعتراض کرنے کی پاداش میں پہلے تو خوفزدہ کیا گیا پھر معطل کر دیا گیا۔

O لوگوں کی بہت ہی خاص اور ذاتی معلومات پر مبنی طبی رپورٹیں حاصل کر کے ہسپتال کے نیٹ ورک ایچ ایم او، ادویات کی کمپنیوں اور انشورنس کمپنیوں کے منظم کردہ کمرشل ڈیٹا بینک میں محفوظ کر لی جاتی ہیں یہ تنظیمیں ڈاکٹروں اور دیگر معالجین کو مجبور کرتی ہیں کہ وہ اپنے مریضوں کے بارے میں انہیں مکمل معلومات فراہم کریں۔ کارپوریشنیں ملازمت کے لیے آنے والوں سے ان کا مکمل طبی ریکارڈ طلب کرتی ہیں۔ قانون نافذ کرنے والے اور قومی سلامتی کے ادارے بھی ان معلومات کے حصول میں دن رات مصروف رہتے ہیں۔

O شہریوں کی نقل و حرکت پر نظر رکھنے کے لیے پولیس گلی محلوں میں زیادہ سے زیادہ کیمرے نصب کر رہی ہے۔

O لاابالی لوگ پولیس کا مستقل ہدف ہیں۔ ان کو تنگ کرنے کے لیے پولیس کارروائیاں کرتی رہتی ہے۔ ان پر ”غیر اخلاقی حرکات“ کے الزامات عائد کر کے ان سے بھاری رقمیں ہتھیائی جاتی ہے۔ ریاست کے قانون کے مطابق ہم جنس پرستی ممنوع ہے مگر خفیہ

طور پر ہونے والی مخالف جنس پرستی کے بارے میں یہ کچھ نہیں کہتا۔ شادی شدہ مرد جو جنسی کلبوں کو چھوڑ چکے ہیں پولیس والے ان کی ماضی کی تصویروں کے ذریعہ انہیں بلیک میل کرتے ہیں۔ انہیں دھمکیاں دی جاتی ہیں کہ اگر انہوں نے مطلوبہ رقم فراہم نہ کی تو ان کی یہ تصویریں ان کی بیویوں اور دفتر کے مالکوں کے حوالے کر دی جائیں گی۔

○ طالب علموں کو امریکی جھنڈے کے احترام میں کھڑے نہ ہونے اور جانثاری کا اعیادہ کرنے سے انکار کے جرم میں سکول سے نکال دیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ سکول اخبار میں یا گھر میں اپنے ذاتی ویب پیج پر اپنے خیالات کا اظہار کرنے کی پاداش میں ان کا اسکول میں داخلہ ممنوع قرار دے دیا جاتا ہے۔

○ آئی این ایس ان تارکین وطن کو خط بھیجتی ہے جو اپنی قانونی حیثیت کے حصول کے لیے درخواست دیتے ہیں۔ اس خط کے ذریعہ تارکین وطن کو اپنے شناختی کارڈ کے ہمراہ وفاقی عمارت میں آنے کے لیے کہا جاتا ہے تاکہ آئی این ایس انہیں سال بھر کے لیے کام کرنے کا اجازت نامہ فراہم کر سکے۔ جب یہ تارکین وطن بے تابی سے آئی این ایس کے دفتر پہنچتے ہیں تو انہیں فوری طور پر گرفتار کر کے جبراً ان کے ملک واپس بھیج دیا جاتا ہے۔

○ پولیس سرکوں پر گاڑیوں کو روک کر مسافروں سے نقدی اور قیمتی اشیاء چھین لیتی ہے۔ ان سے رشوت طلب کی جاتی ہے انکار کی صورت میں جھوٹے الزامات عائد کر کے گرفتار کرنے کی دھمکیاں دی جاتی ہیں۔

اب سپریم کورٹ کے حکم کے مطابق پولیس اس شبہ میں کہ ڈرائیور نے کوئی غلط کام کیا ہے گاڑی میں موجود تمام مسافروں کی اور گاڑی کی مکمل تلاشی لیتی ہے۔

○ ایریزونا میں وائس سکواڈز کے پردہ میں سیاہ نقاب پوش بالٹوں کے ایک اخبار کی سینکڑوں جلدیں پریس سے نکلنے ہی اپنے قبضہ میں لے لیتے ہیں۔

○ کسی بھی امریکی شہر میں کسٹم آفیسر کیوبا کے اخبار گراما کی جلدیں اپنے قبضہ میں لے لیتے ہیں اس کے علاوہ عراق سے واپس آنے والے امریکی شہریوں سے وہاں بنائی ہوئی ویڈیو کیٹشیں بھی کسٹم والے چھین لیتے ہیں۔

○ ملک بھر کی جیلوں میں ذہنی طور پر معذور قیدیوں کے علاج معالجہ کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ اکثریت اپنے ساتھی قیدیوں اور محافظوں کی جانب سے جسمانی اور جنسی حملوں کا

شکار رہتے ہیں۔

O وہ لوگ جنہیں ذہنی طور پر معذور اور ناقابل علاج قرار دے دیا گیا ہے انہیں ان کے علم میں لائے بغیر مختلف تجربات کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے۔ ایسے بے شمار لوگ ملک بھر میں مختلف تحقیقی اداروں میں خود پر تجربات کر رہے ہیں۔

O ڈرگ انفورسمنٹ اتھارٹی، دیگر وفاقی اور ریاستی ایجنٹس اور پولیس منشیات کے مشتبہ بیوپاریوں اور ان کے شریک حیات کی جائیداد، گھر، کشتیاں، گاڑیاں، ہوائی جہاز، بینک اکاؤنٹ، فرنیچر اور دیگر تمام اثاثے خواہ جرم ثابت ہو یا نہ ہو اور ان تمام اثاثوں کو جرم سے واسطہ نہ بھی کیا گیا ہو اپنے قبضہ میں لے لیتے ہیں۔ ایک ریاست میں ایک شخص کو دو گرام کوکین فروخت کرنے کی پاداش میں اپنے گھر اور کاروبار سے ہاتھ دھوئے پڑے۔ ایک اور واقعہ میں نئی گاڑیوں کا کاروبار کرنے والے شخص کی کئی گاڑیاں قبضہ میں لے لی گئیں کیونکہ اس نے اپنے نقد لین دین کے حساب میں 10 ہزار ڈالر کا اندراج نہیں کیا تھا۔

ایک اور جگہ ایک 75 سالہ ضعیف خاتون کا گھر اس لیے قبضہ میں لے لیا گیا کہ اس منشیات کے کاروبار میں ملوث بینا روپوش ہو گیا تھا جس کے جرم کی سزا اس کی بجائے اس کی بوڑھی ماں کو دی گئی۔

سرکاری ایجنسیاں یہ اثاثے فروخت کر کے ان سے حاصل ہونے والی رقم اپنی پٹرول گاڑیوں سے لے کر دعوتوں تک ہر قسم کی عیاشیوں میں اڑا رہی ہیں۔ اکثر اوقات قرق شدہ اشیاء کی قیمت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاتا ہے کہ چھاپہ کس نے مارا ہے۔ پولیس عام طور پر نقدی چھینے کا قابل قبول جواز تراشنے کے لیے خود منشیات رکھ دیتی ہے اور پھر الزام عائد کر کے جموئی رپورٹیں درج کر لیتی ہے۔ منشیات کے بیوپاریوں کے خلاف مقدمات ختم کرنے کے لیے ان کے ساتھ باقاعدہ سودے بازی کی جاتی ہے۔ اس سودے میں وہ لوگ اپنی وہ جائیدادیں اور اثاثے بھی ان کے حوالے کر دیتے ہیں جن کا غنیمت کے کاروبار سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ 1999ء کے آغاز میں وفاقی حکومت کے خزانہ میں قرق شدہ اثاثہ جات کی مد میں 2.7 ملین ڈالر موجود تھے۔

O انصاف کا حصول اب ہر ایک کے لیے ممکن نہیں رہا۔ پچھلی ایک ہائی کے دوران حکومت نے قانونی امداد کے پروگرام میں ہفتی نمایاں کمی کی ہے اس سے قانون اور انصاف تک

کیساں رسائی کا تصور ناپید ہوتا جا رہا ہے۔ بس غریب کو اگر اپنے مالک مکان کے رویہ کے خلاف شکایت کرنی پڑ جائے، شریک حیثیت کے دھوکہ کے خلاف مقدمہ دائر کرنا ہو، کاروبار میں فراڈ کا مقدمہ درج کرانا ہو جائیداد کا کوئی مسئلہ ہو یا اسی قسم کے کسی مسئلہ میں قانونی امداد لینی پڑ جائے تو اسے قدم قدم پر لوٹنا جانا ہے اور انصاف پھر بھی فراہم نہیں کیا جاتا۔

O لوگ پولیس افسروں کے رویہ کے خلاف شکایت کرنے پولیس سٹیشن جاتے ہیں تو ان کی بات سننے بغیر انہیں دھکے دے کر باہر نکال دیا جاتا ہے۔

O بڑے شہروں میں پولیس پارکوں اور عوامی مقامات پر سونے والے بے گھر لوگوں کو پکڑا کر ایسی جگہ چھوڑ دیتے ہیں جہاں معزز شہریوں خصوصاً سیاحوں کی ان پر نظر نہ پڑے۔
O بے گھروں کو پارکوں اور دیگر عوامی مقامات پر کھانے پینے کی چیزیں دینے والے لوگوں کو بغیر اجازت خوراک تقسیم کرنے کے جرم میں گرفتار کر لیا جاتا ہے۔

O بہت سی ریاستوں میں ہزاروں لوگوں کے ڈرائیونگ لائسنس منسخت کے الزام میں 6 ماہ کے لیے معطل کر دیئے جاتے ہیں۔

O بے شمار لوگوں کو اس لیے ہراساں یا گرفتار کیا جاتا ہے کہ منشیات سونگھنے والے کہتے ان کے پاس منشیات کی نشاندہی کر دیتے ہیں۔ اگرچہ قانون نافذ کرنے والے ادارے اور سائنٹفک حلقے اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہیں کہ امریکی کرنسی میں کوکین اور دیگر منشیات بھی خاصی مقدار میں شامل کی جاتی ہیں۔ لاس اینجلس میں انکشاف ہوا تھا کہ امریکہ کے 75 فیصد زیر گردش کاغذی نوٹوں میں منشیات کی ملاوٹ تھی۔

O لاس اینجلس کے روڈنی کنگ اور بروکلین کے لیو لویمیا کے ساتھ پولیس نے ظلم و بربریت کی جو داستان رقم کی تھی اس طرح کے بے شمار واقعات آئے دن وقوع پذیر ہو رہے ہیں مگر جائے وقوعہ پر کوئی ویڈیو کیمرہ یا موقعہ کا گواہ نہیں ہوتا کہ پولیس کے ہاتھوں شکار ہونے والے کی ہلاکت کی اصل وجہ معلوم ہو سکے۔ اسی لیے اس کی اچانک موت دل کا دورہ یا حادثہ قرار دے دی جاتی ہے۔

O ایک عوامی اہلکار کو منشیات کے خلاف جنگ پر تنقید کرنے کی بے حد بھاری قیمت ادا کرنی پڑی۔ اس سے قبل ایسا ہی سابق سرجن جنرل جیکو لین ایڈلرز کے ساتھ بھی ہو چکا تھا جس کے بیٹے کو سادہ لباس میں ملیوں پولیس اہلکار کے ہاتھ ایک اونٹ کا 1/8 حصہ کوکین

فروخت کرنے کا الزام عائد کر کے 10 سال کے لیے جیل بھیج دیا گیا تھا۔ غور طلب بات یہ ہے کہ اس لڑکے کی گرفتاری اس فروخت کے 5 ماہ بعد اور اپنی ماں کے اس بیان کے صرف ایک ہفتہ بعد عمل میں آئی تھی جس میں اس نے تجویز پیش کی تھی کہ حکومت کو منشیات کی قانونی حیثیت پر غور کرنا چاہیے۔

اور یہ نئے اچھے دن ہیں

حکام اب زیادہ عرصہ تک اپنے اس رویہ کی وجہ ویتنام کی جنگ کے مخالفین کی جانب سے خطرہ اور شہری حقوق کی تحریک کو قرار نہیں دے سکیں گے۔ بلیک میٹھر پارٹی بھی نام نہاد اشتراکی سازش کی طرح تاریخ کا حصہ بن چکی ہے۔ وسطی امریکہ کی جدوجہد ختم ہو چکی ہے اور جے ایچر ہوور نے مر کے یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ بھی باقی انسانوں کی طرح ہے۔

تاہم 1991ء سے 1999ء تک امریکہ کی جیلوں میں قیدیوں کی تعداد میں 50 فیصد سے زیادہ اضافہ ہو چکا ہے۔

اب ہر بستر پر اشتراکیوں کی بجائے منشیات فروخت کرنے والے استعمال کرنے والے رکھنے والے اور ادھر سے ادھر سلائی کرنے والے پائے جاتے ہیں۔ اب سوویت یونین کی شیطان سلطنت کی بجائے بدمعاش قومیں اچھوت ریاستیں اور لاقانونیت کی انتہا کو پہنچی ہوئی قومیں دشمن نظر آتی ہیں جہاں دہشت گرد دہشت گردوں کے حامی و مددگار ایشی سمگلر پنہا کے طالب اور امریکہ کے مخالفین راج کرتے ہیں۔ جہاں اختیارات شہری حقوق کے لیے مطالبات کرنے والوں کی جگہ نوجوان گروہوں، تارکین وطن، ماحولیات کے لیے کام کرنے والوں، فلاحی کارکنوں، اصلاح پسندوں کے ہاتھ میں ہیں۔

وہ چیز جو امریکیوں کو حقوق کے قانون کی دھجیاں اڑتی دیکھ کر شدید صدمہ کی کیفیت سے دوچار ہونے سے بچاتی ہے یہ ہے کہ ابھی انہوں نے ذاتی طور پر یا پھر اپنے کسی نہایت عزیز کے تجربہ کے ذریعہ انجام کو محسوس کرنا ہے۔ اور یہ جلد ہی سامنے آ جائے گا بس کچھ دیر انتظار کرنا ہوگا۔ امریکہ کے بیرونی حامی ان حالات سے قطعی بے خبر ہیں اور ضرورت اس بات کی ہے کہ ان پر حقیقت کا انکشاف جلد ہی ہو جائے۔